قفس

PDFBOOKSFREE.PK

انور احسن صدیقی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

پاکستان ورچوئل لائبریری پر موجود تمام کتابیں قارئین کے مطالعے اور دعوتی و اصلاحی مقاصد کے لئے اپلوڈ کی جاتی ہیں۔

تنبیہ

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی سخت ممانعت ہے، اور ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی ، قانونی و شرعی جرم ہے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

پیش لفظ

''قفس'' حقیقت اور تخیل کے امتزاج پر مبنی ایک ناول ہے۔ اس ناول کی مرکزی کردار ماجدہ (فرضی نام) سے میری ملاقات کراچی میں ایدھی ہوم میں ہوئی تھی جہاں میں اکثر وہاں کے مکینوں سے ملنے، ان کے حالاتِ زندگی سے واقف ہونے اور ان کے متنوع تجربات سے مستفید ہونے کے لیے جاتا ہوں۔ ماجدہ وہاں اپنے بچوں کے ساتھ مقیم تھی۔ ان ذاتی تجربات کا جب زندگی کے عمومی اور اجتماعی تجربات کے تناظر میں جائزہ لیا جاتا ہے تو بڑی عجیب وغریب اور حقیقت افروز کہانیاں وجود میں آتی ہیں جن میں سے بعض کو تحریری شکل دیتے وقت ان میں عمومی حقیقت کا زیادہ گہرا رنگ بھرنے کی غرض سے کچھ تبدیلیاں کرنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔

ماجدہ کو نو سال کی عمر میں بنگلہ دیش کے شہر کھلنا سے اغوا کیا گیا تھا جہاں وہ اپنے تایا زاد بھائی کے ساتھ فلم دیکھنے کے لیے آئی تھی۔ ماجدہ کو اغوا کر کے پاکستان لایا گیا جہاں وہ سندھ اور جنوبی پنجاب کے متعدد زمین داروں کے ہاتھوں بکتی رہی اور ان کے بچوں کی ماں بنتی رہی۔ ان بچوں کی زندگی میں ان کے باپ کا کوئی مقام نہیں تھا۔

یہاں تک کے واقعات ماجدہ نے خود مجھے سنائے جو ایک ایسے عجیب وغریب لہجے میں اردو بول رہی تھی جس میں بنگالی، پنجابی اور سرائیکی لب و لہجے کا ملا جلا غالب اثر موجود تھا۔ اس کے ساتھ طویل نشست کے دوران میں نے اس کی زخمی روح کی گہرائیوں میں اُترنے کی کوشش کرتے ہوئے اس ناول کے لیے بنیادی خام مال حاصل کیا اور پھر اس میں علامتی طور پر ان ہزاروں لاکھوں عورتوں کے دکھ درد کو سمیٹ لیا جن کے قصہ غم کا آغاز ازل سے ہوتا ہے اور جن کے صدمات کا عالم دامان ابد تک پھیلا ہوا ہے۔ اس ناول میں بالخصوص ان عورتوں کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

موضوع بنایا گیا ہے جن کی اسمگلنگ اور فروخت کا سلسلہ بنگلہ دیش سے لے کر افغانستان اور خلیجی ریاستوں تک پھیلا ہوا ہے اور اس حوالے سے بہت سے مختلف انسانی رویوں کی عکاسی کی گئی ہے۔

دنیا بھر میں انسانی اسمگلنگ، بالخصوص عورتوں کی اسمگلنگ ہماری اجتماعی زندگی کا ایک ناسور بنی ہوئی ہے۔ اس نہایت منفعت بخش کاروبار میں بہت سے ممالک کے سرکاری کارپردازوں کے ساتھ ساتھ سماج کے با اثر اور مقتدر حلقے اور طاقتور جرائم پیشہ گروہ شامل ہیں۔ اس ناول میں اسی زخمی سماجی منظرنامے کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ صرف ایک انسان کی گمشدگی یا اغوا سے اس شخص کی اپنی زندگی کے علاوہ دوسرے کتنے انسانوں کی زندگی میں ناقابلِ تلافی غموں کی خاک اُڑنے لگتی ہے اور پھر جب بات ہزاروں اور لاکھوں کی ہو تو کیسے کیسے پیچ در پیچ اَن گنت انسانی المیے جنم لیتے ہیں۔ اس ناول میں ایسے ہی المیوں کی جھلک پیش کی گئی ہے۔

انور احسن صدیقی

موسم اس قدر سہانا ہو رہا تھا کہ خود بخود رقص کرنے کو جی چاہتا تھا۔ آسمان پر گھنے بادلوں کا سایہ دور دور تک پھیل گیا تھا اور ساری فضا سرمئی رنگ کے طلسم کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔ صبح تک تو تھوڑی سی دھوپ نکلی ہوئی تھی اور ہلکے ہلکے بادل کسی وقت آ جاتے تھے اور کسی وقت غائب ہو جاتے تھے لیکن دوپہر کے بعد دھوپ ایک دم غائب ہو گئی اور آسمان تاریک ہونے لگا۔

ماجدہ نے اپنی ماں اور بہن بھائیوں کے ساتھ بیٹھ کر دوپہر کا کھانا کھایا۔ مچھلی اور لوکی کا شوربے دار سالن تھا اور چاول تھے۔ ماجدہ کو مچھلی کے شوربے دار سالن بہت زیادہ پسند تھے جن میں کوئی ترکاری بھی ڈالی گئی ہو۔ مچھلی کے ساتھ کوئی بھی ترکاری ڈال کر سالن پکایا جا سکتا تھا۔

کھانا کھا لینے کے بعد ماجدہ زیادہ دیر تک گھر میں نہیں رکی اور باہر نکل گئی۔

باہر کا منظر گھر کے اندر کے منظر سے کہیں زیادہ دلفریب اور روح پرور تھا۔ کچھ فاصلے پر ندی کا پانی کسی ملگجی چادر کی طرح ہچکولے لے رہا تھا اور اس میں چلتی ہوئی کشتیاں گدلے رنگ کے کاغذ پر بنے ہوئے دھندلے دھندلے خاکوں کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ فضا کی دھندلاہٹ کے باوجود ندی کے دوسرے کنارے تک دیکھا جا سکتا تھا، اگرچہ دوسرے کنارے تک پہنچتے پہنچتے دھندلاہٹ میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا تھا۔ وہاں جو چیز سب سے زیادہ واضح طور پر نظر آتی تھی وہ سرسبز و شاداب اور اونچے اونچے درختوں کے گھنے جھنڈ تھے جو آپس میں اس طرح ملے ہوئے تھے کہ انہوں نے دور تک پھیلی ہوئی ایک دیوار کی شکل اختیار کر لی تھی۔

اس دیوار کے دوسری طرف جو کچھ تھا، اسے دیکھا نہیں جا سکتا تھا اور اس سے پہلے جو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کچھ تھا وہ بھی غیر واضح تھا۔

بارش ابھی شروع نہیں ہوئی تھی، لیکن آثار بتا رہے تھے کہ بڑے زور وشور کے ساتھ شروع ہونے والی ہے۔ فضا نے جیسے دم سادھ لیا تھا، ہوا بند ہوگئی تھی اور زمین کی سانس جیسے رک گئی تھی۔ آسمان کا رنگ کچھ اور سیاہ ہوگیا تھا۔ ایک عجیب قسم کا پُراسرار سناٹا زمین سے نکل کر آسمان تک پھیل رہا تھا۔ کسی پرندے نے بڑی ہی سریلی آواز میں کوئی نغمہ چھیڑا اور اس کے چند ہی لمحے کے بعد ندی کے قریب گھنے درختوں میں سے اس نغمے کی صدائے بازگشت بلند ہوئی۔ وہاں موجود ایک دوسرے پرندے نے اس نغمے کا جواب دیا تھا۔ فضا میں جیسے رس گھل گیا۔ ماجدہ کے ہونٹوں پر خود بخود ایک مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ اس کے آگے بڑھتے ہوئے قدموں میں وارفتگی کا انداز کچھ اور زیادہ ہوگیا۔

اور پھر جیسے ہی ہاشم اسے ایک طرف سے آتا ہوا نظر آیا، ویسے ہی گویا اس سارے منظر نامے کی تکمیل ہوگئی، جو اپنے تمام تر حُسن کے باوجود ابھی تک نامکمل معلوم ہو رہا تھا۔

ہاشم ابھی بہت دور تھا، لیکن ماجدہ نے اسے صاف طور پر پہچان لیا تھا۔ ہاشم کو تو وہ سینکڑوں ہزاروں لوگوں میں سے پہچان سکتی تھی۔ ہاشم کی چال کی تو ایک ایک جنبش سے وہ خوب واقف تھی۔ ہاشم تو ہاشم تھا۔ ہاشم جیسا دوسرا تو کوئی نہیں تھا اور نہ ہوسکتا تھا۔

اس کے قدم خود بخود تیز ہوگئے اور وہ اسی طرف بڑھنے لگی جدھر سے ہاشم آ رہا تھا۔

ذرا سی دیر میں وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب پہنچ گئے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔ ان کے دلوں میں پیدا ہونے والی خوشی کی روشنی جیسے ان کے چہروں سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے میں اُلجھ گئیں اور روشنی کا سفر ایک طرف سے دوسری طرف طے ہونے لگا۔ ماجدہ کے ہلکے سانولے رنگ کے چہرے پر یکبارگی ایک زندگی آمیز نکھار آ گیا اور ہاشم کے چہرے کے سنورتے ہوئے مردانہ خدوخال کی دلکشی میں کچھ اور اضافہ ہوگیا۔

''بڑے زور کی بارش آنے والی ہے!'' ماجدہ نے گفتگو میں پہل کرتے ہوئے ہاشم سے مسکرا کر کہا۔ ''جلدی جلدی چلو..... ہمیں باغ کی کٹیا تک پہنچ جانا چاہیے۔''

''اور اگر بارش دیر تک ہوتی رہی تو پھر ہم دونوں کٹیا میں ہی پھنس کر رہ جائیں گے۔'' ہاشم نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''پھر گھر والے ہمیں کہاں کہاں ڈھونڈتے پھریں گے۔''

''کوئی نہیں ڈھونڈے گا ہاشم۔'' ماجدہ نے مسکرا کر کہا۔ ''جب بارش ہو رہی ہوگی تو

کون ڈھونڈنے نکلے گا؟ اور جب بارش ختم ہو جائے گی تو ہم خود ہی گھر پہنچ جائیں گے۔''

دونوں تیزی سے باغ کی طرف قدم بڑھانے لگے، جو یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اس بڑے سے باغ میں، جس کا سلسلہ کافی دور تک پھیلا ہوا تھا۔ کٹہل کے درختوں کی بہتات تھی۔ بڑے بڑے کٹہلوں سے لدے ہوئے یہ درخت بڑا منفرد منظر پیش کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سبز کا ہی رنگ کے خوب بڑے بڑے، دانے دار جلد والے غبارے درختوں سے لگے ہوئے جھول رہے ہوں۔

اس باغ میں ایک پرانی سی کٹیا تھی، جو ایک سائبان پر مشتمل تھی۔ سامنے کا حصہ آدھا کھلا ہوا تھا اور اس میں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ آدھے حصے کے سامنے دیوار تھی، کوئی بھی شخص اس کٹیا میں آ سکتا تھا اور جتنی دیر چاہے یہاں رک سکتا تھا۔ یہاں کوئی چارپائی نہیں تھی، البتہ ایک بہت پرانا لکڑی کا تخت پڑا ہوا تھا، جس کی لکڑی جگہ جگہ سے پھول کر ٹیڑھی ہو چکی تھی۔

گاؤں کے لڑکے اور لڑکیاں اکثر اس کٹیا میں آ کر بیٹھتے تھے، باتیں کرتے، گانے گاتے تھے اور کھیلتے کودتے تھے۔ کبھی کبھی ادھر سے گزرنے والے اکا دکا مسافر بھی کچھ دیر کے لیے یہاں رک کر سستا لیتے تھے۔

ماجدہ اور ہاشم تقریباً روزانہ ہی دوپہر کے کھانے کے بعد کچھ دیر کے لیے اس کٹیا میں آ کر بیٹھتے تھے۔ ان کے پاس ایک دوسرے سے کہنے سننے کے لیے بہت کچھ ہوتا تھا۔ اس کہنے سننے میں کوئی خاص اور غیر معمولی بات نہیں ہوتی تھی۔ بس عام اور سادہ سی باتیں..... معصومانہ، بے ضرر باتیں، گھروں میں کیا ہوتا رہا، دوسرے لوگ کیا کرتے رہے، کون آیا، کون گیا، کس نے کیا کہا..... اور ان ساری سادہ اور بے ضرر سی باتوں میں ہی وہ زندگی کا رس گھلا ہوا محسوس کرتے تھے۔ یہ باتیں ان کے لیے ایک دوسرے کے قریب رہنے، ایک دوسرے کے ساتھ کچھ زیادہ وقت گزارنے کا وسیلہ بنتی تھیں، لیکن وہ دونوں ہمیشہ تنہا نہیں ہوتے تھے۔ اکثر گاؤں کے دوسرے لڑکے اور لڑکیاں بھی ان کے ساتھ وہاں آ جاتے اور پھر باتوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا، جس میں جا بجا قہقہے بھی شامل ہوتے۔ کوئی لڑکی اچانک کوئی گیت چھیڑ دیتی اور کوئی دوسری لڑکی فوراً ہی اس کی لے میں اپنی آواز کو شامل کر دیتی اور پھر کئی لوگ مل کر اس مقبول گیت کو گانے لگتے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سماں بندھ جاتا۔ آس پاس کی فضا گیت کے رس سے بوجھل ہونے لگتی۔

وہ دونوں کٹیا تک پہنچے ہی تھے کہ ایک دم بارش ہوگئی۔ دونوں جلدی سے اندر داخل ہو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گئے۔

فضا میں رطوبت کے باعث تخت کی بوسیدہ لکڑی چیچپا رہی تھی۔ دونوں اس تخت پر بیٹھ گئے۔ تخت کٹیا کے سامنے کے کھلے ہوئے حصے میں پڑا تھا اور یہاں سے وہ سامنے کا منظر بخوبی دیکھ سکتے تھے، جو بڑی تیزی کے ساتھ دھندلا ہوتا جا رہا تھا۔ بارش میں تیزی آتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی ساری فضا دھواں دھواں ہو رہی تھی۔ نظروں کے سامنے موجود آبی دھواں زیادہ گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ آسمان سے پانی کی چادریں گرنے لگی تھیں اور تھوڑے سے فاصلے کی چیزیں بھی صاف نظر نہیں آ رہی تھیں۔

''آج کی اس بارش سے بابا کی پریشانی دور ہو جائے گی۔'' ماجدہ نے تخت پر جم کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''وہ کئی بار یہ بات کہہ چکے ہیں کہ دھان کی فصل کو اگر زیادہ پانی نہیں ملا تو وہ خراب ہو جائے گی۔ آج کی بارش کے بعد تو دھان کے کھیتوں میں پانی خوب بھر جائے گا۔''

''ہاں.....'' ہاشم نے جواب میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بڑے زور کی بارش ہو رہی ہے اور بادلوں کو دیکھ کر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت بارش ہوگی، بہت دیر تک ہوگی۔''

موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ سامنے کچھ فاصلے پر پھیلی ہوئی ندی کی ملگجی چادر ان کی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی اور اس کے ساتھ ہی کشتیوں کے دھندلے دھندلے خاکے بھی غائب ہو چکے تھے۔ نظروں کے سامنے بس پانی ملی گہری دھند تھی، ایک بہت موٹی سی آبی چادر تھی جو ہوا کے زور کے ساتھ اِدھر اُدھر ہل رہی تھی۔

''تم نے کہا تھا کہ اماں سے پوچھ کر مجھے سینما دکھانے شہر لے چلو گے۔'' ماجدہ نے پُر اشتیاق لہجے میں ہاشم سے کہا۔ ''اسکول بھی بند ہو گیا، اب کب چلو گے؟''

''جس دن تم کہو۔'' ہاشم نے اسے میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس پیسے بھی کافی ہیں، ہم اونچی کلاس میں بیٹھیں گے۔''

''اچھا تو بس پھر ایک آدھ دن میں ہی چلو۔'' ماجدہ نے اصرار کیا۔

''میں چاچی سے پوچھ لوں، پھر چلیں گے۔'' ہاشم نے کہا۔ ''وہ منع تو نہیں کریں گی لیکن ان کو بتانا اور ان سے پوچھنا ضروری ہے۔''

رفتہ رفتہ بارش کی شدت میں کمی آتی گئی۔ پانی کی موٹی اور کثیف چادر آہستہ آہستہ شفاف ہوتی گئی اور اس کے آر پار کے مناظر واضح ہونے لگے۔ دور ندی کا ہلکورے لیتا ہوا پاٹ نظر آنے لگا اور ندی میں موجود کشتیوں کے نقوش بھی واضح ہونے لگے۔ ندی کے

دوسرے کنارے پر ہرے بھرے درختوں کی دیوار کچھ زیادہ روشن اور سبز نظر آنے لگی۔ اتنی دور سے بھی اس کی تازگی کو محسوس کیا جا سکتا تھا۔ بارش تھمی تو ندی کی جانب سے کسی مانجھی کی تیز آواز ہوا کے دوش پر تیرنے لگی۔ کوئی کشتی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو رہی تھی۔

ہاشم اور ماجدہ کٹیا سے باہر نکل آئے۔ دور دور تک ہر چیز دھل کر اور بھی زیادہ صاف و شفاف ہو گئی تھی اور فضا میں گیلی مٹی اور بھیگے ہوئے پیڑ پودوں سے نکلنے والی مہک بسی ہوئی تھی۔ یہ ایک ایسی ٹھنڈی ٹھنڈی مہک تھی جس میں موسم کی ساری نرمی اور مہربانی گھلی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

وہ دونوں چلتے ہوئے ماجدہ کے گھر کی طرف بڑھ رہے تھے، جو وہاں سے بہت زیادہ دور نہیں تھا۔ سارے راستے زمین پر گھاس اُگی ہوئی تھی اور اس میں خوب پانی بھرا ہوا تھا۔ گھاس کی وجہ سے کیچڑ نہیں تھی اور جہاں جہاں کیچڑ تھی وہاں سے وہ دونوں بچ کر چل رہے تھے۔ پانی میں ڈوبی ہوئی نرم نرم گھاس پر چلنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

کچھ دیر میں وہ دونوں ماجدہ کے گھر تک پہنچ گئے اور گھر کے اندر داخل ہو گئے۔

''ارے..... یہ تم لوگ پانی میں کہاں بھیگتے پھر رہے ہو؟'' ماجدہ کی ماں ہاجرہ نے ان دونوں کو تیز نظروں سے گھورتے ہوئے سرزنش کے انداز میں کہا۔ ''اتنی تیز بارش.....''

''اور کیا ہم لوگ آپ کو بھیگے ہوئے لگ رہے ہیں چاچی؟'' ہاشم نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ہم تو پانی میں باہر ہی نہیں نکلے تھے..... باغ کی کٹیا میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں تو آپ کے گھر کی طرف ہی آ رہا تھا کہ راستے میں ماجدہ مل گئی اور پھر ہم لوگ باغ کی طرف چلے گئے..... وہاں بارش آ گئی..... ہم کٹیا میں جا کر بیٹھ گئے..... ہم بالکل نہیں بھیگے چاچی.....''

''اچھا..... آؤ بیٹھو.....'' ہاجرہ نے کہا۔ ''تمہارے امتحانات تو ختم ہو گئے نا؟''

''جی چاچی۔'' ہاشم نے جواب دیا۔ ''میرے امتحانات ختم ہو گئے اور اسکول بھی بند ہو گیا اور اب تو کافی دنوں کے لیے چھٹی ہے۔ چاچی میں نے ماجدہ سے وعدہ کیا تھا کہ اسے فلم دکھانے شہر لے جاؤں گا، اب اگر آپ اجازت دیں تو میں کسی دن اس کو شہر لے جا کر فلم دکھا لاؤں.....''

''ہاں اماں۔'' ماجدہ نے چہکتے ہوئے خوشامدانہ انداز میں اپنی ماں سے کہا۔ ''کتنے دن ہو گئے کہ میں شہر نہیں گئی اور فلم تو میں نے اس سے بھی زیادہ دنوں سے نہیں دیکھی۔''

''بہت شوق ہو گیا ہے تمہیں فلمیں دیکھنے کا؟'' ہاجرہ نے اسے تادیبی نظروں سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گھورتے ہوئے کہا۔ ''کچھ پڑھنے لکھنے میں بھی دل لگایا کرو..... کچھ گھر کے کام کاج میں بھی حصہ لیا کرو۔''

''کرتی تو ہوں اماں، گھر کا کام بھی کرتی ہوں اور پڑھتی بھی ہوں.....''

''اچھا اچھا ٹھیک ہے۔'' ہاجرہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے ہاشم سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''کب جانا چاہتے ہو شہر؟''

''کل ہی۔'' ہاشم نے خوش ہوتے ہوئے جواب دیا۔ ''آپ اجازت دیں تو کل ہی.....''

''ٹھیک ہے۔'' ہاجرہ نے کہا۔ ''چلے جانا، میں ماجدہ کے بابا کو بتا دوں گی لیکن جلدی واپس آنے کی کوشش کرنا۔''

''ہم لوگ وہاں سے سیدھے گاؤں آئیں گے۔'' ہاشم نے کہا۔ ''اور کہیں نہیں جائیں گے۔''

ماجدہ کے چہرے پر رنگوں کی بارش سی ہونے لگی۔ اس کی آنکھوں میں چمک دوبالا ہو گئی۔

☆======☆======☆

بنگلہ دیش کے شہر کھلنا کے نواح میں واقع چھوٹا سا گاؤں مادھو پور بغیر کسی تبدیلی کے صدیوں سے اسی طرح آباد چلا آ رہا تھا۔ گاؤں کے بزرگوں نے اپنے بزرگوں سے اس گاؤں میں کسی بڑی تبدیلی کی خبر نہیں سنی تھی، سوائے اس کے کہ ہر دو تین سال کے بعد تیز بارشوں کے باعث ندی کا پانی گاؤں کے اندر داخل ہو جاتا تھا مگر اس سیلابی ریلے سے گاؤں کو زیادہ نقصان نہیں پہنچتا تھا، کیونکہ یہ گاؤں ایک سطح مرتفع پر واقع تھا جہاں تک سیلابی پانی کی رسائی بمشکل ہی ہو پاتی تھی۔ عام طور سے سیلابی پانی کے گاؤں میں پوری طرح سے داخل ہونے سے پہلے ہی سیلاب کا زور ٹوٹ جاتا تھا اور گاؤں محفوظ رہتا تھا۔

فراواں سبزے میں ڈوبا ہوا یہ گاؤں اپنے مکینوں کو صدیوں سے اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے بڑی وفاداری کے ساتھ ان کی پرورش کر رہا تھا۔ جب مکینوں کی ایک نسل ختم ہو جاتی تھی تو گاؤں کی زمین، پانی اور ہوا سب مل کر مکینوں کی ایک نئی اور تازہ نسل کی پرورش و پرداخت میں مصروف ہو جاتے تھے۔ نسلیں گزرتی رہتی تھیں اور زندگی جاری و ساری رہتی تھی۔

گاؤں کے آس پاس دور دور تک دھان کے کھیت لہلہاتے تھے۔ زمین سونا اگلتی تھی اور تا حدِ نظر سبزہ ہی سبزہ لہلہاتا تھا۔ برسات کے دنوں میں تو اکثر خالی زمین کا ایک ٹکڑا بھی نظر نہیں آتا تھا۔ ہر جگہ مخملیں سبزے کی حکمرانی ہوتی تھی۔

گاؤں کے غریب، جفاکش اور محنتی لوگوں کی زیادہ تر تعداد کاشتکاری سے وابستہ تھی، البتہ ماہی گیری بھی بہت سے لوگوں کا ذریعہ معاش تھی۔ رزق کمانے کا کوئی بھی وسیلہ ہو، رزق تو بہر حال کمانا ہی تھا۔

سراج الدین اس گاؤں کا ایک غریب کسان تھا۔ اس کے پاس اپنا ایک چھوٹا سا قطعہ اراضی تھا جس پر وہ دھان کی کاشت کرتا تھا۔ وہ اکیلا تھا اور زیادہ تر کام اکیلے ہی کرتا تھا۔ جب ضرورت پڑتی تھی تو اپنے ساتھ کسی اور کو بھی شامل کر لیتا تھا۔ اس کے دونوں بیٹے ابھی چھوٹے تھے اور کام میں اس کی زیادہ مدد نہیں کر سکتے تھے۔ اس کی بیوی ہاجرہ البتہ اس کے لیے بڑی مددگار ثابت ہوتی تھی بلکہ فی الحقیقت ہاجرہ گاؤں کی دوسری عورتوں کی طرح اپنے شوہر سے زیادہ ہی کام کرتی تھی۔ بچوں کی پرورش، باورچی خانے کے کام اور دیگر تمام گھریلو کاموں کے ساتھ ساتھ وہ کھیتی باڑی کے کام میں بھی اپنے شوہر کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ دونوں میاں بیوی مل کر جان توڑ محنت کرتے تھے تو گھر کا چولہا روشن رہتا تھا۔ پانچ جانوں کی پرورش کرنی تھی اور کوئی جانے، ان جانوں میں مزید کسی چھٹی جان کا کب اضافہ ہو جائے، امکانات تو بہت روشن تھے۔

ماجدہ کی عمر ابھی نو سال کی تھی اور اس کی چھوٹی بہن ثریا سات سال کی تھی۔ سب سے چھوٹی بہن شاہدہ کی عمر چار سال کی تھی۔ درمیان میں دو بھائی تھے جو چھ اور پانچ سال کے تھے۔

ماجدہ اسکول نہیں جاتی تھی بلکہ گھر میں ہی کچھ تھوڑا بہت لکھ پڑھ لیتی تھی۔ اگرچہ گاؤں میں لڑکیوں کے لیے اسکول موجود تھا لیکن ماجدہ کو گھر میں رہ کر بہت سے کاموں میں اپنی ماں کا ہاتھ بٹانا پڑتا تھا۔ اسکول کی ایک استانی جن کا نام ستارہ تھا اور جنہیں گاؤں کے سب لوگ ''ستارہ آپا'' کہتے تھے، گاؤں کے ان بچوں کو بڑی خوشی سے تھوڑی دیر کے لیے مفت میں پڑھا دیتی تھیں جو کسی نہ کسی وجہ سے اسکول نہیں جا سکتے تھے اور پڑھنا چاہتے تھے۔ ماجدہ کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اسے گانے اور نئے نئے گیت سیکھنے کا بھی بہت شوق تھا۔ وہ اس لیے بھی پڑھنا چاہتی تھی تاکہ نئے گیتوں کو پڑھ سکے اور انہیں یاد کر سکے۔ وہ ستارہ آپا کے پاس کئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سال سے پابندی کے ساتھ پڑھنے کے لیے جاتی تھی اور اس نے بنگلہ پڑھنا اور لکھنا بہت اچھی طرح سیکھ لی تھی۔ بنگلہ وہ واحد زبان تھی جو وہ بول، لکھ اور پڑھ سکتی تھی۔ ستارہ آپا اسے بنگلہ زبان کے علاوہ دوسرے مضامین کی تعلیم بھی دیتی تھیں۔

''دو تین سال دل لگا کر پڑھ لو تو پھر پرائیویٹ میٹرک کا امتحان دے دینا۔'' ستارہ آپا اس سے کہتیں۔ ''تم کو پڑھنے کا شوق ہے، تم آسانی سے میٹرک کر لوگی۔''

ماجدہ خود بھی چاہتی تھی کہ کچھ پڑھ لے۔ اسے پڑھنا اس لیے بھی اچھا لگتا تھا کیونکہ ہاشم پڑھ رہا تھا۔ ہاشم اسکول جاتا تھا اور وہ اگلے سال میٹرک کا امتحان دینے والا تھا۔ اس وقت ہاشم کی عمر چودہ سال کی تھی۔

ہاشم، ماجدہ کے تایا نواب الدین کا بیٹا تھا، اس کی ماں کا نام نادرہ تھا۔ ماجدہ کا باپ سراج الدین اور ہاشم کا باپ نواب الدین دونوں سگے بھائی تھے۔ سراج الدین اپنے بھائی سے دو سال چھوٹا تھا۔ ان دونوں کے آباؤ اجداد نامعلوم زمانوں سے اسی گاؤں میں رہتے چلے آئے تھے اور کسی دوسری جگہ رہنے کا تو انہوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ان کی جڑیں اسی زمین کی مٹی میں پیوست تھیں اور وہ انہیں اسی طرح پیوست رکھنا چاہتے تھے۔

ہاشم کا باپ نواب الدین غربت میں اپنے چھوٹے بھائی سے کچھ تھوڑا سا کم تھا اور اس کی کئی وجوہات تھیں۔ اس کے پاس زمین تو تقریباً اتنی ہی تھی جتنی کہ اس کے بڑے بھائی کے پاس تھی، لیکن نواب الدین کے گھر میں کھانے والے کم تھے۔ وہ کل تین افراد تھے۔ نواب الدین خود اس کی بیوی نادرہ اور بیٹا ہاشم الدین..... نادرہ اور ہاشم کو قدرت نے ایک بیٹے کے علاوہ اور کوئی اولاد ہی نہیں دی تھی اور یہی ایک بیٹا ان کی کل متاع زندگی تھا جسے وہ اپنی آنکھ کا تارا بنا کر رکھے ہوئے تھے۔ ہاشم کا باپ نواب الدین اپنے بھائی سراج الدین کی طرح مطلق اَن پڑھ تھا، لیکن وہ اپنے بیٹے کو اسکول میں داخل کروا آیا تھا۔ وہ اسے اچھی تعلیم دلوانا چاہتا تھا۔ دونوں بھائیوں کے گھرانوں کے درمیان مثالی تعلقات تھے اور ان تعلقات میں چودہ سالہ ہاشم اور نو سالہ ماجدہ کی دوستی کو ایک خصوصی حیثیت حاصل تھی۔ ان دونوں نے ہوش سنبھالتے ہی ایک دوسرے کو اپنے سے سب سے زیادہ قریب پایا تھا۔ گاؤں میں اور دوسرے لڑکوں اور لڑکیوں کی کمی نہیں تھی، جن میں رشتے داروں کے لڑکے اور لڑکیاں بھی شامل تھے۔ مگر جو لگاؤ شروع ہی سے ماجدہ کو ہاشم اور ہاشم کو ماجدہ سے تھا اس کی ان دونوں کی زندگی میں کوئی اور نظیر موجود نہیں تھی۔ ہاشم اور ماجدہ کی گہری دوستی جیسے ان کی شخصیتوں کا حصہ

بن چکی تھی۔ دونوں بچوں کا ایک دوسرے کے گھروں پر آزادانہ اور بلا روک ٹوک آنا جانا تھا اور ہاشم اکثر ماجدہ کی پڑھائی میں بھی مدد کر دیتا تھا۔ ماجدہ کو ہاشم سے پڑھنا بہت اچھا لگتا تھا۔

ان کے گاؤں مادھو پور سے قریب ترین شہر کھلنا تھا۔ مادھو پور تو ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں جدید زندگی کی کوئی بھی قابلِ ذکر سہولت موجود نہیں تھی۔ پورے گاؤں میں صرف دو ٹی وی تھے اور ریڈیو بھی گنے چنے لوگوں کے پاس تھے۔ گاؤں میں کوئی تھیٹر یا سینما گھر نہیں تھا۔ البتہ کبھی کبھار کوئی گشتی تھیٹر کمپنی یا سرکس کمپنی بھولے بھٹکے گاؤں کی طرف آ نکلتی تھی تو سارے علاقے میں گویا زندگی کی ایک تازہ لہر دوڑ جاتی تھی۔ کمپنی والے گاؤں کے باہر وسیع میدان میں اپنے خیمے گاڑتے اور چند دنوں تک وہاں اپنے کمال فن کا مظاہرہ کرتے۔ یہ نعمت صرف مادھو پور گاؤں والوں کے لیے ہی نہیں بلکہ آس پاس کے بہت سے گاؤں کے لوگوں کے لیے ایک انمول تحفہ ہوتی۔

فلم دیکھنے کے لیے لوگوں کو کھلنا جانا پڑتا تھا۔ صرف مادھو پور گاؤں کے لوگ فلم دیکھنے کے لیے کھلنا نہیں آتے تھے۔ آس پاس کے دوسرے گاؤں کے لوگ بھی فلم دیکھنے کے لیے کھلنا ہی آتے تھے۔

ماجدہ اپنے والدین کے ساتھ اکثر کھلنا جاتی رہتی تھی۔ گھر میں اور زمین کے لیے جن جن چیزوں کی ضرورت ہوتی تھی، وہ سب کی سب مادھو پور میں نہیں مل پاتی تھیں۔ اس چھوٹے سے گاؤں کی دنیا بہت محدود تھی۔ سراج الدین کو اپنی ضرورت کی اشیاء کی خریداری کے لیے اکثر کھلنا جانا پڑتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ہاجرہ اور ماجدہ کو بھی لے جاتا تھا اور کبھی کبھی ہاشم بھی ان کے ساتھ ہوتا تھا۔

ویسے تو ماجدہ کو شہر جانا بہت اچھا لگتا تھا، کیونکہ یہاں کی دنیا اس کے چھوٹے سے اور محدود فضاؤں والے گاؤں سے بہت مختلف تھی لیکن اسے اس وقت شہر آنا اور بھی زیادہ اچھا لگتا تھا جب ان لوگوں کے ساتھ ہاشم بھی ہوتا تھا۔ ہاشم کی موجودگی اسے ایک ایسی سرشاری کا احساس دلاتی تھی جسے وہ پورے طور پر سمجھ پاتی تھی اور نہ کوئی نام دے سکتی تھی۔ یہ ایک ایسی خوشی تھی جو اس کے وجود کی گہرائیوں میں سے خود بخود پھوٹتی تھی اور پھر اس کی ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی تھی۔

کھلنا میں سینما گھر تھے۔ گاؤں دیہات سے آنے والے لوگوں کے لیے یہ ایک بڑی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نعمت تھی۔ ماجدہ نے اپنے والدین کے ساتھ کئی بار کھلنا میں سینما گھر میں فلمیں دیکھی تھیں۔ اسے فلم دیکھنا بہت اچھا لگتا تھا۔ جب وہ سینما ہال میں بیٹھ کر کوئی فلم دیکھتی تھی تو اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے دنیا یکا یک بہت وسیع ہوگئی ہے اور اس کے گاؤں کی مختصر سی حدیں ٹوٹ پھوٹ کر مٹی میں مل گئی ہیں۔ فلم دیکھنے کے دوران اس کی نظروں کے سامنے ایک نئی کائنات روشن ہو جاتی تھی۔ وہ خود کو اس نئی اور عظیم کائنات کے ایک حصے میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھتی تھی جو پردۂ سیمیں پر اس کی نظروں کے سامنے اپنے لامحدود اسرار و رموز کا انکشاف کر رہی ہوتی تھی۔ سب کچھ کتنا نیا، انجانا، پُرکشش اور حیرت انگیز ہوتا تھا..... زندگی کے لمحات جیسے کسی طلسم میں ڈھلتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ایسی دنیا گردش کر رہی ہوتی تھی جس کے حالات و واقعات کو وہ خود اپنے انداز میں اپنے طور پر دیکھ سکتی تھی اور ان کی تعبیر کر سکتی تھی۔

چند ایک بار وہ ہاشم کے ساتھ اکیلی بھی کھلنا آئی تھی، فلم دیکھنے کے لیے..... اور اس کے والدین نے اس کو ہاشم کے ساتھ آنے کی اجازت دے دی تھی۔ اس کے والدین اسے ہاشم کے ساتھ کھیلنے کودنے اور اس کے ساتھ کہیں آنے جانے سے کبھی منع نہیں کرتے تھے، حتیٰ کہ وہ ہاشم کے ساتھ کھلنا بھی اکیلی جاتی تھی۔

چنانچہ اس روز بھی جب ہاشم نے ماجدہ کو ساتھ لے کر کھلنا جانے اور وہاں فلم دیکھنے کے لیے ماجدہ کی ماں سے اجازت طلب کی تو ہاجرہ نے اس کو منع نہیں کیا اور جب ماں نے اجازت دے دی تو ماجدہ آنے والے لمحوں کی مسرت کے پیشگی احساس سے سرشار ہوگئی۔

مادھو پور سے کھلنا تک جانے کے لیے ویسے تو خشکی کا راستہ بھی موجود تھا لیکن زیادہ تر لوگ یہ سفر کشتی کے ذریعے طے کرتے تھے۔ مادھو پور کے گھاٹ سے کھلنا تک پہنچنے میں تقریباً ایک گھنٹے کا وقت لگتا تھا اور یہ سفر بڑا دلچسپ ہوتا تھا۔ ندی میں دور دور تک کشتیوں کے متحرک ہیولے نظر آتے تھے۔ ان میں ہر طرح کی کشتیاں شامل ہوتی تھیں۔ مسافر بردار کشتیاں بھی ہوتی تھیں، مال بردار کشتیاں بھی اور ماہی گیری کی کشتیاں بھی۔ ندی میں بڑی گہما گہمی کا سماں ہوتا تھا۔ ماجدہ کو یہ منظر بہت اچھا لگتا تھا۔ لوگ صرف زمین پر ہی نہیں، پانی پر بھی موجود ہوتے تھے اور وہ اس طرح آرام سے چل پھر رہے ہوتے تھے گویا زمین پر چل پھر رہے ہوں۔ ہر کشتی گویا پانی کے سینے پر زمین کا ایک ٹکڑا ہوتی تھی جو پانی کی دستبرد سے محفوظ ہوتا تھا اور انسان اس کے ساتھ وہی کچھ کر سکتا تھا جو وہ زمین کے ساتھ کر سکتا تھا۔ کشتی کے سفر کا اپنا

ایک طلسم تھا۔ کشتی کا سفر پانی کو تسخیر کرنے کی انسانی صلاحیت کا مظہر تھا۔

''دن ہی میں جانا اور رات سے پہلے واپس آ جانا۔'' ہاجرہ نے ہاشم کو ہدایت کی۔ ''یہ نہیں کہ فلم ختم ہونے کے بعد تم لوگ زیادہ دیر تک شہر میں رکے رہو، جتنی جلدی واپس آ جاؤ اتنا ہی اچھا ہے۔''

''مجھے کچھ چیزیں خریدنی ہیں۔'' ہاشم نے کہا۔ ''کچھ کتابیں اور ایک بیگ..... تو ہم لوگ ذرا پہلے ہی نکل جائیں گے اور فلم دیکھنے سے پہلے ہی خریداری کر لیں گے۔ فلم ختم ہونے کے فوراً ہی بعد ہم واپس گاؤں کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔''

''ماجدہ کو بالوں کے لیے فیتے کی ضرورت ہے۔'' ہاجرہ نے کہا۔ ''وہ فیتے بھی خرید لے گی۔ میرا تو ابھی فی الحال شہر جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ یہاں گاؤں کی دکانوں میں مَیں نے دیکھا تھا، فیتے نہیں ملے۔''

ہاشم کچھ دیر بیٹھ کر اور ماجدہ کے ساتھ اگلے دن کا پروگرام طے کر کے چلا گیا۔

ہاجرہ اور سراج الدین کے دل میں جو کچھ تھا، کم سن ماجدہ اس سے مکمل طور پر ناواقف نہیں تھی۔ ماجدہ کا تعلق ایک ایسی فضا سے تھا جس میں لڑکیاں بڑی تیزی کے ساتھ بلوغت کی طرف قدم بڑھاتی ہیں۔ ماجدہ کے دل میں خود بھی ہاشم کے لیے پسندیدگی کے گہرے جذبات تھے اور وہ یہ بھی جان سکتی تھی کہ خود ہاشم بھی اس کو پسند کرتا ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو اچھے لگتے تھے اور وہ دونوں ایک دوسرے کے والدین کو بھی اچھے لگتے تھے۔ ماجدہ آنے والے دنوں میں اپنے اور ہاشم کے تعلق کے حوالے سے بہت سی اچھی اچھی باتیں سوچتی رہتی تھی۔ اس کے والدین ہاشم پر بہت مہربان تھے اور ہاشم کے والدین ماجدہ پر بہت مہربان تھے۔ زندگی میں مہربانیوں کی افراط تھی۔ سب کچھ بہت اچھا تھا، بہت پُرمسرت اور خوشگوار..... غریبی میں بھی خوشی موجود تھی۔

سہ پہر ہوتے ہوتے بادل چھٹ گئے تھے اور تھوڑی تھوڑی دھوپ بھی نکل آئی تھی۔ ماجدہ کی سہیلیاں اختری اور بانو اس سے ملنے کے لیے آ گئیں اور پھر وہ تینوں گھر سے باہر ندی کی طرف روانہ ہوگئیں۔

ندی میں پانی خوب چڑھا ہوا تھا۔ کافی دیر کی تیز بارش نے ندی کو جیسے ایک نئی زندگی عطا کر دی تھی اور اس کی شکل بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔ ندی میں ہر طرف کشتیوں کی ریل پیل نظر آ رہی تھی۔ کئی گھنٹوں تک رکی رہنے والی کشتیاں بارش کے تھم جانے کے بعد ایک بار پھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حرکت میں آ گئی تھیں اور مزید زور و شور کے ساتھ اپنی سرگرمی میں مصروف ہو گئی تھیں۔

اختری اور بانو دونوں اسکول میں پڑھتی تھیں۔ وہ ماجدہ کی تقریباً ہم عمر تھیں اور تینوں میں گہری دوستی تھی۔ اختری کا باپ ایک سرکاری دفتر میں کام کرتا تھا اور بانو کا باپ ماہی گیر تھا۔ بانو کا سارا خاندان ماہی گیری کے پیشے سے وابستہ تھا۔

فضا میں ہلکی ہلکی خنکی اور بارش کی مہک گھلی ہوئی تھی۔ ندی کے کنارے بہت چہل پہل تھی۔ ابھی ابھی ایک کشتی آ کر رکی تھی اور اس میں سے کچھ لوگ اتر رہے تھے۔ مخالف سمت سے آنے والی کشتی میں کچھ لوگ سوار ہو رہے تھے۔ مسافروں میں انسانوں کے علاوہ کچھ بکریاں بھی شامل تھیں۔

ندی کے دوسرے کنارے پر ہرے بھرے درختوں کی ٹھوس دیوار کے اندر سے طرح طرح کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شاخوں اور پتوں میں چھپی ہوئی مخلوق اپنی اپنی زبان میں اپنے وجود کا اور اپنی سرمستی و سرشاری کا اعلان کر رہی تھی۔

''خالدہ آپا کا کراچی سے خط آیا ہے۔'' بانو ماجدہ کو بتانے لگی۔ ''انہوں نے لکھا ہے کہ وہ وہاں بڑے آرام سے ہیں۔ ان کے دونوں بیٹے کسی کارخانے میں کام کر رہے ہیں اور انہیں اچھے پیسے مل رہے ہیں۔ خود خالدہ آپا بھی کسی ہسپتال میں نوکری کر رہی ہیں۔ ان کے پوتے پوتیاں کراچی کے کسی اسکول میں پڑھ رہے ہیں اور خوب اردو بولتے ہیں۔''

''میں تو کہتی ہوں کہ اچھا ہوا کہ خالدہ آپا یہاں سے چلی گئیں۔'' اختری نے آہستہ سے کہا۔ ''یہاں تو محنت کرنے والوں کے لیے کام ہی نہیں ہے۔ کھائیں کہاں سے؟ ہمارے منور چاچا کا تو پورا خاندان یہاں سے چلا گیا۔ وہ لوگ بھی کراچی میں ہیں اور بہت مزے میں ہیں۔ کوئی بتا رہا تھا کہ منور چاچا اور سلیمہ چاچی کچھ دنوں کے لیے گاؤں آنے والے ہیں۔''

''ہمارے گاؤں سے کئی لوگ کراچی چلے گئے۔'' ماجدہ نے کہا۔ ''لوگ کہتے ہیں کہ کراچی پہنچتے ہی کوئی نہ کوئی کام مل جاتا ہے اور آدمی بھوکا نہیں رہتا۔''

''مگر کراچی پہنچنا بھی تو شرط ہے۔'' بانو نے کہا۔ ''یہ کوئی آسان بات تھوڑی ہے، کتنی دور ہے کراچی یہاں سے..... اور پھر پیسہ بھی بہت خرچ ہوتا ہے وہاں جانے میں.....''

''خالدہ آپا نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ کراچی میں بہت بنگالی آباد ہیں اور برابر آ رہے ہیں۔'' بانو نے کہا۔ ''وہاں بنگالیوں کے اپنے علاقے ہیں، جہاں بڑی تعداد میں بنگالی رہتے ہیں۔ سب لوگوں کو کام مل جاتا ہے، بہت سی بنگالی عورتیں کوٹھیوں اور بنگلوں میں کام کرتی ہیں

اور انہیں اچھے پیسے ملتے ہیں۔''

وہ تینوں کچھ دیر تک کراچی اور پاکستان کے بارے میں باتیں کرتی رہیں جن کے متعلق ان کی معلومات اگرچہ محدود تھیں لیکن پھر بھی وہ اپنے گرد و پیش جس شہر اور جس ملک کا سب سے زیادہ نام سنتی تھیں، وہ کراچی اور پاکستان ہی تھا۔ گاؤں میں کتنے ہی لوگ ایسے تھے جو پاکستان کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے۔ کئی ایسے تھے جو برسوں تک پاکستان میں رہ چکے تھے اور 1970ء کے بعد پاکستان سے بنگال واپس آ گئے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو کراچی سے واپس آنے کے کچھ عرصہ بعد دوبارہ کسی نہ کسی طرح کراچی چلے گئے تھے اور پھر وہیں رہنے اور کام کرنے لگے تھے۔

''میں کل ہاشم کے ساتھ کھلنا جا رہی ہوں۔'' ماجدہ نے اپنی دونوں سہیلیوں کو اطلاع دی۔ ''ہاشم کو کچھ چیزیں خریدنی ہیں اور پھر ہم لوگ فلم دیکھیں گے۔''

''اچھا؟'' اختری نے گہری دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو شہر گئے ہوئے کئی مہینے ہو گئے۔'' اس کے لہجے میں قدرے اداسی گھلی ہوئی تھی۔

''میں اگلے ہفتے جاؤں گی۔'' بانو نے کہا۔ ''میری چھوٹی پھوپھی کے بیٹے کی شادی ہے۔''

''تو پھر تو تم کئی روز کے لیے جاؤ گی؟'' ماجدہ نے پوچھا۔

''ہاں۔'' بانو نے جواب دیا۔ ''ہم لوگ ایک ہفتے تک وہاں رہیں گے۔''

اب شام قریب آ رہی تھی۔ تینوں لڑکیاں ندی اور اس کے اندر اور اس کے کنارے پر ہونے والی گہما گہمی کو چھوڑ کر واپس اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو گئیں۔

ماجدہ کی پیدائش 1971ء میں ہوئی تھی، جب مشرقی پاکستان، پاکستان کا ہی حصہ تھا لیکن علیحدگی کے دہانے پر کھڑا ہوا تھا۔ ماجدہ نے ہوش سنبھالنے کے بعد خود کو پاکستان میں نہیں بلکہ بنگلہ دیش میں پایا تھا۔ اس کی عمر ایک سال کی تھی جب بنگلہ دیش وجود میں آ گیا تھا۔ ماجدہ نے آنکھ کھول کر اپنے چاروں طرف نفسا نفسی اور معاشی ابتری کی فضا پائی تھی۔ کراچی کی دولت اور روزگار کے قصے بہت عام تھے اور گاؤں کے کتنے ہی لوگ کسی نہ کسی طرح کراچی چلے گئے تھے۔ ماجدہ اپنے بڑوں سے ان دنوں کے بارے میں باتیں اور طرح طرح کے قصے سنا کرتی تھی، جب اس کا گاؤں پاکستان میں تھا اور کھلنا شہر بھی پاکستان میں تھا۔ پھر پاکستان یہاں سے غائب ہو گیا۔ اس کا گاؤں اور شہر اپنی جگہ پر رہے لیکن اب وہ بنگلہ دیش کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حصہ تھے۔

نو سالہ ماجدہ کو ستارہ آپا کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ گاؤں کے اسکول میں کبھی اردو بھی پڑھائی جاتی تھی۔ خود ستارہ آپا کو اردو لکھنا اور پڑھنا آتی تھی لیکن اب وہ یہاں ایک بھولی بسری زبان تھی۔ ماجدہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی اور ماجدہ کی عمر کے دوسرے بچے بھی اس سے ناواقف تھے۔

اگلے دن ہاشم مقررہ وقت پر آ گیا۔ ماجدہ بالکل تیار تھی اور ہاشم کا انتظار کر رہی تھی۔ ہاجرہ نے جاتے وقت ہاشم کو ایک بار پھر سختی کے ساتھ تاکید کی کہ وہ فلم ختم ہونے کے فوراً بعد گاؤں کے لیے روانہ ہو جائے اور زیادہ دیر نہ لگائے۔ ہاشم نے اسے یقین دلایا کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔

وہ دونوں جب گھاٹ پر پہنچے تو کھلنا جانے والی کشتی تیار کھڑی ہوئی تھی۔ ابھی اس میں کچھ مزید مسافروں کی گنجائش تھی اور مانجھی لوگ مسافروں کے انتظار میں تھے۔ ہاشم اور ماجدہ کی شکل میں وہ مزید مسافر انہیں مل گئے اور پھر کشتی وہاں سے روانہ ہو گئی۔

آبی پرندوں کی ایک لمبی قطار آسمان پر کشتی کے ساتھ ساتھ پرواز کر رہی تھی۔ چمکیلی دھوپ میں ندی کا پانی شیشے کی طرح چمک رہا تھا اور جا بجا کشتیاں بہتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ سارا منظر نامہ ایک طلسماتی حُسن سے بھرپور تھا۔ ماجدہ کے لیے یہ سارا منظر نامہ ایک اور معنویت بھی لیے ہوئے تھا۔ ہاشم اس کے ساتھ تھا اور یہ اس منظر نامے کی اہم ترین خصوصیت تھی۔

کشتی روانہ ہو گئی۔ مانجھیوں نے چپو چلانے شروع کر دیئے اور کشتی تیزی سے پانی کی سطح پر بھاگنے لگی۔ ماجدہ کو یہ سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا پانی میں تیرتا ہوا زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا..... اور زمین کے اس ٹکڑے پر ہاشم اس کے ساتھ، اس کے قریب بیٹھا ہوا..... اتنا قریب کہ وہ اس کی سانسوں کی گرمی کو بھی محسوس کر سکتی تھی۔

ندی کا پاٹ آگے جا کر کچھ اور چوڑا ہو گیا تھا اور دوسرا کنارہ زیادہ دور ہو گیا تھا۔ کھلنا تک پہنچنے کے لیے ندی کو پار کر کے دوسرے کنارے پر جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ کھلنا اسی طرف واقع تھا جس طرف مادھو پور واقع تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد وہ لوگ کھلنا پہنچ گئے۔ کشتی گھاٹ پر لگی اور اترنے والے مسافر اترنے لگے۔ ہاشم اور ماجدہ بھی ان میں شامل تھے۔ کشتی سے اترتے وقت ہاشم

نے ماجدہ کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ماجدہ کو بہت اچھا لگا تھا۔ کھلنا میں دھوپ نکلی ہوئی تھی اور مطلع بالکل صاف تھا۔ تاہم گزشتہ روز کی تیز اور موسلا دھار بارش کے آثار یہاں بھی موجود تھے۔ یہاں بھی ویسی ہی بارش ہوتی تھی جیسی کہ مادھو پور میں۔

''ہم کون سی فلم دیکھیں گے؟'' ماجدہ نے ہاشم سے پوچھا۔ اسے کچھ فاصلے پر کئی فلموں کے سائن بورڈ اور پوسٹر لگے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

''ہم..... ہم دیوداس دیکھیں گے، اگر ٹکٹ مل گئے تو.....'' ہاشم نے سامنے سائن بورڈوں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''دیوداس شرت چند چٹر جی کا ناول ہے، بنگالی میں..... اور اس ناول پر ہندی اور بنگالی میں کئی فلمیں بنی ہیں۔ بڑا اچھا ناول ہے، میں نے پورا پڑھا ہے۔''

''اچھا؟'' ماجدہ نے دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''تو پھر دیوداس ہی سہی۔''

''پہلے ہم جلدی جلدی خریداری کر لیں۔'' ہاشم نے کہا۔ ''فلم کے ٹکٹ ملنے میں ابھی کافی دیر ہے۔''

وہ دونوں جلدی جلدی چلتے ہوئے بازار کی طرف نکل گئے، جہاں ہاشم نے اپنی ضرورت کی چیزیں خریدیں اور ماجدہ نے بھی اپنے بالوں کے لیے فیتے خرید لیے جن کے لیے پیسے اسے اس کی ماں نے دے دیئے تھے۔ اس کے بعد وہ دونوں اس سینما ہاؤس کی طرف چل پڑے جہاں بنگالی زبان میں فلم دیوداس کی نمائش ہو رہی تھی۔ اگرچہ یہاں کافی رش تھا، پھر بھی وہ دو ٹکٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں اندر جا کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

فلم شروع ہو گئی تو ماجدہ اس کے سحر میں ڈوبتی چلی گئی اور جیسے جیسے فلم آگے بڑھتی گئی ویسے ویسے یہ سحر اور زیادہ گہرا ہوتا گیا۔

دیوداس اور پاروتی کی بچپن کی دوستی اور محبت کے مناظر میں ماجدہ کو لاشعوری طور پر اپنی اور ہاشم کی دوستی کی جھلک نظر آ رہی تھی، جو بڑھتے بڑھتے محبت کی شکل اختیار کرتی جا رہی تھی۔

لیکن پھر جیسے جیسے فلم آگے بڑھتی گئی، ویسے ویسے ماجدہ کے دل میں خوف پیدا ہوتا گیا اور اس خوف میں اضافہ ہوتا گیا۔ کہانی نے ایک بالکل ہی دوسرا رخ اختیار کر لیا تھا۔ دیوداس اور پارو کی محبت تباہ ہوتی جا رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دونوں ہی اپنے آپ کو تباہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرنے پر تل گئے ہیں۔ ماجدہ پر رقت طاری ہونے لگی۔

فلم کے آخری سین پر جب دیوداس پاروتی کے شوہر کی حویلی کے دروازے پر آ کر دم توڑ دیتا ہے اور پاروتی کا شوہر پاروتی کی تمام تر گریہ وزاری کے باوجود اسے حویلی سے باہر جانے کی اجازت نہیں دیتا اور پھاٹک بند کروا دیتا ہے، ماجدہ اپنے آنسو نہ روک سکی۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ یہ تو اچھا تھا کہ ہال میں اندھیرا تھا اور اس کے قریب بیٹھے ہوئے ہاشم نے اس کی یہ حالت نہیں دیکھی۔ روشنی ہونے سے پہلے ہی ماجدہ نے دوپٹے کے پلو سے اپنے چہرے کو اچھی طرح صاف کر لیا تھا۔ آخری سین دکھائے جانے کے موقع پر ہال میں اس قدر گہرا سناٹا طاری ہو گیا تھا جیسے وہاں کسی بھی انسان کا وجود نہ ہو اور سارا ہال خالی ہو چکا ہو۔

فلم ختم ہو گئی، ہال میں اجالا ہو گیا اور لوگ اپنی اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے، ہال کے دروازے کھل چکے تھے۔ ہاشم نے ایک بار پھر ماجدہ کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور دونوں ہجوم کے درمیان میں سے راستہ بناتے ہوئے باہر آ رہے تھے۔

''تو یہ تھا بچپن کی اس محبت کا انجام؟'' ماجدہ نے لرز کر دل میں سوچا۔ ''تو کیا ایسا ہی ہوتا ہے؟ نہیں نہیں..... ہمیشہ ایسا تو نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ بھی تو کچھ ہو سکتا ہے..... کچھ اور بھی تو ہو سکتا ہے..... کوئی اچھی اور خوشگوار بات..... سارے ہی والدین تو دیو کے والدین کی طرح نہیں ہوتے.....'' ماجدہ خیالات کے تانے بانے بنتے ہوئے اپنے اس درد کی شدت پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ نوجوانی کی طرف تیزی سے قدم بڑھاتی ہوئی یہ کمسن لڑکی اپنی اس نوخیز محبت کے دفاع کی راہیں تلاش کر رہی تھی، جس سے وہ ابھی پوری طرح واقف بھی نہیں تھی۔ پاروتی کے شوہر کی حویلی کے پھاٹک کے باہر دم توڑتے ہوئے دیوداس کی شکل میں اسے اچانک ہاشم کے چہرے کی جھلک نظر آنے لگی تھی اور وہ اس تصور کو بڑی سختی کے ساتھ جھٹکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''تمہیں یہ فلم کیسی لگی؟'' اچانک وہ ہاشم کی آواز سن کر چونک پڑی۔ اسے خیال آیا کہ سینما ہال سے باہر نکلنے کے بعد اس کے اور ہاشم کے درمیان ابھی تک کوئی بات نہیں ہوئی ہے۔

''ہاں، بہت اچھی فلم تھی۔'' ماجدہ نے کہا۔ ''لیکن بڑی غمناک فلم تھی۔ اگر دیوداس نہ مرتا تو کتنا اچھا ہوتا۔''

''یہ کتاب میرے پاس موجود ہے۔'' ہاشم نے اس کے تبصرے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم پڑھنا چاہو تو میں تمہیں دے سکتا ہوں۔ فلم تو تم نے دیکھ ہی لی ہے۔ پھر کتاب پڑھنے میں زیادہ مزہ آئے گا۔''

''ضرور دینا۔'' ماجدہ نے کہا۔ ''ستارہ آپا تو مجھے اکثر کتابیں پڑھنے کے لیے دیتی ہیں۔ مگر وہ زیادہ تر بچوں کی کہانیوں کی کتابیں ہوتی ہیں۔''

دونوں باتیں کرتے گھاٹ تک آ گئے۔ دن ڈھل چکا تھا اور شام سر پر کھڑی تھی، انہیں جلد از جلد مادھو پور کے لیے روانہ ہو جانا تھا۔

وہ دونوں کشتی کا انتظار کرنے لگے۔ کشتی کے آنے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔

اچانک ہاشم کو یاد آیا کہ اسے اپنے لیے ایک قلم بھی خریدنا تھا اور وہ دوسری چیزوں کے ساتھ قلم خریدنا تو بالکل ہی بھول گیا تھا۔

''ارے..... میں نے قلم نہیں لیا ماجدہ۔'' اس نے پریشانی کے ساتھ کہا۔ ''میں بالکل ہی بھول گیا، مجھے تو اس کی سخت ضرورت ہے۔''

''تو لے لو۔'' ماجدہ نے غائب دماغی کے ساتھ کہا۔ وہ ابھی تک اس فلم کے آخری سین کے غم انگیز سحر میں بری طرح گرفتار تھی۔

''مجھے دوبارہ دکان تک جانا پڑے گا۔'' ہاشم نے کہا۔ ''مجھے ڈر ہے کہ اس دوران کہیں کشتی نہ نکل جائے۔ پھر دوسری کشتی کا انتظار کرنا پڑے گا۔''

''تم جاؤ۔'' ماجدہ نے کہا۔ ''میں یہاں گھاٹ پر رکتی ہوں۔ اگر اس دوران کشتی آ گئی تو میں مانجھیوں سے کہہ سن کر انہیں ذرا دیر کے لیے روک لوں گی اور اگر وہ نہیں مانے تو کوئی بات نہیں۔ ہم دوسری کشتی کا انتظار کر لیں گے۔ ابھی تو وقت ہے، دوسری کشتی بھی مل سکتی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' ہاشم نے کہا۔ ''میں جاتا ہوں بہت جلدی جلدی جاؤں گا، بس یوں سمجھو کہ ادھر گیا اور اُدھر آیا.....''

ہاشم لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ ماجدہ اسے خالی خالی نظروں سے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس کے دل میں جو ایک المناک کیفیت پیدا ہو رہی تھی، اسے اس نے جھٹکنے کی کوشش کی۔

دور کونے میں کھڑی ہوئی ایک سن رسیدہ عورت نے ان دونوں بچوں کو اس وقت غور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے دیکھا تھا جب وہ دونوں گھاٹ پر آئے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ انہیں کشتی کے ذریعے کہیں جانا تھا۔

پھر تقریباً فوراً ہی وہ لڑکا لڑکی کو چھوڑ کر تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ لڑکی اکیلی رہ گئی۔ عورت کچھ دیر تک تو لڑکے کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی، پھر آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی ہوئی اس لڑکی کے پاس آ گئی جو اس وقت ایک بینچ پر بیٹھ گئی تھی۔ عورت اس کے قریب آ کر خود بھی اسی بینچ پر بیٹھ گئی۔

''تمہارے بُندوں کا ڈیزائن بہت خوبصورت ہے۔'' عورت نے مسکراتے ہوئے لڑکی سے کہا اور اس طرح اس کے ساتھ بات چیت کا آغاز کر دیا۔ ''بہت قیمتی معلوم ہوتے ہیں۔''

''نہیں تو۔'' لڑکی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''بالکل معمولی قسم کے ہیں۔''

''معمولی سہی، لیکن خوبصورت بہت ہیں۔'' عورت نے کہا۔ ''کیا یہیں شہر کی کسی دکان سے خریدے تھے؟''

''مجھے معلوم نہیں۔'' لڑکی نے سادگی سے جواب دیا۔ ''میرے بابا نے خریدے تھے۔''

''تم یہیں کھلنا میں رہتی ہو؟'' عورت نے سلسلہ گفتگو کو آگے بڑھایا۔

''نہیں.....'' ماجدہ نے جواب دیا۔ ''میں مادھو پور گاؤں میں رہتی ہوں۔ میں اپنے تایا زاد بھائی کے ساتھ کھلنا آئی تھی، اب گھر واپس جا رہی ہوں۔''

''اوہ.....!'' عورت نے جیسے اطمینان کا سانس لیا۔ ''تو تم یہاں نہیں رہتیں۔ تمہارا گھر مادھو پور میں ہے۔'' اس کے بعد وہ عورت بڑی لگاوٹ اور اپنائیت کے انداز میں ماجدہ سے باتیں کرنے لگی۔ اس نے ماجدہ اور اس کے تایا زاد بھائی کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم کر لیں اور یہ بھی جان لیا کہ وہ قلم خریدنے گیا ہے اور ابھی ذرا دیر میں واپس آ جائے گا، جس کے بعد وہ دونوں کشتی سے مادھو پور روانہ ہو جائیں گے۔

عورت کے ہاتھ میں کپڑے کا ایک تھیلا تھا۔ اس نے اس میں سے پانوں کی ایک ڈبیہ نکالی۔ اسے کھول کر اس میں سے ایک بیڑا نکال کر اپنے منہ میں دبا لیا۔ ایک اور بیڑا نکال کر مسکراتے ہوئے اس نے ماجدہ کی طرف بڑھایا۔ ''لو پان کھاؤ..... بہت مزے کے پان ہیں یہ.....''

ماجدہ نے پان لے کر اپنے منہ میں رکھ لیا۔ وہ عورت مسکرا کر ماجدہ کو دیکھ رہی تھی۔ پان کا رس ماجدہ کے حلق سے نیچے اتر رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی اسے اپنے رگ و پے

میں ایک ہلکی ہلکی سی بڑی خوشگوار سنسنی کا احساس ہو رہا تھا۔ پھر اس سنسنی نے اس کے دماغ کو اس قدر ہلکا کر دیا کہ وہ خود کو ہواؤں میں اُڑتا ہوا محسوس کرنے لگی۔

☆======☆======☆

ماجدہ کی آنکھوں میں اچانک میٹھی میٹھی اور ٹھنڈی نیند بھرنے لگی تھی اور دماغ پر چھایا ہوا وہ المناک بوجھ، جس میں دیو داس کی موت کا تازہ تازہ دکھ سب سے زیادہ شامل تھا، بڑی تیزی کے ساتھ خود فراموشی کی ایک انوکھی کیفیت میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ ماجدہ کو اپنے سارے جسم میں ایک عجیب قسم کی ناتوانی کا احساس ہو رہا تھا اور پھر اسے آنکھیں کھولنے میں بھی دشواری محسوس ہونے لگی۔

عورت بڑے غور سے ماجدہ کا جائزہ لے رہی تھی اور صرف وہ عورت ہی ماجدہ کا جائزہ نہیں لے رہی تھی، کچھ فاصلے پر کھڑا ہوا ایک مرد بھی ماجدہ کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ دونوں آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کچھ باتیں کر رہے تھے۔ جب وہ عورت ماجدہ کے پاس آ کر بیٹھی تھی تو اس وقت وہ تنہا تھی اور ماجدہ کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کوئی مرد بھی ہے۔ وہ دونوں اس وقت ایک دوسرے سے الگ الگ تھے۔

ماجدہ کا سر ڈھلک گیا، جسے اس عورت نے بڑی اپنائیت اور محبت کے انداز میں اپنے شانے پر ٹکا لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مرد کو ہاتھ سے ہلکا سا اشارہ کیا۔ وہ اس اشارے کا منتظر ہی تھا۔ وہ بڑی تیزی کے ساتھ لپک کر ان دونوں کے پاس پہنچ گیا۔

عورت نے جلدی سے ماجدہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے کھڑا کرنے کی کوشش کی اور مرد فوراً اس کو سہارا دے کر آگے کی طرف لے جانے لگا۔ ماجدہ کی ٹانگیں بے جان ہو رہی تھیں اور وہ دونوں مرد و عورت مل کر اسے گھسیٹتے ہوئے ایک طرف لے جا رہے تھے۔

اس وقت شام کا جھٹپٹا پھیل رہا تھا، لیکن ابھی اندھیرا نہیں ہوا تھا۔ ہر چیز صاف اور واضح طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ وہ دونوں جلدی جلدی ماجدہ کو وہاں سے لیے جا رہے تھے۔

''کیا ہو گیا؟'' ایک بوڑھے آدمی نے، جس کے ساتھ ایک نوجوان عورت بھی تھی ان لوگوں کو دیکھ کر پوچھا۔

''بیٹی ہے ہماری۔'' مرد نے جلدی سے کہا۔ ''طبیعت خراب ہو گئی ہے۔''

''اسے اکثر اس قسم کے دورے پڑ جاتے ہیں۔'' عورت نے لقمہ دیا۔ ''بس، بیٹھے بٹھائے اچانک.....''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''عورتوں کے ساتھ اکثر ایسا ہوتا ہے۔'' بوڑھے کے ساتھ موجود عورت نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''میں کچھ مدد کروں تم لوگوں کی؟''

''نہیں نہیں۔'' عورت نے جلدی سے کہا۔ ''ہم اسے لے جائیں گے، ہماری کشتی قریب ہی موجود ہے۔''

وہ دونوں حتی المقدور تیز تیز چلتے ہوئے گھاٹ کے اس طرف بڑھنے لگے جدھر کئی ایک چھوٹی چھوٹی کشتیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ کچھ اور لوگوں نے بھی انہیں ایک چھوٹی لڑکی کو سہارا دے کر لے جاتے ہوئے دیکھا اور ایک عورت نے آگے بڑھ کر پُرسشِ احوال کے ساتھ مدد کی پیشکش بھی کی لیکن ان لوگوں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے معذرت کر لی۔

''اس کے ساتھ تو اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔'' عورت نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ کہا۔ ''ہم اس کا علاج کروا رہے ہیں۔''

''کسی عامل، پیر فقیر یا جوگی کے پاس لے جاؤ۔'' عورت نے چلتے چلتے مشورہ دیا۔

''ان لوگوں کے پاس ہی اس کا علاج ہوگا، ڈاکٹری دواؤں سے کچھ نہیں ہوگا۔''

اس دوران وہ عورت اور آدمی بے ہوش ماجدہ کو سنبھالے ہوئے کافی آگے نکل گئے تھے اور اس عورت کی آواز مدھم پڑتی جا رہی تھی۔

''ذرا جلدی۔'' عورت نے مرد سے سرگوشی میں کہا۔ ''اس کے ساتھ کا لڑکا کہیں واپس نہ آ جائے۔''

''بس چند قدم اور.....'' آدمی نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ کہا اور تیزی سے کشتی کی طرف بڑھ گیا۔

چھوٹی سی اس کشتی میں صرف چند ہی لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ ایک آدمی کشتی میں پہلے سے موجود تھا۔ اب تین افراد اس میں داخل ہو گئے اور ان کے داخل ہونے کے ساتھ ہی کشتی تیزی سے وہاں سے روانہ ہو گئی۔ ان لوگوں نے ماجدہ کو کشتی کے فرش پر لٹا دیا تھا اور اب کشتی کے اندر داخل ہوئے بغیر اسے دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ ماجدہ اس وقت مکمل بے ہوشی کے عالم میں تھی۔

عورت بار بار ساحل کی طرف اس سمت میں دیکھ رہی تھی جدھر سے اس لڑکی کے تایا زاد بھائی کو آنا تھا۔ ابھی کافی اجالا تھا اور مناظر بالکل صاف طور پر نظر آ رہے تھے۔ اس لڑکے کا ابھی کہیں پتہ نہیں تھا۔

''اپنے تایا زاد بھائی کے ساتھ یہاں آئی تھی۔'' عورت نے مسکرا کر اپنے ساتھ موجود دونوں مردوں سے کہا۔ ''دونوں مادھو پور کے رہنے والے ہیں۔''

''بھائی کہاں گیا؟'' کشتی میں موجود مرد نے پوچھا۔

''ذرا دیر کے لیے بازار تک گیا ہے۔'' عورت نے کہا۔ ''قلم خریدنے گیا ہے، ابھی آتا ہی ہوگا۔''

''اب کسی وقت بھی آئے، کوئی پروا نہیں ہے۔'' عورت کے ساتھ والے مرد نے کہا۔

اندھیرا ہونا شروع ہو گیا تھا اور کشتی بڑی تیزی کے ساتھ پانی کی سطح پر پھسلتی چلی جا رہی تھی۔ آس پاس اور بھی بہت سی کشتیاں پانی میں سرسراتی چلی جا رہی تھیں اور مانجھیوں کے گیت شام کے سرمئی رنگ میں ایک نیا آہنگ گھول رہے تھے لیکن ماجدہ ان سب چیزوں سے بالکل بے خبر تھی۔

☆======☆======☆

کوئی بہت زور زور سے بڑی دردناک آواز میں رو رہا تھا۔ ماجدہ کے کانوں میں رونے کی آوازیں آ رہی تھیں، لیکن یہ بڑی عجیب سی آوازیں تھیں۔ ان میں جو درد گھلا ہوا تھا وہ جیسے کانوں کو پگھلائے دے رہا تھا۔ کیا یہ دیو داس کے رونے کی آوازیں تھیں؟ ماجدہ کے منتشر اور شکستہ وجود کے اندر سے، کہیں سے ایک سوال ابھرا۔ نہیں نہیں..... دیو تو نہیں رویا تھا۔ دیو تو کسی وقت بھی نہیں رویا تھا۔ روئی تو پارو تھی، روئی تھی، چلائی تھی، بھاگی تھی، دوڑی تھی، تو کیا یہ پارو کے رونے کی آوازیں تھیں؟ مگر پارو یہاں کہاں آ گئی تھی؟ وہ تو بس سینما گھر میں تھی اور فلم میں تھی اور اب تو وہ خدا جانے کہاں ہوگی! اور میں..... میں اس کی آوازیں کس طرح سن رہی ہوں؟

ایک گہری، گدلی دھند تھی جو ماجدہ کے دل و دماغ پر طاری تھی۔ وہ نہ جانے کون سی دنیا میں تھی اور کیسی آوازیں سن رہی تھی۔ یہ دھند رفتہ رفتہ چھٹتی جا رہی تھی، لیکن اس کے چھٹنے کی رفتار بہت سُست تھی۔ پھر ماجدہ نے غیر شعوری طور پر اپنے آپ سے لڑنا شروع کر دیا۔ وہ اس گہری دھند سے باہر آنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے وجود کو تلاش کر رہی تھی۔ آوازیں اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھیں۔

یہ کیفیت نہ جانے کتنی دیر جاری رہی اور پھر ماجدہ پورے طور سے ہوش میں آ گئی۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں اور اس نے اپنے سر کو اِدھر اُدھر گھمانے کی کوشش کی۔ فوراً ہی اس کو اتنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زور کا چکر آیا کہ وہ ایک دم ساکت ہوگئی۔ اس نے اپنے آپ کو زمین پر ایک بستر پر پڑے ہوئے پایا۔ آوازیں برابر آ رہی تھیں لیکن اب اسے یہ دیوداس یا پاروتی کے رونے کی آوازیں نہیں لگ رہی تھیں۔ اس نے ان آوازوں کو پہچاننا شروع کر دیا تھا۔ یہ گیدڑوں کے زور زور سے خوفناک انداز میں بولنے کی آوازیں تھیں۔ یہ ایک دو گیدڑ نہیں تھے یہ بہت سارے گیدڑ تھے جو غول بنا کر کسی ایک جگہ اکٹھا ہو گئے تھے اور زور زور سے ''ہوا، ہوا'' کر رہے تھے۔

ماجدہ کے لیے گیدڑوں کی آواز اجنبی نہیں تھی۔ مادھو پور میں شام کا اندھیرا ہونے کے بعد قریبی جنگل کی طرف سے گیدڑوں کے بولنے کی آوازیں آنی شروع ہو جاتی تھیں۔ ندی پر پانی پینے کے لیے آنے والے جانوروں میں گیدڑ بھی شامل ہوتے تھے جو اکثر وہاں کھڑے ہو کر آوازیں نکالتے تھے اور رات گئے تو گیدڑ گاؤں کے اندر بھی گھس آتے تھے۔ دور و نزدیک سے ان کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ کبھی کسی احاطے میں کسی ڈربے کا دروازہ کھلا رہ جاتا یا کوئی گیدڑ اسے کھولنے میں کامیاب ہو جاتا تو مرغیوں کی شامت آ جاتی لیکن ایک آدھ مرغی سے زیادہ کا نقصان نہیں ہوتا تھا، کیونکہ مرغیوں کے شور سے گھر والوں کی آنکھ کھل جاتی تھی اور پھر گیدڑوں کو بھگا دیا جاتا تھا۔

مگر یہ کیسا شور تھا؟ اتنے بہت سارے گیدڑ تو گھر کے باہر کبھی جمع نہیں ہوتے تھے۔

ماجدہ نے ایک بار پھر اپنے سر کو اِدھر سے اُدھر حرکت دی اور اس بار اسے سر کو گھمانے میں کامیابی حاصل ہوگئی، سر چکرایا تو ضرور، لیکن بہت زیادہ نہیں.....

اس نے جلدی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ رات کا نہ جانے کون سا وقت تھا..... لیکن یہ اس کے گھر کو کیا ہو گیا تھا؟

وہ ایک اجنبی کمرے میں تھی جو کبھی اس کے اپنے گھر کا حصہ نہیں تھا۔ کمرہ چھوٹا تھا اور سامنے دیوار میں ایک طاق بنا ہوا تھا، جس میں بہت ہی مدھم لو والی ایک لالٹین جل رہی تھی جس کی ناتواں روشنی دم توڑتی ہوئی لگ رہی تھی۔

ماجدہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ایک دم اسے پھر بہت زور کا چکر آیا اور وہ گرنے لگی لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اس نے جلدی جلدی اپنے اطراف میں نظریں دوڑائیں۔

زمین پر ایک لمبی سی دری بچھی ہوئی تھی جس کا رنگ نیم مردہ روشنی میں صرف کالا کالا سا ہی لگ رہا تھا۔ اس دری پر دو لڑکیاں آڑی ترچھی پڑی سو رہی تھیں۔ ان کی شکلیں صاف نظر

نہیں آ رہی تھیں لیکن انداز ے سے وہ لڑکیاں ہی معلوم ہوتی تھیں۔

اچانک ماجدہ کے دماغ میں ایک قیامت برپا ہوگئی۔ اس کے سوئے ہوئے اعصاب پوری طرح بیدار ہو گئے اور اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ وہ تو کھلنا میں تھی..... ہاشم کے ساتھ..... فلم دیکھنے گئی تھی۔ ان دونوں نے دیوداس دیکھی تھی اور پھر وہ اپنے گھر جانے کے لیے کشتی میں سوار ہونے کی غرض سے گھاٹ پر آ گئے تھے اور پھر..... پھر ہاشم قلم خریدنے چلا گیا تھا۔ وہ اکیلی بیٹھی تھی اور پھر وہ عورت اس کے پاس آ کر اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگی تھی۔ پھر اس عورت نے اسے ایک پان کھلایا تھا..... ہاں پان..... ڈبیہ میں سے نکال کر پہلے خود کھایا تھا اور پھر اسے کھلایا تھا۔

پان..... ہاں پان..... اور پھر پان کھانے کے بعد اسے کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔

یکبارگی شدید خوف کی ایک تیز و تند لہر اس کے دل و دماغ میں حشر برپا کرنے لگی۔ یہ کیا ہو گیا تھا؟ وہ کہاں آ گئی تھی؟ گھاٹ کہاں تھا؟ کھلنا کہاں تھا؟ ہاشم کہاں تھا؟ اس کا اپنا گھر کہاں تھا؟ مادھو پور کہاں تھا؟

خوف، دہشت، وحشت اور تشویش کے مارے اس کی جان نکلنے لگی۔ اس کے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی۔ ہوش میں آنے کے بعد اسے اپنے سارے جسم میں سخت کمزوری کا احساس ہو رہا تھا اور اب اس کمزوری میں کپکپاہٹ بھی شامل ہوگئی تھی۔ وہ کہاں آ گئی تھی؟

اس نے اٹھ کر کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن وہ فوری طور پر کھڑی نہیں ہو سکی۔ سہارا لینے کے لیے کوئی چیز نہیں تھی اور وہ فرش پر تھی۔ دو دفعہ کی کوشش کے بعد وہ اس طرح کھڑی ہو سکی کہ اس نے سرہانے کی طرف سرک کر دیوار کا سہارا لیا اور پھر آہستہ آہستہ کھڑی ہوگئی۔

نیم تاریکی میں وہ کمرے کے دروازے کے دھندلے خطوط کو دیکھ سکتی تھی۔ وہ سنبھل سنبھل کر چلتی ہوئی وہاں تک پہنچی اور اس نے اس کو کھولنے کی کوشش کی۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ وہ کافی زور لگانے کے باوجود اسے نہیں کھول سکی۔ کمرے میں اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا دروازہ نہیں تھا۔ ایک کھڑکی تھی جو کھلی ہوئی تھی لیکن اس میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ گیدڑوں کی خوفناک آوازیں اسی کھڑکی کے پیچھے سے آ رہی تھیں۔ وہ اس کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی۔ آوازیں کبھی مدھم پڑ جاتی تھیں، کبھی تیز ہو جاتی تھیں اور کبھی ان کے جواب میں بہت دور دور سے آنے والی ہلکی آوازیں بھی سنائی دینے لگتی تھیں۔

یہ کیا ہو گیا تھا؟ وہ کہاں آ گئی تھی؟ اس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ ''ہاشم..... ہاشم..... کہاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوگا؟ جب وہ واپس آیا ہوگا اور اس نے مجھے وہاں نہیں پایا ہوگا تو پھر اس پر کیا بیتی ہوگی؟ اس نے کیا کیا ہوگا؟ اس نے مجھے نہ جانے کہاں کہاں تلاش کیا ہوگا..... ہائے..... ہاشم..... ہاشم..... میں تو یہاں ہوں۔ نہ جانے کہاں..... تم مجھ تک کس طرح پہنچ سکتے ہو؟''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کا کلیجہ کٹ کٹ کر آنسوؤں کی شکل میں گرنے لگا۔ اس کے رونے کی آواز تیز تر ہوتی گئی۔ اس نے اپنا سر کھڑکی کی آہنی سلاخوں پر رکھ دیا اور زور زور سے رونے لگی۔

رات کے گہرے اور پُراسرار سناٹے میں گیدڑوں کی بھیانک آوازوں کے علاوہ اب اس کے اپنے رونے کی آواز بھی شامل ہو چکی تھی، لیکن ان آوازوں کے باوجود سناٹا اور زیادہ گہرا ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے رات کے اس نامعلوم حصے میں دنیا سے زندگی کا وجود ہی ختم ہو گیا ہے اور صرف بھیانک اور بے نام آوازیں باقی رہ گئی ہیں۔ فرش پر سوئی ہوئی لڑکیوں کو کچھ خبر نہیں تھی کہ ان کے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔ وہ گہری نیند میں تھیں۔

ماجدہ بڑی دیر تک کھڑکی میں کھڑی روتی رہی۔ اس نے کھڑکی کو ہلا جلا کر دیکھا۔ اس کی مضبوط آہنی سلاخیں اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوئیں، البتہ اس کے ہاتھوں میں ضرور درد ہونے لگا۔

''رات کا نہ جانے کون سا وقت ہوگا؟ ہاشم کہاں ہوگا اور کیا کر رہا ہوگا؟ اماں اور بابا کیا کر رہے ہوں گے؟ ان سب لوگوں کے دل کی کیا حالت ہوگی؟'' دردانگیز خیالات کا ایک ہجوم تھا جو اس کے دل و دماغ میں حشر برپا کیے ہوئے تھا۔

کچھ دیر کے بعد وہ واپس آ کر فرش پر بستر پر بیٹھ گئی اور اس نے اپنے سر کو دونوں گھٹنوں میں چھپا لیا۔ اس طرح وہ اندھیرے میں ڈوب گئی لیکن وہ تو پہلے ہی بُری طرح اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کے سارے وجود میں اندھیرا گھلتا جا رہا تھا۔

بہت دیر ہو گئی..... نہ جانے گھنٹے بیت گئے تھے کہ صدیاں بیت گئی تھیں۔ وقت کا احساس ہی جیسے اس کے دل سے مٹ گیا تھا۔ گیدڑوں کی خوفناک آوازیں بہت دیر ہوئی ختم ہو چکی تھیں۔ سناٹا اور زیادہ گہرا ہو گیا تھا۔

یکبارگی اس سناٹے کو کچھ ہلکی ہلکی آوازیں کاٹنے لگیں۔ ماجدہ غور سے ان آوازوں کو سننے لگی اور تب اس پر یہ انکشاف ہوا کہ یہ چڑیوں کے چہچہانے کی آوازیں تھیں۔ یہ ابھی بہت ہلکی تھیں۔ شاید چڑیوں نے ابھی چہچہانا شروع ہی کیا تھا۔

''اچھا..... تو گویا صبح ہو رہی ہے۔'' ماجدہ نے اپنے سر کو گھٹنوں پر سے اٹھایا۔ کمرے کی نیم تاریکی میں ابھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ لڑکیوں کے آڑے ترچھے بدن فرش پر اسی طرح پڑے ہوئے تھے۔

چڑیوں کے چہچہانے کا شور بڑھتا گیا۔ ''صبح ہو رہی ہے..... بابا نماز کے لیے اٹھ گئے ہوں گے۔ مسجد میں اذان ہو چکی ہوگی..... اماں چولہا جلانے کی تیاری کر رہی ہوں گی۔ ہائے ہائے میں کہاں ہوں..... ہاشم..... ہاشم..... میں کہاں ہوں..... تم کہاں ہو ہاشم.....'' ماجدہ کی سسکیاں صبح کے ملگجے اُجالے میں گھلنے لگیں۔

کھڑکی سے صبح کی روشنی اندر آنی شروع ہو گئی اور کمرے کا منظر روشن ہونے لگا۔ ماجدہ نے ان دونوں لڑکیوں کو غور سے دیکھا۔ وہ دونوں ابھی تک سو رہی تھیں، دونوں چھوٹی لڑکیاں تھیں تقریباً ماجدہ کی ہم عمر، ایک کا رنگ گندمی تھا اور دوسری کافی گوری تھی۔ ماجدہ کی طرح ان دونوں کے بال بکھرے ہوئے تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے ان میں بہت دنوں سے کنگھی نہ کی گئی ہو۔ ان کے کپڑے بھی میلے کچیلے اور مسلے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کافی دنوں سے وہ رات دن یہی کپڑے پہنے ہوئے تھیں۔

چڑیوں کے چہچہانے کا شور اپنے عروج پر تھا۔ اچانک گوری لڑکی کسمسائی اور پھر اس نے کروٹ بدلتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔

چند لمحوں تک وہ حیران حیران نظروں سے ماجدہ کو دیکھتی رہی اور پھر ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''تم..... تم کون ہو؟'' اس نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''تم یہاں کب آئیں؟''

''میں..... میں ماجدہ ہوں۔'' ماجدہ نے جواب دیا۔ ''مجھے نہیں معلوم کہ مجھے یہاں کس وقت لایا گیا۔'' اس کی آواز حلق میں پھنسنے لگی۔ ''میں کچھ نہیں جانتی..... مجھے کون یہاں لایا..... کب لایا.....'' اور وہ زور زور سے رونے لگی۔

اسی وقت دوسری لڑکی بھی اٹھ بیٹھی۔

''ارے؟'' اس نے حیران ہو کر روتی ہوئی ماجدہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''تم کون ہو؟''

چند منٹ کے اندر اندر تینوں لڑکیاں ایک دوسرے سے واقف ہو گئیں۔ گوری لڑکی کا نام میمونہ تھا۔ گندمی رنگ والی لڑکی کا نام فردوسی تھا۔ ان دونوں کو بھی ماجدہ کی طرح پکڑ کر لایا گیا تھا۔ وہ دونوں ماجدہ کے بارے میں جلد از جلد سب کچھ جان لینا چاہتی تھیں۔ ماجدہ بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ان دونوں کے بارے میں جلد از جلد سب کچھ جان لینا چاہتی تھی لیکن اس وقت اس کے ہوش وحواس بجا نہیں تھے اور وہ ٹھیک سے بات بھی نہیں کر پا رہی تھی۔ تاہم اس کے ساتھ جو کچھ گزر رہی تھی، اس کے بارے میں اس نے فردوسی اور میمونہ کو مختصراً بتا دیا۔

''ابھی وہ آتے ہوں گے۔'' فردوسی نے سرگوشی میں کہا۔ ''جب وہ آ کر چلے جائیں گے تو پھر اس کے بعد ہم کھل کر باتیں کر سکیں گے۔''

''کون؟'' ماجدہ نے چونک کر کہا۔ ''کون آئیں گے؟''

''وہ..... وہ جنہوں نے ہم کو یہاں بند کر کے رکھا ہے۔'' میمونہ نے کہا۔

''وہ کون لوگ ہیں؟'' ماجدہ نے پوچھا۔

''وہ تین افراد ہیں۔'' میمونہ نے کہا۔ ''امینہ ہے اور دو آدمی ہیں، شاہ میاں اور فرید۔ بس یہی تینوں یہاں آتے ہیں، وہی ہماری دیکھ بھال کرتے ہیں۔''

''بڑے خراب لوگ ہیں۔'' فردوسی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ ''ہمیں ایک پل کے لیے بھی اس مکان سے باہر نہیں جانے دیتے اور ہم سے گھر کا کام بھی کرواتے ہیں۔ میں اپنے گھر جانا چاہتی ہوں، میں اپنے ماں باپ کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ معلوم نہیں وہ مجھے کہاں کہاں تلاش کر رہے ہوں گے۔'' فردوسی رونے لگی۔

''ان لوگوں نے ہمیں قیدی بنا کر رکھا ہے۔'' میمونہ کہنے لگی۔ ''خدا معلوم، یہ ہمارے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہیں، کچھ بتاتے بھی نہیں اور چھوڑتے بھی نہیں، جانے ہماری تقدیر میں کیا لکھا ہے؟''

میمونہ کی بات ابھی ختم ہی ہوئی تھی کہ دروازے کے باہر آہٹ سنائی دی اور پھر دروازہ کھل گیا۔ دروازے میں داخل ہونے والی ایک پستہ قد کالی اور موٹی عورت تھی جو بہت بد صورت تھی۔ وہ دروازہ کھول کر دیر تک دروازے میں ہی کھڑی رہ کر اندر کا جائزہ لیتی رہی۔ اس کی نظریں ماجدہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ماجدہ نے اس عورت کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ وہ عورت نہیں تھی جس نے ماجدہ کو پان کھلایا تھا۔

''اچھا تو تم ماجدہ ہو۔'' موٹی، کالی بدصورت عورت نے ماجدہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''اب جبکہ تم یہاں آ گئی ہو تو اچھی طرح سن لو کہ یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کرنا اور کوئی الٹی سیدھی حرکت نہ کرنا جو کچھ تم سے کہا جائے وہی کرنا۔''

''میں گھر جانا چاہتی ہوں۔'' ماجدہ نے روتے ہوئے کہا۔ ''خدا کے لیے..... مجھے

میرے گھر جانے دو۔ میرے بابا اور اماں بہت پریشان ہوں گے۔''

''ضرور جانے دیں گے۔'' موٹی عورت نے کہا۔ ''لیکن ایسی جلدی بھی کیا ہے؟ کچھ دنوں تک ہمارے ساتھ بھی رہ لو۔ ہم تمہیں مارے تو نہیں ڈال رہے ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد تمہیں تمہارے گھر بھیج دیں گے اور اب اٹھو، باہر نکلو۔'' اس نے ماجدہ کے جواب کا انتظار کیے بغیر ان تینوں کو حکم دیا۔

میمونہ اور فردوسی فوراً ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئیں اور ان کے ساتھ ہی ماجدہ بھی اور وہ تینوں کمرے سے باہر نکل آئیں۔

کمرے کے باہر ایک برآمدہ تھا۔ اس میں چارپائی پر دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں نے ماجدہ کو غور سے دیکھا۔ اس عورت کی طرح وہ دونوں بھی ماجدہ کے لیے اجنبی تھے۔

لڑکیوں کو ہاتھ منہ دھونے کا موقع دیا گیا اور اس کے بعد عورت انہیں ساتھ لے کر باورچی خانے میں داخل ہو گئی جو صحن کے ایک کونے میں واقع تھا۔ ماجدہ نے دیکھا کہ دونوں لڑکیوں نے باورچی خانے میں جاتے ہی مشینی انداز میں کام شروع کر دیا۔ انہوں نے چولہا جلایا اور ناشتہ تیار کرنے لگیں۔

''تم یہ برتن دھو ڈالو ماجدہ۔'' عورت نے ماجدہ سے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''آخر تم کھاؤ پیو گی تو کچھ کام بھی تو کرو.....''

ماجدہ بے چوں و چرا حکم کی تعمیل کرنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے لیکن وہ کام کر رہی تھی۔ عورت ان تینوں کی نگرانی کرتی رہی اور وہ کام میں مصروف رہیں۔ ناشتہ سب سے پہلے دونوں مردوں اور اس عورت کو دیا گیا۔ ان تینوں نے چارپائی پر بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ پھر تینوں لڑکیوں کو بھی ناشتہ کروایا گیا۔

''چلو اب سبزی بنا لو۔'' عورت نے برآمدے کے ایک کونے میں لگے ہوئے سبزی کے ایک ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم بھی.....'' اس نے ماجدہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''تم بھی ان کے ساتھ لگ جاؤ، کھانا جلدی تیار ہو جائے گا۔''

سبزی اور چاول..... تینوں لڑکیوں کی مشترکہ محنت سے کھانا تیار ہو گیا۔ ماجدہ کسی سحر زدہ معمول کی طرح کام کر رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ لوگ اسے یہاں سے جانے نہیں دیں گے، جس طرح انہوں نے میمونہ اور فردوسی کو نہیں جانے دیا تھا اور انہیں قیدی بنا کر رکھا ہوا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ شدید بے بسی اور لاچاری کے عالم میں ان دونوں کی طرح ان لوگوں کے احکامات کو ماننے پر مجبور تھی۔ حکم عدولی کی گنجائش نہیں تھی۔ مردوں کی نظروں میں بڑی کڑواہٹ تھی۔ ماجدہ کو تو ان کی طرف دیکھتے ہوئے بھی ڈر لگ رہا تھا۔ لڑکیوں سے گھر کی صفائی ستھرائی اور کچھ کپڑے دھونے کا کام بھی لیا گیا، یہاں تک کہ ان کاموں میں دوپہر ہوگئی۔

عورت نے پکے ہوئے کھانے میں سے کچھ کھانا ایک برتن میں بھر کر برتن کو کپڑے میں باندھ لیا۔ ماجدہ کو ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ سب کچھ روز کا معمول ہو۔ لڑکیوں کے لیے کھانا چھوڑ دیا گیا۔

''اب تم لوگ کھانا کھالینا۔'' عورت نے کہا اور پھر وہ دونوں مردوں کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوگئی۔

ماجدہ دوڑ کر اس کے پیروں سے لپٹ گئی۔ ''خدا کے لیے..... خدا کے لیے مجھے جانے دو..... مجھے یہاں سے جانے دو..... میں اپنے گھر جانا چاہتی ہوں..... میرے بابا اور اماں کس قدر پریشان رہے ہوں گے۔''

''ارے کیوں شور مچا رکھا ہے؟'' ایک آدمی نے اس کو عورت کے پیروں سے علیحدہ کرتے ہوئے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ''جانے دیں گے..... صبر سے کام لو..... تم اپنے ماں باپ سے ضرور ملو گی.....''

''مگر تم لوگ مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟'' ماجدہ نے روتے ہوئے کہا۔ ''وہ عورت کون تھی جس نے مجھے بے ہوشی والا پان کھلایا تھا؟ تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''اپنے دماغ پر زیادہ بوجھ مت ڈالو اور کھانا کھا کر آرام سے سو جاؤ۔'' دوسرے آدمی نے کہا۔ ''کیا یہ کافی نہیں ہے کہ تم زندہ سلامت ہو اور تمہارے ہاتھ پیر، ناک کان سلامت ہیں؟ انسان اگر صحیح سالم حالت میں زندہ رہے تو پھر سب کچھ ٹھیک ہے۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟''

''مگر میں اپنے گھر والوں کے ساتھ زندہ رہنا چاہتی ہوں۔'' ماجدہ نے گڑگڑا کر کہا۔

''فی الحال تو ہمارے ساتھ زندہ رہو۔'' آدمی نے کہا۔ ''پھر گھر والوں کے ساتھ بھی زندہ رہ لینا۔''

عورت نے کھانے سے بھرا ہوا برتن اٹھایا اور وہ تینوں دروازے کی طرف بڑھے۔ ماجدہ سسکیاں لیتی رہ گئی اور وہ تینوں باہر نکل گئے۔ دروازے کو باہر سے بند کر دیا گیا۔ اس

چھوٹے سے گھر میں جو ایک کمرے، ایک برآمدے، ذرا سے صحن، ایک سائبان جیسے باورچی خانے اور غسل خانے پر مشتمل تھا، اب تینوں کم سن لڑکیوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ ماجدہ مسلسل روئے جا رہی تھی اور پھر میمونہ اور فردوسی بھی رونے میں اس کے ساتھ شامل ہوگئیں۔

آہستہ آہستہ گریہ وزاری کا طوفان تھما تو پھر آپس میں تفصیلی بات چیت اور معلومات کے تبادلے کا سلسلہ شروع ہوا۔

جو عورت یہاں آئی تھی، اس کا نام امینہ تھا اور وہ لڑکیوں سے کہتی تھی کہ اسے امینہ چاچی کہا جائے۔ لڑکیاں اس کے منہ پر اسے امینہ چاچی ہی کہتی تھیں۔ دو آدمیوں میں سے جس کے چہرے پر ہلکی سی داڑھی تھی اس کا نام شاہ میاں تھا اور دوسرے کا نام فرید تھا۔ امینہ کا یہ بھی اصرار تھا کہ لڑکیاں شاہ میاں اور فرید کے ناموں کے ساتھ بھی ''چاچا'' کا دم چھلا لگا کر انہیں مخاطب کریں۔

وہ تینوں روز صبح کو وہاں آتے تھے اور ان دونوں لڑکیوں سے گھر کا سارا کام کاج کرواتے تھے جس میں ناشتہ تیار کرنا اور کھانا پکانا بھی شامل تھا۔ پھر ناشتہ وہ وہیں کرتے تھے اور کھانا اپنے ساتھ لے کر چلے جاتے تھے۔ لڑکیوں کے لیے کھانا وہیں چھوڑ دیا جاتا تھا، جو ان کے دونوں وقت کے لیے کافی ہوتا تھا۔ دوپہر تک یہاں رہنے کے بعد وہ تینوں یہاں سے چلے جاتے تھے۔ شام کے وقت ان میں سے کوئی بھی دو افراد آتے تھے اور ہر چیز کا اچھی طرح سے جائزہ لینے کے بعد چراغ جلے دونوں لڑکیوں کو اس کمرے میں بند کر کے چلے جاتے تھے، پھر انہیں صبح کو ہی رہائی ملتی تھی۔

اس مکان کے باہر کیا ہے، فردوسی اور میمونہ کو اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ دوپہر کے بعد سے شام تک وہ دونوں اس مکان میں اکیلی ہوتی تھیں اور انہوں نے متعدد بار بند دروازے کے ساتھ زور آزمائی کرنے کی کوشش کی تھی لیکن لکڑی کے بہت مضبوط اور بھاری دروازے کو توڑنا ان کے بس سے باہر تھا۔ مکان کی دیواریں بھی اتنی اونچی تھیں کہ وہ انہیں پھلانگ کر باہر نہیں جا سکتی تھیں۔ گھر میں کوئی ایسی چیز، سیڑھی وغیرہ نہیں تھی جس کا سہارا لے کر وہ اوپر چڑھ سکیں۔

اس مکان کے باہر سے انہیں کبھی کوئی آواز بھی نہیں سنائی دیتی تھی اور وہ بالکل اندازہ نہیں کر سکتی تھیں کہ یہ کوئی بستی ہے یا جنگل ہے۔ البتہ رات کو گیدڑوں، الوؤں اور بعض دیگر جنگلی جانوروں کی آوازیں سن کر یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ وہ جنگل سے زیادہ دور نہیں ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انہوں نے بارہا دروازے کو اندر سے زور زور سے پیٹا تھا، چلا چلا کر آوازیں دی تھیں، مدد کے لیے زور زور سے شور مچایا تھا کہ شاید باہر سے گزرنے والا کوئی شخص ان کی آواز سن لے اور انہیں اس عذاب سے چھٹکارا دلا دے، لیکن باہر بالکل سناٹا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس مکان کے باہر کسی انسان کا وجود ہی نہیں ہے۔

وہ گھنٹوں دروازے کے پاس کھڑی ہوئی دروازے سے کان لگائے رہتیں اور باہر سے آنے والی کسی آواز کو سننے کی کوشش کرتیں لیکن باہر کی دنیا تو جیسے بالکل بے آواز ہو کر رہ گئی تھی۔

میمونہ یہاں پہلے آئی تھی۔ اسے آئے ہوئے کوئی دس دن گزر چکے تھے۔ اسے جب یہاں لایا گیا تھا تو اس مکان میں اس کے علاوہ اور کوئی دوسری لڑکی نہیں تھی۔ ان دنوں امینہ چوبیس گھنٹے یہاں موجود رہتی تھی اور شاہ میاں اور فرید بھی آتے جاتے رہتے تھے۔ رات کو ان دونوں میں سے کوئی ایک یہاں ضرور رہتا تھا۔ میمونہ رات دن روتی رہتی تھی اور ان لوگوں سے التجا کرتی رہتی تھی کہ وہ اسے گھر جانے دیں لیکن وہ لوگ تو جیسے سنتے ہی نہیں تھے۔

اس کے تین دن کے بعد فردوسی کو وہاں لایا گیا اور پھر معمولات بدل گئے۔

اور اب فردوسی کے آنے کے ایک ہفتے کے بعد ماجدہ کو بھی وہاں لایا گیا تھا۔

یہ تینوں لڑکیاں مختلف جگہوں کی رہنے والی تھیں اور انہیں مختلف طریقوں سے پکڑا گیا تھا۔

میمونہ ایک چھوٹے سے قصبے نور گنج کی رہنے والی تھی۔ اس کا باپ قصبے کے اسکول میں ٹیچر تھا اور میمونہ خود بھی اسکول میں پڑھتی تھی۔ ایک روز وہ اسکول سے واپس گھر آ رہی تھی کہ اچانک بہت تیز بارش شروع ہوئی۔ میمونہ سڑک کے کنارے ایک پرانے چھپر کے نیچے کھڑی ہو گئی اور بارش کے ہلکے ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ اس کے پاس چھتری بھی نہیں تھی۔ وہ اکیلی تھی۔

اسی وقت ایک سائیکل رکشا اس کے سامنے آ کر رکا۔ رکشہ کھینچنے والا برساتی اوڑھے ہوئے تھا اور اس کی شکل صاف نظر نہیں آ رہی تھی۔ رکشا کے اندر ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔

''بیٹی تم کہاں جاؤ گی؟'' رکشا میں بیٹھے ہوئے شخص نے رکشا میں سے جھانکتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ''تمہارا گھر کہاں ہے؟''

میمونہ نے اس آدمی کو اپنے گھر کا پتہ بتا دیا۔

''آ جاؤ میری بچی۔'' آدمی نے پُرمحبت لہجے میں کہا۔ ''بارش تو ابھی نہیں رکے گی، میں تمہیں تمہارے گھر تک چھوڑ دوں گا، مجھے تو اس سے بھی آگے جانا ہے۔''

میمونہ کو اس نیک دل اور مہربان آدمی کی یہ پیش کش بہت اچھی لگی اور وہ جلدی سے سائبان کے نیچے سے نکل کر رکشا کی طرف آ گئی۔ اس ذرا سی دیر میں وہ تھوڑا سا بھیگ بھی گئی۔ آدمی نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر اسے رکشا میں سوار ہونے میں مدد دی۔ میمونہ بیٹھ گئی اور اس کے ساتھ ہی رکشا وہاں سے چل پڑا۔

''کس کی بیٹی ہو تم؟'' میمونہ کے ساتھ بیٹھا ہوا آدمی اس سے نرم و شیریں لہجے میں گفتگو کرنے لگا۔ میمونہ نے اسے اپنے اور اپنے خاندان کے بارے میں بتایا۔ میمونہ چوتھی کلاس کی طالبہ تھی۔

''شاباش۔'' آدمی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم بہت اچھی بچی ہو۔ میں تمہیں ایک خوشبو کا تحفہ دوں گا۔ اپنے ماں باپ کو دکھانا وہ بہت خوش ہوں گے۔ تم پہلے ذرا اس خوشبو کو سونگھ کر دیکھو۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی جیب میں سے ایک شیشی نکالی اور ساتھ ہی ایک رومال بھی۔ اس نے شیشی کو کھول کر اس میں موجود ''خوشبو'' رومال پر چھڑکی اور پھر فوراً ہی وہ رومال میمونہ کی ناک سے لگا دیا۔

یہ کوئی اچھی خوشبو نہیں تھی۔ میمونہ کو یہ بہت ہی بُری لگی۔ وہ اس شخص کے ہاتھ کو ہٹا دینا چاہتی تھی لیکن اسے اس کی مہلت ہی نہیں مل سکی۔ اس کا دماغ سن ہونے لگا اور پھر اسے کچھ ہوش نہیں رہا۔ دوبارہ جب اسے ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو اس کمرے میں فرش پر پڑے ہوئے پایا۔ آنکھ کھلتے ہی اس نے جو شکل دیکھی وہ اس کالی کلوٹی، موٹی اور بدصورت عورت کی تھی۔

سب کچھ غائب ہو چکا تھا۔ وہ رکشا، وہ آدمی، وہ ناگوار بُو، میمونہ کا گھر، اس کا شہر، اس کے گھر والے..... سب کچھ اچانک نہ جانے کہاں چلا گیا تھا اور وہ اس اجنبی مکان میں اس اجنبی عورت کے ساتھ تھی۔ وہ شدید خوف اور وحشت کے عالم میں گریہ وزاری کر رہی تھی اور اپنے گھر جانا چاہتی تھی، لیکن اس کا گھر تو نہ جانے کہاں کھو گیا تھا۔

تین دن بعد وہاں فردوسی بھی آ گئی۔

فردوسی جیسور کے قریب ایک گاؤں کی رہنے والی تھی، جیسور کھلنا کے قریب واقع تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فردوسی کا باپ کسان تھا اور اس کا زیادہ تر وقت کھیتوں میں گزرتا تھا۔ فردوسی اپنے بھائی نصیر کے ساتھ اس کے لیے دوپہر کا کھانا لے کر جاتی تھی۔

اس روز وہ اکیلی کھانا لے کر جا رہی تھی، کیونکہ نصیر کو صبح سے بخار تھا۔ نصیر خود تو جانے کے لیے تیار تھا لیکن ماں نے اسے روک دیا تھا۔ اس نے نصیر کو کوئی دوا کھلائی تھی اور اس سے کہا تھا کہ وہ آرام کرے۔ فردوسی اکیلی ہی باپ کے لیے کھانا لے کر کھیتوں کی طرف روانہ ہو گئی۔

وہ ابھی آدھے راستے میں ہی تھی کہ اسے ایک فقیر ملا، جو اسے روک کر اس سے ایک قریبی گاؤں کا راستہ پوچھنے لگا۔ فردوسی کو وہ راستہ معلوم تھا، اس نے بتا دیا۔ فقیر اس سے بہت خوش ہوا اور اس نے اپنی جھولی میں سے ایک لڈو نکال کر فردوسی کو دیا۔

''یہ فقیر کا تحفہ ہے بچی۔'' فقیر نے مسکرا کر کہا۔ ''اسے کھا لو، ایسا لڈو تمہیں دنیا میں کہیں اور نہیں مل سکے گا۔''

فردوسی نے فقیر کا دیا ہوا لڈو کھا لیا اور اس کے ساتھ ہی اسے بڑے زور کا چکر آنے لگا، اس نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ گر پڑے گی۔

آخری بات جو فردوسی کو یاد تھی وہ یہ تھی کہ قریب ہی ایک درخت کے پیچھے سے ایک آدمی نکل کر اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

فردوسی کو جب دوبارہ ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو اس اجنبی، پُراسرار مکان میں پایا۔ وہاں اسی جیسی ایک اور ستم رسیدہ لڑکی میمونہ پہلے سے موجود تھی۔

فردوسی اور میمونہ کو اس مکان کے باہر کی دنیا کے بارے میں کچھ معلوم تھا، نہ ان تینوں افراد کے بارے میں، جنہوں نے انہیں یہاں قید کر کے رکھا تھا۔ انہیں بس ان تینوں افراد کے نام معلوم تھے۔ دونوں لڑکیوں کو بالکل نہیں معلوم تھا کہ انہیں کیوں پکڑ کر قید کیا گیا ہے اور ان کے ساتھ کیا کیا جانے والا ہے۔ وہ زیادہ تر وقت روتی رہتی تھیں، گڑگڑا کر ان لوگوں سے پوچھتی تھیں کہ ان کے ساتھ ایسا کیوں کیا جا رہا ہے اور انہیں ان کے گھروں سے کیوں الگ کر دیا گیا ہے لیکن انہیں اپنے سوالوں کا کوئی جواب فراہم نہیں کیا جاتا تھا۔ ایک مستقل بے یقینی کی کیفیت تھی جس سے وہ دوچار تھیں اور اب ان کے ساتھ ایک اور لڑکی بھی شامل ہو گئی تھی۔

ماجدہ کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ میمونہ دس دن سے یہاں تھی، فردوسی ایک ہفتے سے تھی اور وہ خود گزشتہ شب یہاں آئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں سے رہائی کے کوئی آثار نہیں تھے۔

یہ لوگ ان تینوں کے ساتھ معلوم نہیں کیا کرنا چاہتے تھے۔ آگے تو اندھیروں کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

رات گزر چکی تھی، دو تہائی کے قریب دن گزر چکا تھا..... اور یہ سارا وقت تھا جو ماجدہ نے اپنی زندگی میں پہلی بار اپنے گھر والوں کے بغیر گزارا تھا..... اور یہ سارا وقت وہ تھا جو اس کے گھر والوں نے اور ہاشم نے اس کے بغیر ایک مکمل بے خبری کے عالم میں گزارا ہو گا..... ہائے..... ہاشم کا کیا حال ہو گا۔ وہ نہ جانے کس وقت کھلنا سے مادھوپور واپس آیا ہو گا، اکیلا، تنہا، تباہ شدہ، برباد حالت میں..... اس نے اماں اور بابا کو اس کے بارے میں کیا بتایا ہو گا..... قیامت کی وہ رات کس طرح گزری ہو گی..... اور قیامت کا یہ دن کس طرح گزر رہا ہو گا۔

گزشتہ روز ہاشم کے ساتھ دیکھی ہوئی فلم کا آخری سین بار بار رنگ بدل بدل کر اس کی نظروں کے سامنے ابھرتا تھا۔ دیوداس اور پاروتی آسمان سے ٹوٹے ہوئے ستاروں کی طرح ایک دوسرے سے بچھڑ کر نہ جانے کہاں گم ہو گئے تھے۔ دیوداس نے پارو کے شوہر کی حویلی کے باہر جان دے دی تھی اور پارو کو اس کی لاش دیکھنے تک کا موقع نہیں ملا تھا..... تو پھر پارو کا کیا ہوا تھا؟ پارو کا کیا ہوا تھا؟ پارو کا کیا ہو گا.....؟ ماجدہ ایک دم سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔ ہاشم دیوداس کی شکل میں اس کی نظروں کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا اور وہ خود پارو کی طرح ایک بند مکان میں اِدھر سے اُدھر دیوانہ وار بھاگ رہی تھی اور باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔

ماجدہ کے رونے پر کسی نے اس کو تسلی دینے کی کوشش نہیں کی۔ وہاں تسلی دینے والا کوئی نہیں تھا، جو دونوں لڑکیاں وہاں موجود تھیں، وہ اسی کی طرح اندوہناک حالات کا شکار تھیں۔

دونوں لڑکیوں نے ماجدہ کو بتایا کہ انہوں نے یہاں سے بھاگنے کے تمام امکانات کا جائزہ لیا تھا لیکن انہیں بند کرنے والوں نے ایسا کوئی امکان کھلا نہیں چھوڑا تھا۔

دن ڈھل گیا۔ شام ہو گئی۔ تینوں لڑکیوں نے دوپہر کا کھانا کھا لیا تھا۔ ماجدہ کے حلق سے تو نوالہ بھی نہیں اُتر رہا تھا لیکن میمونہ اور فردوسی کے اصرار پر اس نے تھوڑا بہت کھا لیا۔

''ہمیں زندہ رہنا ہے ماجدہ۔'' فردوسی نے اس سے کہا۔ ''آگے نہ جانے کیا حالات پیش آئیں ہم کچھ نہیں جانتے لیکن ہمیں اپنے آپ کو کمزور نہیں کرنا چاہیے۔ یہ لوگ ہمیں کھانے کو تو دے رہے ہیں، تو پھر ہمیں اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے ٹھیک سے کھانا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چاہیے..... کیا معلوم، کب ہمیں کوئی موقع مل جائے..... تب ہمیں طاقت کی ضرورت ہوگی۔''

فردوسی کی بات ماجدہ کی سمجھ میں پوری طرح آ گئی لیکن اس کا جی کچھ بھی کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ ''کیا ہاشم کا جی کچھ کھانے کو چاہ رہا ہوگا؟'' اس کے دماغ میں بار بار سوال اٹھ رہا تھا۔ ''کیا اماں اور بابا کا دل کچھ کھانے کو چاہ رہا ہوگا؟''

شام ہوگئی۔ اب ذرا دیر میں اندھیرا ہونے والا تھا۔ اسی وقت دروازے پر ایک بار پھر آہٹ سنائی دی اور پھر دروازہ کھل گیا۔ اندر آنے والے امینہ اور شاہ میاں تھے۔ فرید اس وقت ان کے ساتھ نہیں تھا۔ انہوں نے گھر کے اندر داخل ہوتے ہی دروازے کو اندر سے بند کر کے اس میں تالا لگا دیا۔ چابی شاہ میاں نے اپنی جیب میں رکھ لی۔ ماجدہ کو اب یاد آیا کہ صبح کو بھی اس نے دروازے میں اندر سے تالا لگا ہوا دیکھا تھا۔ اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ کوئی لڑکی موقع پا کر دروازہ کھول کر باہر نکل جائے۔

''چلو، کھانا کھا لو۔'' امینہ نے لڑکیوں کو حکم دیا اور باورچی خانے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ تینوں آہستہ آہستہ باورچی خانے کی طرف چل پڑیں۔ امینہ ان کے سر پر سوار تھی۔ دوپہر کا بچا ہوا کھانا موجود تھا۔ امینہ کے حکم پر چولہا جلا کر اسے گرم کیا گیا اور پھر ان تینوں لڑکیوں نے سر جھکا کر خاموشی سے کھانا کھا لیا۔

کچھ دیر کے بعد انہیں کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ عورت نے اپنے ہاتھ سے لالٹین جلائی۔ اب خاصا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ کمرے میں روشنی کی ضرورت تھی لیکن امینہ نے لالٹین کی لو اتنی دھیمی رکھی تھی کہ اجالا تقریباً نہ ہونے کے برابر تھا۔

''بس اب آرام کرو۔'' امینہ نے لڑکیوں سے کہا۔ شاہ میاں بھی وہیں کمرے میں آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''ہمیں..... ہمیں گھر جانے دو امینہ چاچی۔'' ماجدہ نے ایک بار پھر رقت آمیز لہجے میں امینہ سے التجا کی۔ ''ہمارے گھر والے ہمارے لیے بہت پریشان ہوں گے۔''

''مگر تم زندہ تو ہو۔'' امینہ نے عجیب و غریب جواب دیا۔ ''تمہارے گھر والے چاہے یہ بات جانیں یا نہ جانیں، مگر تم زندہ تو ہو..... گھر والوں سے ملنے کا وقت بھی آ جائے گا، ابھی صبر کرو.....''

اس کے بعد امینہ اور شاہ میاں کمرے سے باہر نکل گئے۔ دروازے کو باہر سے بند کر دیا گیا۔

قید خانے میں ماجدہ کی دوسری رات شروع ہو چکی تھی اور گزشتہ رات کا کچھ حصہ اور ایک پورا دن یہاں گزارنے کے بعد وہ کسی حد تک اس فضا سے مانوس ہو گئی تھی۔ دل کچھ ٹھہر سا گیا تھا۔ اتنا تو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اور دوسری دونوں لڑکیاں کچھ نامعلوم لوگوں کی قید میں ہیں۔

تینوں بہت دیر تک باتیں کرتی رہیں اور اپنے اپنے حالات سے ایک دوسرے کو واقف کراتی رہیں، بیچ بیچ میں سسکیوں اور ہچکیوں کی آوازیں بھی گونجتی رہیں۔

''ہاشم کے لیے بے خبری کی دوسری رات شروع ہو چکی ہے۔'' ماجدہ کے کلیجے میں ہوک اٹھی۔ ''اور خدا جانے، بے خبری کی ایسی اور کتنی راتیں اس کی اور میری قسمت میں اور ہمارے گھر والوں کی قسمت میں لکھی ہیں۔''

وہ رات بھی کسی نہ کسی طرح گزر گئی۔ ماجدہ کو نیند بھی آ گئی تھی اور صبح کو جب وہ سو کر اٹھی تو اس کو اس بات پر قدرے حیرت ہو رہی تھی کہ وقت بھی کتنی عجیب چیز ہے کہ بس گزرے چلا جاتا ہے، اس بات سے بالکل بے خبر، بے پروا اور بے نیاز، کہ لوگوں کے ساتھ کیا کچھ ہو رہا ہے اور کیسے کیسے ہولناک صدمے انسانوں کو کھائے جا رہے ہیں۔ اس نو سالہ بچی کو اپنی زندگی کے سب سے پہلے شدید صدمے سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا اور وہ ایک خوفناک تجربے کی آگ میں جل رہی تھی۔

تین دن مزید گزر گئے، صورتِ حال میں کوئی تبدیلی رُونما نہیں ہوئی۔ روزانہ کا تقریباً وہی معمول تھا۔ امینہ اور اس کے دونوں ساتھی کچھ بھی بتانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ تینوں لڑکیاں اپنی روحوں کے گہرے زخموں کے ساتھ اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کو خاکستر ہوتا ہوا دیکھ رہی تھیں۔

چوتھے روز بھی سب کچھ معمول کے مطابق ہی رہا اور شام کے وقت امینہ کے ساتھ فرید آ گیا۔ لڑکیوں کو کھانا کھلانے کے بعد روز کی طرح کمرے میں بند کر دیا گیا۔ وہ تینوں بہت دیر تک جاگتی اور باتیں کرتی رہیں اور پھر سو گئیں۔

رات کا نہ جانے کون سا وقت تھا جب آوازیں سن کر ماجدہ کی آنکھ کھل گئی۔

کمرے میں لالٹین کی لَو اونچی کر دی گئی تھی۔ جس کی وجہ سے روشنی ذرا تیز ہو گئی تھی۔ امینہ کمرے میں موجود تھی۔ میمونہ جاگ چکی تھی اور امینہ فردوسی کو جگا رہی تھی۔ فردوسی سے پہلے ہی ماجدہ جاگ چکی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''چلو، جلدی سے ہوشیار ہو جاؤ، شاباش۔'' امینہ ان تینوں سے تحکمانہ انداز میں کہہ رہی تھی۔ ''اٹھ جاؤ..... ہمیں یہاں سے چلنا ہے۔''

''کہاں؟'' ماجدہ کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ ''ہمیں کہاں جانا ہے؟''

''خدا کی زمین بہت وسیع ہے۔'' امینہ نے گول مول سی بات کی۔ ''آدمی وہیں جا کر رہتا بستا ہے جہاں اسے سب سے زیادہ آرام ملے۔ ہم بھی وہیں چلیں گے جہاں ہم سب سے زیادہ خوش رہیں گے۔''

''میں سب سے زیادہ خوش اپنے ماں باپ کے گھر میں رہوں گی۔'' ماجدہ نے فوراً کہا۔ ''مجھے میرے گھر پہنچا دو.....''

''اور مجھے بھی.....''

''اور مجھے بھی.....'' میمونہ اور فردوسی نے باری باری کہا۔

''گھر بھی پہنچا دیں گے، گھر بھی پہنچا دیں گے۔'' امینہ نے وہی گھسا پٹا جواب دیا اور لڑکیوں کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آئی۔

باہر برآمدے میں شاہ میاں اور فرید موجود تھے۔ شاہ میاں کے ہاتھ میں ایک گن تھی اور فرید کے ہاتھ میں ایک بھاری سی لاٹھی۔ ماجدہ نے ان دونوں کو کبھی اس طرح مسلح حالت میں نہیں دیکھا تھا۔

''ڈرو مت۔'' شاہ میاں نے مسکراتے ہوئے ان لوگوں سے کہا۔ ''یہ تمہارے لیے نہیں ہے۔'' اس نے گن کو اِدھر اُدھر لہرایا۔ ''یہ تم لوگوں کو نقصان پہنچانے کے لیے نہیں بلکہ تمہاری حفاظت کرنے کے لیے ہے، لیکن اگر تم نے کوئی بے وقوفی کی حرکت کی تو بُری طرح ماری جاؤ گی۔''

کسی لڑکی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

ماجدہ بہت زیادہ سہمی ہوئی تھی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اب کوئی اور نیا عذاب ان لوگوں پر مسلط ہونے والا تھا۔ رات کے گہرے سناٹے میں ان کو اس پُراسرار مکان سے نکال کر کہیں اور لے جایا جا رہا تھا۔

تینوں لڑکیوں کے پاس سامان نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ میمونہ کو اسکول سے واپسی کے وقت اغوا کیا گیا تھا اور اس کے پاس اسکول کا بستہ تھا، لیکن یہاں آ کر ہوش سنبھالنے کے بعد اس نے اپنے بستے کو ایک بار بھی نہیں دیکھا تھا۔ خدا جانے ان لوگوں نے اسے کہاں پھینک

دیا تھا۔ فردوسی اور ماجدہ کے پاس تو کوئی سامان تھا ہی نہیں.....

وہ سب لوگ مکان سے باہر آ گئے۔ چاندنی رات تھی۔ فضا میں میٹھی میٹھی سی خنکی گھلی ہوئی تھی۔ گھر کے دروازے کے سامنے ایک بیل گاڑی کھڑی ہوئی تھی، جس میں آگے کی جانب ایک لالٹین لٹک رہی تھی۔ گاڑی بان کی شکل صاف نظر نہیں آ رہی تھی، کیونکہ وہ منہ پر ڈھاٹا باندھے ہوئے تھا۔

''گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔'' امینہ نے لڑکیوں کو حکم دیا۔ تینوں سہمی ہوئی حد درجہ خوفزدہ لڑکیاں پیچھے کی جانب سے بیل گاڑی میں سوار ہو گئیں۔ ان کے بعد وہ تینوں بھی گاڑی میں سوار ہو گئے اور اس طرح بیٹھے کہ انہوں نے تینوں لڑکیوں کو اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ ان سب لوگوں کے بیٹھتے ہی بیل گاڑی وہاں سے روانہ ہو گئی۔

ماجدہ نے پہلی بار اس گھر کو باہر سے دیکھا۔ کم روشنی کے باعث وہ اس کو زیادہ ٹھیک سے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ایک چھوٹا سا مکان تھا لیکن اس کی دیواریں کافی اونچی تھیں۔ اس کے آس پاس درخت ہی درخت تھے۔ اس مکان کو شاید بستی سے دور، جنگل کے قریب تعمیر کیا گیا تھا لیکن شاید اس میں کوئی رہتا نہیں تھا، کیونکہ اب یہ خالی تھا۔

''اب کیا ہو گا؟'' ماجدہ کے دل و دماغ پر ہتھوڑے برس رہے تھے..... اب تک جو کچھ بھی ہو چکا تھا، وہ نامعلوم تھا اور اب جو کچھ ہونے جا رہا تھا، وہ بھی نامعلوم تھا۔ سب کچھ بے خبری کی گرفت میں تھا۔

☆======☆======☆

بیل گاڑی وہاں سے روانہ ہوئی تو ماجدہ نے اس مکان پر آخری نظر ڈالی جو رات کی تاریکی میں خاموشی سے سر اٹھائے ہوئے کھڑا تھا۔ اس اجنبی اور نامہربان مکان سے اسے کوئی انسیت نہیں تھی، کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ یہ اس کے لیے قید خانہ تھا جہاں اس نے حالتِ اسیری میں چند روز گزارے تھے اور اب یہ قید خانہ اس سے چھوٹ رہا تھا۔ اب شاید اسے کسی دوسرے قید خانے میں پہنچا دیا جائے گا۔ وہ قید خانہ کہاں ہو گا اور وہاں اس پر کیا بیتے گی؟

ماجدہ کے ذہن میں بہت سے سوالات گڈمڈ ہو رہے تھے۔ وہ گہری نیند سے بیدار ہوئی تھی اور اس کا دماغ ابھی تک پورے طور سے حاضر نہیں تھا۔ اس اچانک تبدیلی کو پوری طرح سمجھنے میں اسے کچھ وقت لگ رہا تھا۔

گاڑی میں چونکہ ان تینوں لڑکیوں کے علاوہ ان کے اغوا کنندگان بھی موجود تھے، اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے وہ تینوں آپس میں کھل کر کوئی بات بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ رات کی نیم تاریکی میں وہ ایک دوسرے کی صورتیں بھی اچھی طرح نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ چاند کی ہلکی اور ٹھنڈی روشنی میں وہ ایک دوسرے کے دھندلے دھندلے خدوخال ہی دیکھ سکتی تھیں۔

بیل گاڑی میں بندھی ہوئی لالٹین سے نکلنے والی مریل سی روشنی ہی وہ واحد روشنی تھی جو اس ساری فضا میں موجود تھی۔

ماجدہ کو اس جگہ کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا جہاں وہ اب تک تھی اور نہ وہ اس جگہ کے بارے میں کچھ جانتی تھی جہاں اب اسے اور میمونہ اور فردوسی کو لے جایا جا رہا تھا۔ پہلے بھی اک عالم بے خبری تھا اور اب بھی ایک عالم بے خبری ہی تھا۔ بس یہ تھا کہ بے خبری کی فضائیں بدل گئی تھیں۔

ایک کچی لیکن قدرے ہموار سڑک تھی جس پر بیل اچھی خاصی رفتار سے چلے جا رہے تھے۔ دور دور تک کسی اور وجود کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ چاروں طرف گہرا اور گاڑھا سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ کچی سڑک کے دونوں جانب گھنے درختوں کی قطاریں تھیں جو رات کی نیم تاریکی میں کسی پُراسرار زندہ مخلوق کی طرح معلوم ہو رہے تھے، کیونکہ وہ زندہ تھے متحرک تھے، ہوا ان شاخوں سے سرگوشیاں کر رہی تھی اور یہ شاخیں ہل ہل کر اپنے زندہ وجود کا احساس دلا رہی تھیں۔

اگرچہ اغوا کنندگان سے کچھ پوچھنا بے کار تھا، کیونکہ معلوم تھا کہ وہ کچھ نہیں بتائیں گے، پھر بھی ماجدہ نے بڑی ہمت کر کے امینہ سے پوچھا۔

''چاچی! اب آپ ہمیں کہاں لے جا رہی ہیں؟''

''اور کیوں لے جا رہی ہیں؟'' ماجدہ کی پیش قدمی سے حوصلہ پا کر میمونہ نے جلدی سے اس کے سوال میں ایک اور حصے کا اضافہ کر دیا۔ اس نے امینہ کے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔

''کیوں پریشان ہوتی ہو؟'' امینہ آہستہ سے ہنسی۔ ماجدہ نے دیکھا کہ نیم تاریکی میں امینہ کا چہرہ اس کی اس پُراسرار ہنسی کے باعث کچھ اور بھی زیادہ کریہہ ہو گیا تھا۔

''جہاں بھی تم کو لے جائیں گے، وہاں تم آرام سے ہی رہو گی۔'' امینہ نے مکاری سے کہا۔ ''تم یہاں تھیں تو تمہیں کیا تکلیف تھی؟ کیا تمہیں کھانے کو نہیں ملتا تھا؟''

ماجدہ اور میمونہ نے اس کے آگے اور کچھ نہ کہا۔ ماجدہ نے اپنے دل میں امینہ کے لیے

اٹھتی ہوئی نفرت کی زبردست لہر کو پھیلتے ہوئے محسوس کیا۔

ان تینوں کو یہ بھی علم نہیں تھا کہ وہ رات کا کون سا وقت ہے۔ گہرا سناٹا تو صرف یہی بتا سکتا تھا کہ کافی رات گزر چکی ہے۔

اچانک سڑک کے کنارے کسی درخت میں بڑے زور کی پھڑپھڑاہٹ ہوئی اور کسی اُلو کی کریہہ چیخ فضا میں دور تک گونجتی اور تیرتی چلی گئی۔ اُلو درخت سے اڑ کر نیم تاریک فضا میں کہیں تیرتا چلا گیا تھا۔ ماجدہ ایک دم سنبھل کر بیٹھ گئی۔ فضا میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی تھی۔

اسی وقت گاڑی نے سیدھی سڑک چھوڑ کر دائیں جانب مڑتے ہوئے ایک دوسرا کچا راستہ اختیار کر لیا جو پہلے راستے کے مقابلے میں زیادہ پتلا تھا۔ اس موڑ کو کاٹنے کے ذرا سی دیر بعد ماجدہ کو اپنے سامنے فاصلے پر کوئی چیز چمکتی ہوئی نظر آئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بڑی سی چمکیلی چادر نیم تاریکی میں ہچکولے لے رہی ہو۔ ماجدہ کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ لوگ کسی ندی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

اُلو کی چیخ نے میمونہ اور فردوسی کو بھی ہوشیار کر دیا تھا اور وہ دونوں بھی سنبھل کر بیٹھ گئی تھیں۔

گاڑی ابھی ندی سے کافی فاصلے پر تھی کہ آسمان کا رنگ بدلنا شروع ہو گیا۔ گہری سیاہ رنگت میں، جس میں اَن گنت چمکیلے ستارے جڑے ہوئے تھے، کچھ تھرتھراہٹ سی شروع ہو گئی، جیسے کوئی چیز اس سیاہ رنگت کے پیچھے سے باہر آنے کے لیے زور کر رہی ہو۔

رات دم توڑ رہی تھی۔ صبح کے طلوع ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی۔

ذرا دیر بعد ان کے سامنے دور تک پھیلی ہوئی ندی کا ایک منظر تھا۔ ندی کے کنارے بے شمار درخت تھے، جنہوں نے جگہ جگہ سے ندی کو نظروں سے چھپا رکھا تھا اور سیاہ دھبے سے بکھرے ہوئے لگ رہے تھے۔

ہزارہا چڑیوں کی چہکار سے فضا گونجنے لگی تھی اور رفتہ رفتہ شور اتنا بڑھ گیا کہ لگتا تھا زمین سے آسمان تک چڑیوں کے اس شور کے علاوہ اور کچھ باقی نہیں بچا ہے۔

صبح کی ملگجی روشنی میں ندی کا ساحل اب قدرے صاف دکھائی دینے لگا تھا۔ بیل گاڑی تیزی سے ساحل کی طرف بڑھ رہی تھی اور پھر وہ ساحل کے بالکل قریب پہنچ کر رک گئی۔

ندی میں دور دور تک بہتی ہوئی کشتیاں نظر آ رہی تھیں جو صبح کی ہلکی ہلکی دھند میں بہت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہی روح پرور منظر پیش کر رہی تھیں، لیکن کوئی منظر روح پرور اسی شخص کے لیے ہوتا ہے جس کی روح میں تازگی اور مسرت کی کچھ رمق پہلے سے موجود ہو۔ بجھی ہوئی غمزدہ روحوں کے لیے تو انتہائی خوشنما مناظر بھی یاس کی کیفیت میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔

ندی کا دوسرا کنارہ بھی یہاں سے نظر آنے لگا تھا لیکن وہ صبح کی گہری دھند میں لپٹا ہوا تھا۔

بیل گاڑی ندی کے کنارے جس جگہ رکی وہاں کوئی گھاٹ نہیں تھا۔ ایک بڑی سی کشتی کے علاوہ وہاں اور کوئی چھوٹی یا بڑی کشتی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ جو کشتیاں ندی میں تھیں، وہ اس جگہ سے بہت دور تھیں۔

یہ ایک کافی بڑی کشتی تھی جو ندی کے کنارے کچھ اس طرح کھڑی ہوئی تھی کہ اس کا خاصا بڑا حصہ ندی کے کنارے اُگے ہوئے گھنے سرکنڈوں اور جھاڑیوں میں چھپ گیا تھا اور اسے پورے طور پر دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ قریب پہنچنے پر معلوم ہوا کہ اس کشتی میں بہت سارے لوگ سوار تھے۔

امینہ اور دونوں آدمی بیل گاڑی میں سے اتر گئے اور امینہ نے تینوں لڑکیوں کو بھی گاڑی میں سے اتار لیا۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' امینہ نے تینوں لڑکیوں سے کہا اور انہیں لے کر ایک طرف کو چل پڑی۔ دونوں مسلح مرد ان سے کچھ فاصلے پر تھے۔

امینہ ان کو لے کر کچھ دور پر ساحل کے ایک بالکل ویران حصے میں پہنچی جہاں گھنی جھاڑیاں اور درخت تھے۔

''یہاں ندی کے کنارے ہاتھ منہ دھولو۔'' اس نے لڑکیوں سے کہا۔ ''ہم بس اب یہاں سے روانہ ہونے والے ہیں۔''

لڑکیوں کے پاس اس کے حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا، فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ امینہ کچھ فاصلے پر سر پر موجود تھی اور دونوں مسلح مرد بھی زیادہ دور نہیں تھے۔

ماجدہ کے دل میں ایک لمحے کے لیے یہ خیال آیا کہ وہ ایک زقند بھرے اور یہاں سے بھاگ کھڑی ہو لیکن وہ ایسا کرنے کی ہمت اپنے اندر پیدا نہیں کر سکی۔ یہ بالکل اجنبی اور نامانوس علاقہ تھا۔ معلوم نہیں کون سی جگہ تھی اور یہاں سے بھاگ کر پناہ لینے کے لیے کوئی ٹھکانہ موجود بھی تھا یا نہیں۔ امینہ اور دونوں مرد زیادہ دور نہیں تھے۔ بھاگنے کی کوشش اگر ناکام

ہوئی تو وہ خدا جانے اس کا کیا حشر کریں گے۔ وہ اپنی خواہش کے باوجود خود کو وہاں سے بھاگنے پر آمادہ نہ کر سکی۔

کچھ دیر کے بعد ان تینوں کو اس بڑی سی کشتی کی طرف لے جایا گیا جو وہاں پہلے سے موجود تھی اور جس میں بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔

امینہ ان تینوں کو لے کر کشتی کے اندر داخل ہوئی۔ دونوں مرد اس کے پیچھے پیچھے تھے۔

ماجدہ نے دیکھا کہ اس کشتی میں اچھے خاصے لوگ موجود تھے، جن میں کچھ عورتیں بھی شامل تھیں لیکن کسی بھی عورت کے ساتھ کوئی بچہ نہیں تھا۔

ماجدہ بڑے غور سے ان لوگوں کا جائزہ لے رہی تھی جو کشتی میں موجود تھے اور ان کے بارے میں جاننے کی خواہش مند تھی کہ وہ کون تھے۔

اس نے اس سارے منظر نامے کا بڑی توجہ کے ساتھ مشاہدہ کیا۔ کشتی میں کوئی مسلح افراد یا پہرے دار قسم کے کوئی لوگ موجود نہیں تھے۔ کشتی کے جو مسافر تھے، وہ خوفزدہ یا سہمے ہوئے نہیں لگ رہے تھے بلکہ ان کے چہروں پر ایک قسم کی طمانیت کی جھلک دیکھی جا سکتی تھی۔ ایک بات ماجدہ نے اور بھی محسوس کی اور یہ کہ کشتی میں جتنے بھی لوگ تھے ان میں کوئی بھی بوڑھا شامل نہیں تھا۔ یہ سب جوان العمر لوگ تھے، خواہ مرد ہوں یا عورتیں، ان میں سے کوئی بھی بوڑھا نہیں تھا۔ بعض تو خاصے کم عمر لڑکے تھے اور باقی لوگوں میں تیس پینتیس سال سے زیادہ کسی کی عمر نہیں معلوم ہوتی تھی۔

کشتی میں موجود ان لوگوں نے نئے آنے والوں کی طرف توجہ اور دلچسپی کے ساتھ دیکھا اور ایسا لگا جیسے کچھ لوگ ان سے بات چیت کرنا چاہتے ہوں، لیکن امینہ اور دونوں مردوں نے کسی کو بھی لڑکیوں کے قریب نہیں آنے دیا اور جلدی جلدی چلتے ہوئے تینوں لڑکیوں کو کشتی کے ایک الگ تھلگ حصے میں لے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان لوگوں کے لیے یہ جگہ پہلے سے مخصوص کر دی گئی ہو۔ وہ سب لوگ اس الگ تھلگ جگہ میں بیٹھ گئے۔

ایک عورت کچھ فاصلے سے اپنی جگہ سے اٹھ کر تیزی سے ان لوگوں کے پاس آئی۔ وہ گندمی رنگت والی ایک نوجوان عورت تھی اور اس کا نقشہ بہت سبک تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی نرم اور دلآویز مسکراہٹ رقصاں تھی۔ ماجدہ کو وہ عورت بہت اچھی لگی۔ وہ ان لڑکیوں کے پاس آ کر کچھ بات کرنے ہی والی تھی کہ پیچھے سے ایک آدمی تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا آیا اور بڑے ہی ناگوار اور تلخ لہجے میں اس عورت سے مخاطب ہوا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''آخر تم اپنے کام سے کام کیوں نہیں رکھتیں؟'' اس نے چلا کر کہا۔ ''کیا سب لوگوں سے ان کے بارے میں رپورٹ لینا ضروری ہے؟''

''میں..... میں تو..... میں تو بس ان لڑکیوں سے ان کے اور ان کے گھر والوں کے بارے میں.....''

''جاؤ اور خاموشی سے اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ۔'' آدمی نے غصے سے کہا۔ ''اور اگر یہی سب کچھ کرنا ہے تو تم اب بھی واپس جا سکتی ہو۔''

''نہیں نہیں۔'' عورت نے سخت خوفزدہ ہو کر کہا اور تیزی سے وہاں سے پلٹ گئی۔ کچھ دور جا کر وہ کشتی میں اس جگہ بیٹھ گئی جہاں سے اٹھ کر وہ آئی تھی۔

ماجدہ کی سمجھ میں یہ معاملہ بالکل نہیں آیا۔ تاہم، ایک بات اس کی سمجھ میں صاف طور پر آ گئی اور وہ یہ کہ اس کشتی میں سوار لوگوں کو ان کی مرضی کے خلاف یہاں نہیں لایا گیا تھا۔

جس آدمی نے عورت کو ڈانٹ کر بھگایا تھا، وہ ذرا دیر کے بعد ان لوگوں کے پاس آ گیا۔ اس نے ان تینوں لڑکیوں کو غور سے دیکھا اور پھر امینہ کو ایک طرف لے جا کر اس سے سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگا۔ شاہ میاں بھی ان لوگوں کے پاس آ گیا اور اب وہ تینوں چپکے چپکے کچھ باتیں کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ آدمی وہاں سے چلا گیا۔ ماجدہ نے اس کی شکل و صورت بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے ذہن میں بٹھالی۔

ملاحوں نے پتواریں سنبھالیں اور کشتی کی وہاں سے روانگی کے آثار دکھائی دینے لگے۔ تب فرید اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے امینہ اور شاہ میاں سے ہلکی آواز میں کچھ رخصتی کلمات کا تبادلہ کیا، جنہیں ماجدہ دور ہونے کی وجہ سے صاف طور پر نہیں سن سکی۔ اس کے بعد وہ کشتی میں سے باہر نکل گیا۔ ماجدہ اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ وہ بیل گاڑی کے پاس پہنچا جو ساحل پر اسی طرح کھڑی ہوئی تھی۔ فرید بیل گاڑی میں سوار ہو گیا اور بیل گاڑی چل پڑی۔

ادھر کشتی نے بھی حرکت کرنی شروع کر دی تھی۔ اس نے ندی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ کنارے کے قریب چلنا شروع کر دیا اور پھر جیسے جیسے وہ آگے بڑھتی گئی ویسے ویسے اس کے اور ساحل کے درمیان فاصلہ کچھ بڑھتا گیا، لیکن کشتی ساحل سے بہت زیادہ دور نہیں تھی۔

ماجدہ دیکھ رہی تھی کہ یہ کسی نامعلوم ساحل کا بالکل ہی اجاڑ اور ویران ٹکڑا تھا۔ یہاں ساحل پر کوئی گھاٹ بنا ہوا نہیں تھا۔ کشتیوں کے لنگر انداز ہونے کے لیے کوئی مقررہ اور پُر سہولت جگہ نہیں تھی۔ لوگوں کے نہانے کے لیے بھی کوئی مخصوص جگہ بنی ہوئی نہیں تھی۔ ساحل

کی پٹی بہت کٹی پھٹی، ناہموار اور اونچی نیچی تھی اور اس کا سلسلہ بہت دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس ناقابلِ استعمال ساحل پر کوئی ناؤ یا مسافر نہیں آتے تھے۔ ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ صبح کا اجالا پوری طرح سے پھیل جانے کے بعد اب چڑیوں کی چہچہاہٹ بھی بند ہو گئی تھی مگر آسمان ابھی تک نارنجی تھا اور اس کا لمحہ بہ لمحہ ہلکا پڑتا ہوا نارنجی رنگ ندی کے پانی میں گھلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

امینہ اور شاہ میاں تینوں لڑکیوں کو اپنی تحویل میں لیے ہوئے کشتی کے باقی تمام مسافروں سے الگ تھلگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ندی میں ان کی کشتی کے علاوہ اور بھی کشتیاں چل رہی تھیں، لیکن وہ ان کی کشتی سے دور تھیں۔

ذرا دیر بعد کشتی میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو ناشتہ تقسیم کیا جانے لگا۔ اب دھوپ اچھی طرح نکل آئی تھی اور ندی کا پانی ہلکے مٹیالے رنگ کے ایک آئینے کی طرح چمک رہا تھا۔ لہریں ہچکولے لیتی تھیں تو پورا آئینہ لرزتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

وہی آدمی، جس نے ان لوگوں کے پاس آنے والی عورت کو ڈانٹ کر بھگایا تھا ان کے پاس بھی ناشتہ لے کر آیا۔ دو بڑے بڑے گول بسکٹ تھے جو ہر شخص کو دیئے جا رہے تھے۔

''لو، کھا لو۔'' اس شخص نے پہلی بار ان تینوں سے بیک وقت مخاطب ہوتے ہوئے انہیں بسکٹ دے کر کہا۔ اس کے چہرے پر کچھ نرمی کے آثار تھے۔ وہ ان تینوں کو ایک بار پھر بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

تینوں لڑکیوں نے بسکٹ لے لیے اور خاموشی سے انہیں کھانے لگیں۔ شاہ میاں اور امینہ کو بھی بسکٹ دیئے گئے اور دوسرے تمام لوگوں کی طرح وہ دونوں بھی بسکٹ کھانے میں مصروف ہو گئے۔

کشتی ساحل کے قریب ساحل کے ساتھ ساتھ بہتی چلی جا رہی تھی۔ مسافر آپس میں زور زور سے باتیں کر رہے تھے لیکن ان کی ملی جلی آوازوں کے شور میں کوئی بات واضح اور صاف طور سے سمجھ میں نہیں آتی تھی، لیکن کشتی کے جس حصے میں ان تینوں لڑکیوں کو امینہ اور شاہ میاں کے ساتھ بٹھایا گیا تھا، وہاں کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ تینوں لڑکیاں خاموش تھیں اور امینہ اور شاہ میاں بھی خاموش تھے۔ لڑکیوں کی موجودگی میں وہ ایک دوسرے سے زیادہ بات نہیں کر رہے تھے۔

کشتی کا خاصا تیز رفتار سفر تقریباً دوپہر تک جاری رہا۔ اب سورج ان لوگوں کے سروں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پر خوب تیزی سے چمک رہا تھا اور فضا میں گرمی گھلی ہوئی تھی۔ لوگوں کے جسموں سے پسینہ بہہ رہا تھا۔

کشتی ندی کے ایک ایسے ساحلی علاقے میں پہنچ کر رک گئی جو بالکل اجاڑ اور ویران نظر آ رہا تھا۔ یہاں کوئی باقاعدہ گھاٹ نہیں تھا بلکہ کشتی کو روکنے کی کوئی معقول سی جگہ بھی نہیں تھی۔ کنارے پر جا بجا اونچی اونچی چٹانیں تھیں اور بہت گھنا جنگل نظر آ رہا تھا۔ کوئی دوسری کشتی ان کی کشتی کے ساتھ اِدھر نہیں آئی تھی۔ ندی میں جو بھی کشتیاں تھیں، وہ ان کی کشتی سے بہت دور مختلف سمتوں میں رواں دواں تھیں۔

کشتی ایک ایسی جگہ رک گئی جہاں پانی کے اندر دور تک گھنی جھاڑیاں اور سرکنڈوں کے جھنڈ اُگے ہوئے تھے۔ کشتی نے ان کے درمیان میں سے اپنا راستہ بنایا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ملاح اس سارے علاقے سے، اس کے نشیب و فراز اور اسرار و رموز سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے مسافروں سے بھری ہوئی بھاری بھرکم کشتی کو سرکنڈوں اور جھاڑیوں میں پھنسنے نہیں دیا اور اسے آہستہ آہستہ دھکیلتے ہوئے اندر تک لے آئے۔ اب ندی کی طرف سے کشتی کو نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

کشتی کے رکتے ہی تمام مسافروں میں ایک ہلچل سی مچ گئی تھی۔ لوگ اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہو رہے تھے اور اترنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ شاید انہیں پہلے سے ہی بتا دیا گیا تھا کہ ان کی منزل آ گئی ہے۔

ماجدہ نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کشتی اور ساحل کے درمیان اچھا خاصا فاصلہ تھا۔ پانی میں سے گزرے بغیر خشکی پر نہیں پہنچا جا سکتا تھا۔

لوگوں نے کشتی میں سے اترنا شروع کر دیا۔ یہاں تقریباً پنڈلیوں تک پانی تھا۔ گھٹنوں سے ذرا نیچے تک لوگ اسی پانی میں اتر رہے تھے۔ وہ آدمی جس نے عورت کو ڈانٹا تھا اور لڑکیوں کو بسکٹ لا کر دیئے تھے چند دوسرے آدمیوں کے ساتھ مل کر لوگوں کو کشتی سے نیچے اترنے میں مدد دے رہا تھا۔

''اترتے جاؤ اور سامنے خشکی پر پہنچ جاؤ۔'' وہ لوگ مسافروں سے کہہ رہے تھے۔

مسافر اتر رہے تھے اور انہوں نے پانی میں اتر کر خشکی کی طرف چلنا شروع کر دیا تھا۔

کسی مسافر کے پیچھے کوئی مسلح شخص نہیں تھا۔ سب مسافر آزاد تھے اور کسی جبر اور زبردستی کے بغیر کشتی میں سے اتر اتر کر خشکی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کے پاؤں گھٹنوں سے ذرا

نیچے تک پانی میں تھے۔ کسی بھی مسافر کے پاس بہت زیادہ سامان نہیں تھا۔ زیادہ تر کے پاس بس ایک ایک بڑی سی گٹھری یا کینوس کا بڑا سا بیگ یا ہلکا سا سوٹ کیس تھا۔ بھاری سامان کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔ پانی سے گزرتے وقت یہ لوگ اپنے اپنے سامان کو احتیاط سے سنبھالے ہوئے تھے۔ بعض نے تو اپنا سامان سر پر رکھ لیا تھا۔

''آؤ، اب ہمیں بھی اترنا ہے۔'' امینہ نے لڑکیوں سے کہا۔ اس وقت تک کشتی کے زیادہ تر مسافر نیچے اتر چکے تھے۔ امینہ نے ماجدہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور شاہ میاں نے میمونہ اور فردوسی کے ہاتھ پکڑ لیے اور سہارا دے کر انہیں پانی میں اتار دیا۔ تینوں لڑکیاں تقریباً کمر تک پانی میں ڈوب گئیں لیکن انہیں پانی سے کوئی ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ پانی تو ان کی زندگی تھا اور وہ شب و روز پانی سے کھیلتی رہتی تھیں۔ تینوں لڑکیوں کو تیرنا بھی آتا تھا۔

وہ لوگ ساحل پر پہنچ گئے۔ فضا گرم تھی اور تیز ہوا چل رہی تھی۔ ان کے بھیگے ہوئے کپڑے جلد ہی خشک ہونا شروع ہو گئے۔

سب لوگ اتر کر خشکی پر جمع ہو گئے۔ عجیب سی جگہ تھی۔ عام طور سے جس جگہ کشتیاں آ کر رکتی ہیں، وہاں کچھ نہ کچھ آبادی ضرور ہوتی ہے۔ کشتیوں کے رکنے کے لیے اور لوگوں کے کشتیوں میں چڑھنے اترنے کے لیے گھاٹ موجود ہوتے ہیں، جہاں کچھ چھوٹی موٹی دکانیں وغیرہ بھی ہوتی ہیں، لیکن اس ویران ساحل پر ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ یہاں کوئی گھاٹ نہیں تھا، نہ کسی انسان کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔

سب لوگ ساحل پر جمع ہو گئے۔ امینہ ابھی تک ماجدہ کا اور شاہ میاں میمونہ اور فردوسی کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا۔ اسی وقت وہ آدمی ان لوگوں کے پاس آ گیا جس نے عورت کو ڈانٹا تھا۔

''تم لوگوں کو ڈرنے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے ایک نرم مسکراہٹ کے ساتھ لڑکیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ہم تمہیں کوئی تکلیف نہیں دیں گے۔''

''لیکن چاچا۔'' ماجدہ نے جلدی سے کہا۔ ''ہم لوگ اپنے گھر جانا چاہتے ہیں۔'' اس کی آواز بھرانے لگی۔ ''ہمیں ہمارے گھر جانے دیجیے..... چاچا..... ہمیں تو کچھ بھی نہیں معلوم کہ آپ لوگ ہمارے ساتھ کیا کرنے والے ہیں۔''

''میرا نام محمود ہے۔'' اس شخص نے کہا۔ ''لوگ مجھے ممدو کہتے ہیں۔ تم لوگ مجھے ممدو چاچا کہہ سکتی ہو۔ یقین رکھو، ہم تمہیں کوئی تکلیف نہیں دیں گے۔ جو کچھ کریں گے اس سے تم کو فائدہ ہی پہنچے گا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''مگر ہمیں کچھ بتایئے تو سہی ممدو چاچا۔'' فردوسی نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ ''آخر کچھ تو معلوم ہو کہ آپ لوگ ہمارے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہیں..... ہم لوگ تو اپنے اپنے گھر جانا چاہتے ہیں، ہمیں جانے دیجیے.....''

''ضرور جانے دیں گے۔'' ممدو نے مسکرا کر کہا۔ ''ضرور جانے دیں گے، مگر جلدی مت کرو، تسلی رکھو، تم لوگ اپنے گھر ضرور جاؤ گی۔''

عجیب سا رویہ تھا ان لوگوں کا..... ناقابلِ فہم..... اغوا کر کے اسیر کر لیا تھا۔ آزاد بھی نہیں کرتے تھے اور بتاتے بھی نہیں تھے کہ کیا کرنا چاہتے ہیں لیکن کوئی ظلم و تشدد بھی نہیں کر رہے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ابھی اس کا کوئی موقع بھی نہیں آیا تھا۔

سب لوگ مع اپنے ساز و سامان کے کشتی سے اتر کر آ چکے تھے اور انہیں ایک طرف اکٹھا کر دیا گیا تھا۔ ماجدہ نے ان لوگوں کی گنتی کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ ان کی تعداد پینتالیس تھی۔ تینوں لڑکیوں اور امینہ اور شاہ میاں کو ملا کر یہ کل تعداد پچاس ہو جاتی تھی۔

''چلو، اب آگے چلو۔'' ایک آدمی نے سب لوگوں سے کہا اور لوگ اپنا اپنا سامان سنبھالے ہوئے اس کی رہنمائی میں آگے روانہ ہو گئے۔ دو آدمی تھے جو سارے مسافروں کی رہنمائی کر رہے تھے۔ ممدو اب لڑکیوں کے پاس آ گیا تھا۔ لڑکیوں کو اس قافلے سے پیچھے رکھا گیا تھا اور امینہ اور شاہ میاں کے علاوہ اب ممدو بھی ان کی نگرانی کرنے والوں میں شامل ہو گیا تھا۔ ان تینوں نے ان لڑکیوں کو اپنے حلقے میں لے لیا تھا۔

قافلہ اپنے رہنما کی قیادت میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا، کوئی پگڈنڈی بھی نہیں تھی، چاروں طرف گھنا جنگل تھا اور اس میں سے راستہ بنا بنا کر یہ لوگ آگے بڑھ رہے تھے۔ اگر آس پاس کوئی بستی ہوتی تو کوئی پگڈنڈی بھی ضرور ہوتی لیکن کوئی پگڈنڈی نہیں تھی۔

تھوڑی دیر چلنے کے بعد یہ لوگ ایک چھپر کے پاس پہنچ گئے۔ ماجدہ کو غیر آباد جنگل میں یہ چھپر دیکھ کر بڑا تعجب ہوا۔ خدا جانے یہاں چھپر کا کیا کام تھا۔

چھپر کافی بڑا تھا اور اس کے نیچے بہت گنجائش تھی۔ سب لوگوں کو چھپر میں پہنچا دیا گیا جہاں فرش پر کچھ ٹاٹ بچھے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ تو آرام کی غرض سے فوراً ہی ٹاٹ پر لیٹ بھی گئے۔

''یہاں رک کر تھوڑی دیر آرام کر لو۔'' قافلے کے رہنما نے لوگوں سے کہا۔ جیسا کہ ماجدہ کو بعد میں معلوم ہوا اس شخص کا نام نورالدین تھا اور وہ نورو کہلاتا تھا۔ ''بس تھوڑی دیر کے

بعد ہم آگے روانہ ہو جائیں گے۔''

تینوں لڑکیوں کو بھی چھپر کے ایک کونے میں بٹھا دیا گیا۔ امینہ اور شاہ میاں ایک لمحے کے لیے بھی ان کی طرف سے غافل نہیں تھے اور اب تو ممدو بھی ان کے ساتھ شامل تھا۔

''بڑا خطرناک جنگل ہے یہ۔'' ممدو لڑکیوں کو بتانے لگا۔ ''جگہ جگہ شیر اور بھیڑیے موجود ہیں، اگر کوئی شخص اکیلا نظر آ جائے تو اس کی خیر نہیں۔ البتہ اگر بہت سے لوگ ایک ساتھ ہوں تو جنگلی جانور حملہ نہیں کرتے بلکہ ڈر کر بھاگ جاتے ہیں۔''

اس نے معنی خیز نظروں سے لڑکیوں کی طرف دیکھا جو اس کی بات سن کر لرز کر رہ گئی تھیں۔

ان لوگوں نے یہاں کچھ دیر قیام کیا۔ یہاں ایک طرف کئی گھڑونچیاں بنی ہوئی تھیں جن پر پانی سے بھرے ہوئے بڑے بڑے مٹکے اور گلاس رکھے ہوئے تھے، جس سے صاف طور پر یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس جگہ انسانوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہاں سب لوگوں کو کچھ خشک چیزیں کھانے کے لیے دی گئیں، جن میں بڑے بڑے گول بسکٹ بھی شامل تھے۔ پانی کی تو کوئی کمی نہیں تھی۔

ماجدہ چاہتی تھی کہ اسے کسی طرح سے اس قافلے کے کسی فرد سے بات کرنے کا موقع مل جائے تاکہ وہ یہ جان سکے کہ یہ سب لوگ کون ہیں، کہاں سے آ رہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں، لیکن امینہ اور شاہ میاں ان تینوں لڑکیوں کے سر پر سوار تھے اور انہیں اِدھر سے اُدھر ہلنے بھی نہیں دیتے تھے اور اب تو ممدو بھی ان کی نگرانی کرنے والوں میں شامل ہو گیا تھا۔ تینوں لڑکیوں کو قافلے کے باقی لوگوں سے بالکل الگ تھلگ رکھا جا رہا تھا۔ جس عورت نے لڑکیوں کے پاس آ کر ان سے بات کرنے کی کوشش کی تھی اور جسے ممدو نے ڈانٹ کر بھگا دیا تھا، اس نے کئی بار قریب سے گزرتے ہوئے ان لڑکیوں کو دلچسپی اور تجسس بھری نظروں سے دیکھا تھا لیکن ان سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ماجدہ نے بھی کئی بار اس کو غور سے دیکھا تھا۔ اس کا بہت جی چاہتا تھا کہ وہ اس عورت سے بات کرے جو ان لوگوں سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن ایسا ممکن نہیں ہو سکا۔

تقریباً آدھے پونے گھنٹے کے بعد قافلہ ایک بار پھر وہاں سے پیدل روانہ ہو گیا۔ تمام قافلے والے کسی پابندی کے بغیر آزادی کے ساتھ چل رہے تھے لیکن ان تینوں لڑکیوں کی کڑی نگرانی کی جا رہی تھی۔ امینہ، شاہ میاں اور ممدو بھوتوں کی طرح ان کے آگے پیچھے لگے ہوئے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس بار کا سفر آسان نہیں تھا، انہیں مسلسل پیدل چلنا پڑا، یہاں تک کہ سہ پہر ہوگئی اور سورج ڈھلنے لگا۔ ان کے چاروں طرف گھنا جنگل تھا اور اگر کوئی بستی یا گاؤں تھا بھی تو وہ انہیں گھنے جنگل میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہر طرف گہرا سناٹا اور ویرانی تھی۔

درختوں کے جھنڈ میں گھری ہوئی وہ چھوٹی سی عمارت اچانک ہی سامنے آ گئی تھی۔

قافلے کو اس عمارت سے کچھ فاصلے پر روک دیا گیا۔ نورو سب لوگوں کو روک کر اس عمارت کی طرف چلا گیا اور وہاں جا کر غائب ہوگیا۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ دوبارہ واپس آیا تو اکیلا نہیں تھا، اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا لیکن وہ عام لباس میں نہیں تھا، وہ وردی میں تھا۔ نورو اور وہ باوردی شخص آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے جنہیں قافلے والے سن نہیں سکتے تھے۔

تب نورو نے قافلے والوں کو حکم دیا کہ وہ قطاروں میں کھڑے ہو جائیں اور خود ان کے قریب آ کر ان کی قطاریں بنوانے لگا۔ اس نے سب لوگوں کی تین قطاریں بنائیں۔ لڑکیوں کو آخری قطار میں کھڑا کیا گیا۔

باوردی شخص نے نورو اور ممدو کے ساتھ مل کر سارے لوگوں کی گنتی کی اور پھر سر ہلاتا ہوا واپس عمارت کی طرف چلا گیا۔

''ایک آدمی بھی زیادہ ہو تو یہ لوگ فوراً ہی زیادہ رقم کا مطالبہ کر دیتے ہیں۔'' ماجدہ نے نورو کو بڑبڑاتے ہوئے سنا۔ وہ شاہ میاں سے مخاطب تھا۔ اس کے بعد وہ خود بھی اس عمارت کی طرف چلا گیا۔

''چلو، سب لوگ یہاں آرام سے بیٹھ جاؤ۔'' ذرا دیر کے بعد عمارت سے واپس آتے ہوئے نورو نے سب لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ہمیں کچھ انتظار کرنا ہوگا۔''

سب لوگ وہاں گھنے درختوں کے نیچے اطمینان سے بیٹھ گئے۔ ان میں سے کوئی بھی خوفزدہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ماجدہ یہ سارا ماجرا دیکھ رہی تھی۔ اس نے نورو کے الفاظ بھی سنے تھے لیکن وہ ان کا حقیقی مطلب نہیں سمجھ سکی تھی۔

دن ڈھل رہا تھا۔ شام کا جھٹپٹا پھیلنے لگا تھا کہ عمارت کی طرف سے وہی باوردی شخص دوبارہ آتا ہوا نظر آیا جو نورو کے ساتھ آیا تھا۔ نورو اس وقت اپنے قافلے والوں کے ساتھ ہی بیٹھا ہوا تھا۔ باوردی شخص کو آتا دیکھ کر وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور تیزی سے اس کی طرف بڑھنے لگا۔ دونوں ایک دوسرے کے قریب آ گئے اور ان میں کچھ گفتگو ہونے لگی۔

ماجدہ ان سے دور ہونے کے باعث ان کی گفتگو کو نہیں سن سکتی تھی لیکن وہ قافلے میں حرکت کی ایک تازہ لہر اٹھتے ہوئے ضرور دیکھ سکتی تھی۔

''چلو.....'' نورو نے بآواز بلند قافلے والوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''چلو.....روانگی کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

سب لوگ روانگی کے لیے فوراً ہی تیار ہو گئے۔ سب نے اپنا اپنا سامان سنبھال لیا اور نورو کی قیادت میں ایک اور سفر پر روانہ ہو گئے۔

''اب نہ جانے کیا ہوگا؟''

''اب کہاں جانا ہوگا ممدو چاچا؟'' اچانک اس نے ہمت کر کے ممدو سے پوچھ لیا۔

''بہت اچھی جگہ چلیں گے۔'' ممدو نے مختصر اور مبہم سا جواب دیا۔

ماجدہ کے دل میں اٹھنے والی غم کی لہریں اور بھی زیادہ شدت کے ساتھ اس کے سارے وجود میں پھیلنے لگیں۔ نہ جانے کیا ہو رہا تھا.....اور آگے نہ جانے کیا ہونے والا تھا۔

اس کی نظروں کے سامنے ہاشم کا غمزدہ چہرہ گھوم رہا تھا۔ جب سے وہ ہاشم سے جدا ہوئی تھی، تب سے اب تک وہ اس چہرے پر غم واندوہ کے کتنے مختلف رنگ دیکھ چکی تھی، وہ ہاشم کی بجھی بجھی آنکھوں کو دیکھ رہی تھی جن میں زمین و آسمان کی ساری ویرانیاں سمٹ آئی تھیں۔ ہاشم کی آنکھیں اب تک کتنا خون رو چکی ہوں گی اور ابھی کتنا خون اور روئیں گی.....اماں اور بابا پر کیا بیت چکی ہوگی.....کیا بیت رہی ہوگی۔ ان چند دنوں کے اندر اندر ان سب لوگوں کی زندگی میں کتنا کچھ بدل چکا ہوگا۔ وہ کیا سوچتے ہوں گے؟ ان کے دن رات کس طرح گزرتے ہوں گے؟ دن تو ایک ایک کر کے گزرتے ہی جا رہے تھے، لیکن اب آگے کیا ہوگا؟ وہ لوگ کیا کریں گے؟ وہ خود کیا کرے گی؟ کیا وہ کبھی اپنے عزیز پیاروں سے دوبارہ مل سکے گی؟ سوچتے سوچتے اس کا دماغ پھٹنے لگتا اور ناقابلِ برداشت درد کی تیز و تند لہریں لپکتی ہوئی بجلیوں کی طرح اس کو جلانے لگتیں۔ وہ نڈھال ہو جاتی، اس کی روح، اس کا دل، اس کا جسم سب کچھ نڈھال ہونے لگتا۔ اپنے گاؤں میں گزارا ہوا وہ آخری دن اس کی نگاہوں کے سامنے کسی گم شدہ جنت کی طرح ابھرنے لگتا۔ کیسی جھوم کے بارش ہوئی تھی اس دن.....وہ اور ہاشم کتنی دیر تک باغ کی اس کٹیا میں بیٹھے رہے تھے.....کتنی بہت سی باتیں کی تھیں.....کتنا اچھا لگا تھا.....سب کچھ کتنا اچھا تھا.....اور اسی دن تو ان دونوں نے اگلے دن کھلنا جا کر فلم دیکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ کاش.....کاش.....اس دن انہوں نے یہ فیصلہ نہ کیا ہوتا۔ کاش اس دن وہ لوگ کھانا نہ گئے ہوتے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کاش..... کاش..... کاش..... کتنے بہت سے کاش تھے جو ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک ''کاش'' بھی عملی صورت اختیار کر لیتا تو زندگی آج کتنی مختلف ہوتی۔

پیدل قافلہ آگے روانہ ہو گیا۔ تینوں لڑکیاں سب سے پیچھے تھیں اور امینہ، شاہ میاں اور ممدو ان کے ساتھ تھے۔ نورو قافلے کے آگے آگے چل رہا تھا اور باقی سارے لوگ اپنا اپنا سامان اٹھائے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔

وہ لوگ اس جگہ سے گزرے جہاں وہ چھوٹی سی عمارت واقع تھی جہاں سے وہ وردی والا آدمی نکل کر آیا تھا۔ وہی وردی والا مسلح آدمی ایک اور مسلح آدمی کے ساتھ چھوٹی سی عمارت کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ نورو نے ان دونوں کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور جواباً انہوں نے بھی ہاتھ ہلائے۔ قافلہ اس جگہ سے آگے بڑھتا گیا۔

تقریباً بالکل اندھیرا پھیل گیا تھا جب وہ ایک اور جگہ رکے۔ یہاں بھی ایک چھوٹی سی عمارت نظر آ رہی تھی، جس میں روشنی ہو رہی تھی۔ نورو اس چھوٹی سی عمارت کے دروازے میں داخل ہو کر اندر کہیں غائب ہو گیا۔ قافلہ عمارت سے کچھ فاصلے پر ٹھہرا رہا۔

ذرا دیر کے بعد نورو عمارت کے دروازے میں دوبارہ نظر آیا۔ وہ روشنی میں تھا اور اس کے ساتھ دو مسلح باوردی افراد تھے لیکن ان کی وردی اس مسلح شخص کی وردی سے مختلف تھی جو اس سے پہلے والی عمارت میں ملا تھا۔

دونوں مسلح افراد نورو کے ساتھ عمارت کے دروازے سے صرف ذرا سا آگے آئے اور انہوں نے وہیں سے نیم تاریکی میں کھڑے ہوئے قافلے پر نظریں دوڑائیں۔ پھر وہ نورو سے کچھ باتیں کرنے لگے۔

ذرا دیر بعد نورو وہاں سے تیزی سے چلتا ہوا قافلے کے پاس آیا اور اس نے سب لوگوں کو آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی قافلے میں حرکت نمودار ہوئی اور سب لوگ آگے بڑھنے لگے۔

''شکر ہے خدا کا۔'' امینہ نے آہستہ سے کہا۔ ''یہ مرحلہ بھی بخیر و خوبی طے ہو گیا۔''

''طے کیوں نہ ہوتا؟'' شاہ میاں نے ہلکی سی سرگوشی میں جواب دیا۔ ''آخر ان لوگوں کا بھی تو فائدہ ہے جبکہ نقصان ان کا کچھ بھی نہیں ہے۔''

ماجدہ کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں اور ان کا کیا مطلب ہے۔

اس کے قدم ذرا سست پڑنے لگے تھے کہ امینہ نے اس کو ٹہوکا دیا۔ ''جلدی جلدی.....

بیٹی..... جلدی جلدی.....'' امینہ کا لہجہ بہت نرم، مہربان تھا۔ ''رات سر پر آ رہی ہے ہمیں ابھی بہت دور جانا ہے۔''

''مگر ہم جا کہاں رہے ہیں چاچی؟'' ماجدہ نے اپنے قدم تیز کرتے ہوئے امینہ سے پوچھا۔ ''لوگ ہمیں کچھ بتاتے بھی نہیں۔''

''بہت اچھی جگہ لے جا رہے ہیں تمہیں۔'' امینہ نے اس طرح نرم لہجے میں کہا۔ ''خوش قسمت ہو تم لوگ کہ اتنی اچھی جگہ جا رہی ہو۔ کچھ دن وہاں رہو گی، کھیلو گی کودو گی، کھاؤ پیو گی، عیش کرو گی اور پھر تمہیں تمہارے والدین کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔ پھر اپنے گھروں میں رہنا۔''

''مگر میں تو ابھی اپنے گھر جانا چاہتی ہوں چاچی۔'' فردوسی نے تقریباً گلوگیر آواز میں کہا۔ ''آپ مجھے ابھی میرے گھر.....''

''ارے خاموش ہو جاؤ پاگل لڑکی۔'' شاہ میاں نے اسے ڈانٹا۔ ''تم کو کچھ پتہ نہیں ہے کہ ہم تمہارے لیے کیا کیا کر رہے ہیں۔ بس اب اپنی زبان بالکل بند رکھو۔''

فردوسی سہم کر خاموش ہو گئی۔ اس کے بعد کسی لڑکی نے کوئی بات نہیں کی۔ سفر خاموشی سے جاری رہا۔

اب رات ہو گئی تھی۔ ان ہزارہا چڑیوں کا شور ختم ہو گیا تھا جو کچھ دیر پہلے تک بسیرا لینے کے لیے درختوں کے اوپر فضا میں منڈلا رہی تھیں اور ان کے شور سے جنگل گونج رہا تھا۔ اب بالکل سناٹا تھا اور نیم تاریکی تھی لیکن ان لوگوں کا سفر جاری تھا۔ نورو بڑے اعتماد کے ساتھ قافلے کی رہنمائی کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس علاقے کی رگ رگ سے واقف ہے اور اندھیرے میں اپنا راستہ تلاش کر سکتا ہے۔ وہ چل رہا تھا اور باقی سب لوگ اس کے پیچھے چل رہے تھے۔ سب سے پیچھے تینوں لڑکیاں تھیں جن کے ساتھ امینہ، شاہ میاں اور ممدو تھے۔

ان کے ارد گرد گھنا جنگل تھا، جس میں اب چڑیوں کی چہکار کے بجائے گیدڑوں اور دوسرے جانوروں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن کوئی بھی جانور قافلے کے قریب نہیں آیا۔

تینوں لڑکیوں کے درمیان بہت ہی کم بات چیت ہو سکی تھی، کیونکہ وہ جب بھی آپس میں بات کرنے کی کوشش کرتیں، ان تینوں میں سے کوئی نہ کوئی ان کو روک دیتا اور ہدایت دیتا کہ وہ خاموشی کے ساتھ چلتی رہیں۔

یہ بہت طویل سفر تھا۔ پیدل چلتے چلتے ماجدہ کی ٹانگیں تھکی جا رہی تھیں، مگر یہ تھکن اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وجہ سے تھی کہ منزل کا علم نہیں تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ ابھی اور کہاں تک جانا ہے۔ رات گہری ہوتی جا رہی تھی اور فضا میں ایک عجیب سی پُراسرار سنسناہٹ گھلتی جا رہی تھی۔

اچانک درختوں سے پرے، بہت دور کہیں روشنی کی ایک جھلک سی نظر آئی اور پھر جیسے جیسے مزید فاصلہ طے ہوتا گیا، ویسے ویسے روشنی کی وہ جھلک بڑھتی گئی۔ اس کے ساتھ ہی قافلے میں ہونے والی بھنبھناہٹ میں اضافہ ہوتا گیا۔ قافلے کے لوگ آپس میں بہت کم باتیں کر رہے تھے لیکن پھر بھی ان کی ہلکی ہلکی آوازیں ایک بھنبھناہٹ میں تبدیل ہو کر فضا میں سرسرا رہی تھیں۔

''شاید.....شاید.....یہی جگہ ہماری منزل ہو۔'' ماجدہ نے دکھے ہوئے دل کے ساتھ شکستگی کے عالم میں سوچا۔ ''یا شاید اس سے بھی آگے کہیں جانا ہو۔ کون جانے..... یہ لوگ تو کچھ بتاتے ہی نہیں ہیں۔''

قافلہ اس روشنی کی سمت میں بڑھ رہا تھا اور کچھ دیر کے بعد وہ ایک عمارت کے پاس پہنچ گئے۔ عمارت کے پاس پہنچتے ہی اچھی خاصی آوازوں کا شور سنائی دینے لگا۔ وہ لوگ ایک ریلوے اسٹیشن کے پاس پہنچ گئے تھے۔

ریلوے اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوتے ہی منظر ایک دم روشن ہو گیا۔ کافی بڑا ریلوے اسٹیشن تھا اور اس کے ایک سے زائد پلیٹ فارم تھے۔ یہاں بجلی کی روشنی ہو رہی تھی اور بہت سارے مسافر مع اپنے ساز و سامان کے نظر آ رہے تھے۔ نورو سب لوگوں کو ساتھ لیے ہوئے ایک پلیٹ فارم پر پہنچا، جہاں پہلے سے ایک ٹرین کھڑی ہوئی تھی اور کچھ لوگ اس میں بیٹھے ہوئے بھی تھے۔ نورو ایک خالی بوگی کے پاس پہنچا، اس نے اس کے باہر لکھے ہوئے نمبر کو دیکھا اور سب لوگوں سے کہا کہ وہ اس ڈبے میں سوار ہو جائیں۔ سارے لوگ اس ڈبے میں بیٹھنے لگے لیکن امینہ، شاہ میاں اور ممدو تینوں لڑکیوں کو ساتھ لیے ہوئے پلیٹ فارم پر ہی کھڑے رہے اور قافلے والوں کو سوار ہوتے ہوئے دیکھتے رہے۔ لڑکیوں کو اس ڈبے میں سوار نہیں کیا گیا۔ سوار ہونے والوں میں وہ عورت بھی شامل تھی جس نے ان لڑکیوں سے بات کرنے کی کوشش کی تھی، جب وہ ڈبے میں سوار ہو رہی تھی تو اس نے مسکرا کر لڑکیوں کی طرف دیکھا اور ہاتھ ہلایا۔ وہ خاص طور سے ماجدہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ماجدہ نے بھی جواباً جلدی سے ہاتھ ہلانے کی کوشش کی لیکن امینہ نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑ کر نیچے کر دیا اور خونی نظروں سے اس عورت کو گھورا۔

قافلے کے سارے لوگ ٹرین میں سوار ہو گئے تو نورو نیچے کھڑے ہوئے لوگوں کے پاس آیا اور ممدو کے ساتھ سرگوشیوں میں کچھ باتیں کرنے لگا۔ ماجدہ کوشش کے باوجود ان لوگوں کی باتیں نہیں سن سکی۔ امینہ اور شاہ میاں لڑکیوں پر پوری طرح سے نظر رکھے ہوئے تھے۔

''اب جاؤ، تم لوگوں کی ٹرین کا بھی وقت ہو رہا ہے۔'' کچھ دیر کی گفتگو کے بعد نورو نے ممدو سے کہا اور ممدو نے ان لوگوں کو چلنے کا اشارہ کیا۔

وہ سب لوگ ایک دوسرے پلیٹ فارم پر آ گئے۔ یہاں بھی بہت گہما گہمی تھی اور بہت سارے مسافر موجود تھے۔

یہ لوگ تینوں لڑکیوں کو لیے ہوئے ایک طرف آ گئے اور ایک کونے میں کھڑے ہو گئے اور تب ایک بہت عجیب بات ہوئی۔ ممدو نے ان تینوں لڑکیوں سے مخاطب ہو کر بڑے نرم، شیریں لیکن محتاط لہجے میں کہا۔ ''سنو میری بچیو! اب ہم اپنے ملک میں نہیں ہیں۔ یہ بنگلہ دیش نہیں ہے۔ یہ ہندوستان ہے۔ ہم ہندوستان میں ہیں اور اب ہم تمہیں ہندوستان کی سیر کرائیں گے، لیکن خبردار بھولے سے بھی کوئی غلط حرکت نہ کرنا۔ اگر ہندوستان والوں کو معلوم ہو گیا کہ ہم بنگلہ دیشی ہیں تو وہ ہم کو فوراً ہی گولی مار دیں گے۔ اس لیے اپنی زبان بند رکھنا۔ بس جو ہم کہیں وہی کرتی رہنا۔ کوئی بھی غلط بات کی تو زندہ نہیں بچو گی اور پھر اپنے گھر کبھی نہیں جا سکو گی۔''

تینوں چھوٹی بچیاں سہم گئیں۔ انہیں سرحد پار سفر کی پیچیدگیوں کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا اور اب وہ اپنے آپ کو مکمل طور پر ان لوگوں کے رحم و کرم پر پا رہی تھیں۔ اب وہ بنگلہ دیش کے باہر تھیں، اپنے وطن سے دور، ایک اجنبی سرزمین پر، جہاں کوئی بھی ان کو نہیں جانتا تھا۔

لیکن جو چیز انہیں ہندوستان کی سرزمین پر مکمل اجنبیت کا شکار بنانے سے روکے ہوئے تھی وہ یہ تھی کہ ان کے اردگرد جو زبان بولی جا رہی تھی اور جس کی ملی جلی آوازیں وہ اپنے کانوں سے سن رہی تھیں، وہ بنگالی زبان ہی تھی، ان کی اپنی زبان۔

میمونہ تو اسکول میں پڑھتی تھی لیکن یہ بات ماجدہ کو بھی اچھی طرح معلوم تھی اور فردوسی کو بھی کہ ان کے ملک کی سرحدیں ہندوستان کے صوبے مغربی بنگال سے ملتی ہیں اور وہاں بھی بنگالی زبان ہی بولی جاتی ہے۔ میمونہ کو تو مغربی بنگال کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم تھیں۔

یہ انکشاف ان کے لیے اور بھی زیادہ پریشان کن تھا کہ وہ اب غیر ملک کی سرحدوں میں داخل ہو چکی ہیں، جہاں کوئی ان کا واقف کار نہیں ہے۔ اب تو جو کچھ تھے، بس یہی لوگ تھے جو انہیں یہاں لے کر آئے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

امینہ نے انہیں ایک بینچ پر بٹھا دیا اور خود بھی ان کے ساتھ بیٹھ گئی۔ شاہ میاں بھی ایک طرف بیٹھ گیا اور ممدو کسی اور طرف چلا گیا۔ ذرا سی دیر کے بعد ممدو واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں گتے کی پلیٹوں میں بہت سا کھانا تھا، جس میں سے مچھلی کی اشتہا انگیز مہک اٹھ رہی تھی۔ گرم گرم چاولوں سے بھاپ نکل رہی تھی۔

''لو..... تم لوگ خوب اچھی طرح سے کھانا کھاؤ۔'' ممدو نے مسکرا کر لڑکیوں سے کہا۔

''صبح سے تم نے کوئی ڈھنگ کی چیز نہیں کھائی ہے۔''

لڑکیاں واقعی بھوکی تھیں۔ عمدہ کھانا سامنے پا کر ان کی بھوک اور بھی چمک اٹھی۔

کچھ دیر کے بعد اس پلیٹ فارم پر ایک ٹرین آ کر رکی اور ان کو اس کے ایک ڈبے میں سوار کرا دیا گیا۔ امینہ، شاہ میاں اور ممدو ان کے ساتھ تھے۔ کھانا کھانے سے پہلے ہی امینہ نے ان کو کچھ باتیں اچھی طرح سمجھا دی تھیں۔ ''تم میری بیٹی ہو۔'' اس نے ماجدہ سے کہا۔ ''اور یہ دونوں میری بھانجیاں ہیں۔'' اس نے میمونہ اور فردوسی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''اگر اتفاق سے کوئی تم سے پوچھے تو تم یہی کہو گی۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ باقی جو کچھ کہنا ہے، وہ میں خود کہہ لوں گی۔''

لیکن کچھ کہنے سننے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

ٹرین میں سوار ہو کر اپنی سیٹوں پر بیٹھنے کے بعد ان تینوں لڑکیوں کو ایسی گہری نیند نے آ لیا کہ وہ اگلی صبح تک سوتی رہیں۔ صبح کو سب سے پہلے ماجدہ کی آنکھ کھلی اور اس نے میمونہ اور فردوسی کو سوتا ہوا پایا۔ ماجدہ کو سخت حیرت ہوئی کہ وہ تینوں اس قدر گہری نیند کس طرح سو گئیں۔ رات گزر چکی تھی باہر دن کا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ ٹرین کسی نامعلوم سرزمین پر تیزی سے بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ ذرا دیر میں میمونہ اور فردوسی بھی جاگ گئیں اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔ امینہ، شاہ میاں اور ممدو ان کے قریب ہی موجود تھے اور رات رخصت ہو چکی تھی۔ ٹرین کی رفتار ہلکی ہو رہی تھی۔ کوئی اسٹیشن آ رہا تھا۔ پھر ٹرین رک گئی اور پلیٹ فارم کا شور ان کے کانوں سے ٹکرانے لگا۔

ایک بہت بڑی تبدیلی ان تینوں لڑکیوں نے یہ محسوس کی کہ پلیٹ فارم سے جو آوازیں آ رہی تھیں وہ کسی اجنبی زبان کی تھیں۔ یہ بنگالی زبان نہیں تھی۔ ڈبے کے باہر کوئی شخص بڑے زور سے ایک قلی پر چیخ رہا تھا لیکن ایک نامعلوم زبان میں۔

ماجدہ کے لیے یہ تبدیلی بڑی حیرت ناک اور مایوس کن تھی۔ بنگالی بولنے والے کہاں چلے گئے تھے؟ یہ کون سی زبان بولی جا رہی تھی؟ وہ تو بنگالی کے علاوہ اور کوئی زبان بول اور سمجھ

ہی نہیں سکتی تھی۔ ڈبے کے اندر بھی جو لوگ موجود تھے، ان میں سے کوئی بھی بنگالی نہیں بول رہا تھا۔ ماجدہ حیران ہو کر اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

''یہ ہندی بولنے والے لوگ ہیں۔'' میمونہ نے اپنے قریب بیٹھی ہوئی ماجدہ کے کان میں کہا۔ ''بنگلہ دیش اور مغربی بنگال بہت پیچھے رہ گئے ہیں، آگے کہیں بنگالی نہیں بولی جاتی۔''

''ہائے۔'' ماجدہ نے گھبرا کر سرگوشی میں کہا۔ ''تو..... میں کسی سے کیسے بات کر سکوں گی؟''

''میں ہندی کافی سمجھ سکتی ہوں اور تھوڑی بہت بول بھی سکتی ہوں۔'' میمونہ نے کہا۔

''میں..... تو تمہارے ساتھ ہوں۔''

اگلے اسٹیشن پر انہیں اتار لیا گیا اور کئی گھنٹے کے بعد وہ سب ایک دوسری ٹرین کے ذریعے آگے روانہ ہوئے اور پھر یہ سفر تیزی سے جاری رہا۔ اسٹیشن پر اسٹیشن آتے رہے، فضا بدلتی رہی، موسم بدلتا رہا، وقت بدلتا رہا، بولیوں میں فرق آتا گیا اور بنگالی زبان تو جیسے ناپید ہو کر رہ گئی۔ ماجدہ اب ان پانچ افراد کے سوا جو اس کے ساتھ تھے، کسی سے بات نہیں کر سکتی تھی اور یہی حال فردوسی کا تھا۔ وہ اجنبی زبانوں کے حصار میں گھری ہوئی تھی۔

اگلے دن کا موسم ان کے لیے بڑا جان لیوا تھا۔ یہ بہت گرم، خشک اور ریتلا موسم تھا۔ گرم اور خشک ریت کے اُڑتے ہوئے ذرات ان کے جسموں کے کھلے ہوئے حصوں پر جلتی ہوئی چنگاریوں کی طرح گر رہے تھے۔ ان لڑکیوں کے لیے یہ موسم بالکل اجنبی اور ناقابلِ برداشت تھا۔ ایسی گرمی..... ایسی گرمی..... اور خشکی..... زبان جیسے باہر نکلی آ رہی تھی۔

ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر وہ سب اتر گئے۔ سہ پہر کا وقت تھا اور ہر چیز تنور کی طرح گرم تھی۔ اس اسٹیشن پر جو لوگ نظر آ رہے تھے ایسی وضع قطع کے لوگ ان لڑکیوں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھے تھے۔ ماجدہ مردوں کی بھاری بھاری پگڑیوں اور عورتوں کے ڈھیلے ڈھالے لباسوں کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

لڑکیوں کو یہ دیکھ کر خاصی حیرت ہوئی تھی کہ امینہ، شاہ میاں اور ممدو تینوں خوب ہندی بول لیتے تھے۔ بنگال سے نکلنے کے بعد وہ راستے میں، جہاں بھی ضرورت ہوتی، مقامی لوگوں سے ہندی میں بات کرتے تھے اور ان کی بات کو خوب سمجھ بھی لیتے تھے۔

اسٹیشن سے باہر نکل کر یہ لوگ پیدل ہی ایک طرف چل پڑے۔ تینوں لڑکیاں ریت اور گرمی میں ڈوبے ہوئے اس شہر کو حیرت، تجسس اور ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ سورج اس قدر نامہربان بھی ہو سکتا ہے اور فضا اس قدر آتشیں بھی ہو سکتی ہے اس کا انہیں بالکل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اندازہ نہیں تھا۔

وہ لوگ ایک مکان پر پہنچے۔ یہ پختہ اینٹوں کا بنا ہوا ایک دو منزلہ مکان تھا۔ ایک شخص نے مکان کا دروازہ کھولا اور ان سب کو اندر بلا لیا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ لوگ ایک دوسرے سے خوب واقف تھے۔ فوراً ہی ان میں ہندی میں گفتگو شروع ہوگئی۔ ماجدہ اور میمونہ اس گفتگو کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھ رہی تھیں۔

لڑکیوں کو ایک الگ کمرے میں پہنچا دیا گیا، جہاں ان کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

☆======☆======☆

''یہ..... یہ..... ہم لوگ کہاں آ گئے ہیں؟'' ماجدہ نے وحشت زدہ اور غم ناک آواز میں اپنی دونوں ساتھیوں سے کہا۔

''یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ ہم لوگ اس وقت ہندوستان میں ہیں۔'' میمونہ نے کہا۔

''میں انگریزی میں لکھے ہوئے اسٹیشنوں کے بعض نام پڑھتی رہی ہوں، لیکن اس سے کچھ اندازہ نہیں ہوتا کہ ہم کہاں ہیں، کیونکہ میں ان شہروں کے ناموں سے واقف نہیں ہوں۔ مگر پچھلے اسٹیشن پر میں نے پلیٹ فارم پر مسافروں کو ہندی میں گفتگو کرتے سنا تھا۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا کہ اس سال راجستھان میں ابھی سے بہت گرمی شروع ہوگئی ہے..... شاید ہم راجستھان میں ہیں۔''

''راجستھان؟ یہ کیا ہے؟ کوئی بڑا شہر؟ یہی شہر جہاں ہم اس وقت ہیں؟'' فردوسی نے پوچھا۔

''نہیں۔'' میمونہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''راجستھان شہر نہیں ہے۔ وہ ہندوستان کا ایک صوبہ ہے۔ میں نے تاریخ اور جغرافیہ کی کتابوں میں اس کے بارے میں پڑھا ہے۔''

وہ ان دونوں کو راجستھان کے بارے میں وہ سب کچھ بتانے لگی جو اسے معلوم تھا۔

''تو..... یہ لوگ ہمیں راجستھان لے کر کیوں آئے ہیں؟'' ماجدہ نے سہم کر کہا۔

''اُف..... توبہ..... یہاں تو گرمی کے مارے دم نکلا جا رہا ہے۔''

''کیا یہ اچھا نہ ہوتا کہ ہم راستے میں ہی سے کہیں اور بھاگ جاتے؟'' فردوسی نے گہری افسردگی کے ساتھ کہا۔ ''شاید کوئی ہماری مدد کرتا.....''

''پتہ نہیں کیا ہوتا۔'' ماجدہ نے روتے ہوئے کہا۔ ''ہو سکتا ہے یہ لوگ ہمیں مار ڈالتے..... یا شاید ہم پکڑ لیے جاتے اور کوئی ہماری بات بھی نہ سمجھتا۔''

دراصل وہ تینوں لڑکیاں سارا وقت اس قدر خوفزدہ اور پریشان رہی تھیں کہ ان میں بھاگنے کا خطرہ مول لینے کا حوصلہ ہی نہیں پیدا ہو سکا تھا۔

ان لوگوں کی گفتگو جاری تھی کہ امینہ اس کمرے میں داخل ہوئی۔

''بہت گرمی ہے، ہے نا؟'' اس نے مسکرا کر لڑکیوں سے کہا۔ ''اس جگہ کی آب و ہوا ہمارے بنگلہ دیش سے بہت الگ ہے۔ یہاں بارش بھی بہت کم ہوتی ہے۔ اچھا اب تم تینوں باری باری نہا لو، پھر کھانا کھا کر آرام کرو، سفر کی تھکن بہت ہوگی۔''

''ہم اپنے گھر کب جائیں گے امینہ چاچی؟'' ماجدہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ہم اب ایک ایسی جگہ آ گئے ہیں جہاں کوئی ہماری زبان بھی نہیں سمجھتا۔''

''گھبراتی کیوں ہو؟'' امینہ نے کہا۔ ''میں جو ہوں تمہارے ساتھ..... یہ لوگ ہماری زبان نہیں سمجھتے تو کیا ہوا؟ میں تو ان کی زبان سمجھتی ہوں اور میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہیں جو کچھ بھی کہنا ہو، مجھ سے کہہ سکتی ہو۔''

''مگر چاچی..... ہم لوگ اپنے گھر کب جائیں گے؟''

ماجدہ نے اپنا سوال دہرایا۔

''ہم لوگ یہاں نہیں رہنا چاہتے چاچی۔'' میمونہ نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''خدا کے واسطے..... ہمیں ہمارے گھروں کو پہنچا دیجیے۔ ہم تو اپنے گھروں سے بہت دور آ گئے ہیں۔''

''ہمارا وعدہ ہے۔'' امینہ نے مسکرا کر کہا۔ ''ہم نے تم سے بار بار کہا ہے کہ ہم تم کو تمہارے گھر پہنچا دیں گے۔ بس، کچھ ہی دنوں کی بات ہے۔ ذرا تھوڑا سا گھوم پھر لو، دنیا دیکھ لو..... پھر اپنے اپنے گھروں کو چلی جانا.....''

لڑکیاں اگرچہ چھوٹی تھیں، لیکن ان کے اندر اتنا شعور ضرور موجود تھا کہ وہ یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ امینہ جھوٹ بول رہی ہے، شاہ میاں بھی جھوٹ بول رہا ہے اور ممدو بھی جھوٹ بول رہا ہے۔ یہ لوگ انہیں ان کے گھر والوں کے پاس کبھی نہیں لے جائیں گے۔ وہ جانتی تھیں کہ انہیں اغوا کر لیا گیا ہے اور ان کے ساتھ آگے خدا جانے کیا ہونے والا ہے۔ وہ شدید بے بسی اور لاچاری کا شکار تھیں۔ جس جال میں وہ جکڑی جا چکی تھیں، اس سے باہر نکلنا ان کے لیے کوئی آسان کام نہیں تھا، وہ تو کسی معجزے کی، کسی غیبی امداد کی منتظر تھیں..... شاید خدا کسی وقت ان کی مشکل آسان کر دے۔

امینہ ان کو ایک ایک کر کے غسل خانے لے گئی، جہاں انہوں نے ٹھنڈے پانی سے غسل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیا۔ کپڑوں میں، جسموں میں، بالوں میں ریت ہی ریت بھر گئی تھی۔ نہانے سے انہیں بہت زیادہ فرحت حاصل ہوئی۔

ان تینوں کو اس گھر میں کوئی عورت نظر نہیں آئی۔ ان کے علاوہ بس امینہ ہی ایک عورت تھی۔ مرد کتنے تھے اس کا انہیں علم نہیں تھا، کیونکہ وہ گھر کے اندرونی حصے میں تھیں اور باہر کے حصے کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھیں۔ لیکن کم از کم ایک مرد تو تھا ہی، جس نے دروازہ کھولا تھا۔ شاید اور بھی ہوں گے، کیونکہ باہر سے ایک سے زیادہ اجنبی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ لوگ ہندی بول رہے تھے، مگر بہت ہلکی آواز میں۔

طویل سفر اور سخت موسم نے لڑکیوں کو بالکل تھکا دیا تھا اور انہیں واقعی آرام کی ضرورت تھی لیکن آرام سے پہلے انہیں کچھ کھانے کی ضرورت تھی۔

انہیں جو کھانا دیا گیا وہ مقدار میں وافر ہونے کے علاوہ مختلف ذائقے کا تھا۔ یہاں چاول اور مچھلی نہیں تھی۔ گوشت کا سالن تھا اور موٹی موٹی خمیری روٹیاں تھیں۔ سب چیزیں بازار کی معلوم ہوتی تھیں۔ لڑکیوں کو روٹی کھانے کی بہت کم عادت تھی لیکن ٹرین کے طویل سفر کے دوران انہیں روٹیاں ہی کھانے کو ملی تھیں۔ اسٹیشنوں پر بھات نہیں دستیاب تھا۔ بنگال اور بنگالی زبان کے پیچھے رہ جانے کے ساتھ ہی بھات بھی کہیں پیچھے ہی رہ گیا تھا۔ مچھلی بھی بمشکل صرف ایک اسٹیشن پر مل سکی تھی اور یہاں راجستھان کے اس نامعلوم گرم و گرد آلود شہر میں، جہاں کی جھلسا دینے والی ہوا ان کے جسموں کو چھیلے جا رہی تھی، انہیں روٹی اور گوشت کا سالن ہی کھانے کو ملا تھا۔ بھات اور مچھلی کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

ان لوگوں نے رات کا کھانا کھایا۔ امینہ ان کے ساتھ کھانے میں شریک تھی۔ ماجدہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا اس شہر میں بھات نہیں ملتا، لیکن پھر وہ خاموش ہی رہی۔ جو کچھ کھانے کو مل رہا تھا وہ بھی بُرا نہیں تھا اور یہ کیا کم غنیمت تھا کہ ان لوگوں کو کھانے کو مل رہا تھا..... انہیں بھوکا نہیں رکھا جا رہا تھا۔

امینہ سارا وقت لڑکیوں کے سر پر سوار رہی اور اس نے ان کو گھر کے دوسرے حصوں میں نہیں جانے دیا۔ کھانا ختم ہوتے ہی لڑکیوں کو گہری نیند آ گئی، ایسی گہری نیند کہ انہیں تن بدن کا ہوش نہیں رہا اور وہ صبح تک پڑی سوتی رہیں۔

ماجدہ کی آنکھ کھلی تو خاصا دن چڑھ آیا تھا۔ میمونہ آنکھیں کھولے قریب ہی لیٹی ہوئی تھی اور فردوسی ابھی تک سو رہی تھی۔ امینہ سامنے ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی چائے پی رہی تھی۔

ماجدہ آنکھیں کھولے گزشتہ رات کی غیر معمولی طور پر گہری نیند پر غور کر رہی تھی۔ ویسی ہی گہری نیند تھی جیسی کہ ان لوگوں کو اس رات ٹرین میں کھانا کھانے کے بعد آئی تھی کہ صبح تک انہیں کچھ پتہ ہی نہیں چلا تھا اور رات بھر کے سفر کے دوران معلوم نہیں کتنا طویل فاصلہ طے ہو چکا تھا اور صبح جب وہ جاگی تھی تو اس کا وطن، اس کی زبان، سب کچھ اس سے چھوٹ چکا تھا۔ وہ ایک ایسے علاقے میں سفر کر رہی تھی جہاں وہ بے زبان ہو کر رہ گئی تھی۔

''کوئی جلدی نہیں ہے۔'' امینہ نے ماجدہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم لوگ چاہو تو ابھی اور سو سکتی ہو۔ تمہیں یہاں کوئی کام نہیں کرنا ہے، جتنا چاہو آرام کر سکتی ہو۔''

اسی وقت فردوسی کی بھی آنکھ کھل گئی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ماجدہ اور میمونہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

''میں تو اب اٹھوں گی چاچی۔'' میمونہ نے کہا۔ ''میں بہت گہری نیند سوئی ہوں اور اب مجھے سونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' امینہ نے کہا۔ ''اٹھ جاؤ۔''

تینوں لڑکیاں اٹھ گئیں۔ امینہ کی نگرانی میں انہوں نے باری باری ہاتھ منہ دھویا اور اس کے بعد انہیں ناشتہ دیا گیا، جو شاہ میاں ان کے لیے لے کر آیا تھا۔ ناشتے میں پراٹھے تھے اور کوئی سبزی تھی۔ لڑکیوں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس قسم کی سبزی تھی۔ وہ اس کے ذائقے سے نا آشنا تھیں، تاہم انہیں وہ اچھی لگی۔

ناشتہ کرنے کے بعد کچھ دیر تک تو امینہ ان کے ساتھ رہی اور پھر وہ وہاں سے چلی گئی۔ جس کمرے میں وہ تینوں موجود تھیں اس کے دروازے کو باہر سے بند کر دیا گیا۔

تینوں لڑکیاں ایک بار پھر ایک کمرے میں تنہا تھیں اور حالت اسیری میں تھیں۔ ان کے پاس کرنے کے لیے بہت سی باتیں تھیں۔ خون کے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی باتیں، خوف کی دھند میں لپٹی ہوئی باتیں، امید اور نا امیدی کی موجوں کے درمیان ڈولتی ہوئی باتیں..... وہ اپنا دکھ صرف آپس میں ہی بانٹ سکتیں تھیں۔ وہ اپنے اپنے بارے میں ایک دوسرے کو بہت کچھ بتا چکی تھیں لیکن پھر بھی بتانے کو بہت کچھ باقی تھا۔ ماجدہ نے اپنی دونوں ہم قفس ساتھیوں کو ہاشم کے بارے میں بھی کافی تفصیل سے بتا دیا تھا۔

دوپہر تک کسی نے کمرے کا دروازہ نہیں کھولا اور وہ تینوں اکیلی رہیں۔ انہوں نے یہ بات خاص طور سے محسوس کی تھی کہ باہر کی شدید گرمی کے باوجود کمرہ اندر سے اتنا زیادہ گرم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں تھا۔

دوپہر کے بعد امینہ ان کے پاس آئی اور اس نے ان کو دوپہر کا کھانا کھلایا۔ ان کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس وقت کے کھانے میں مچھلی بھی موجود تھی، اگرچہ چاول نہیں تھے تاہم مچھلی کا وجود ہی غنیمت تھا۔

''ہمیں یہاں سے کب نکالو گی چاچی؟'' فردوسی نے ہمت کر کے امینہ سے پوچھا۔

''یہاں تو بہت گرمی ہے۔ یہاں تو ہر وقت جیسے آگ برستی رہتی ہے۔''

''جلدی نکالیں گے۔'' امینہ نے سرسری انداز میں جواب دیا۔ ''تم لوگ کھانا کھا لو اور آرام کرو۔''

امینہ نے جاتے جاتے دروازہ ایک بار پھر بند کر دیا تھا۔ لڑکیاں اکیلی رہ گئیں۔

شام ہونے کو تھی جب امینہ ایک بار پھر دروازہ کھول کر ان کے کمرے میں داخل ہوگئی۔

''چلو!'' اس نے اندر آتے ہی ان سے کہا۔ ''ہم اب یہاں سے نکل رہے ہیں۔''

''کہاں چاچی؟'' ماجدہ کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ ''ہم لوگ کہاں جا رہے ہیں؟''

امینہ نے گھور کر اس کو دیکھا۔ ''کہیں نہ کہیں تو جائیں گے۔ تمہیں اس قدر بے چینی کس بات کی ہے؟ تم کو سب کچھ تو مل رہا ہے، کھانا بھی، آرام بھی..... اور کیا چاہیے؟ اتنا عیش تو تم کو اپنے گھر پر بھی نصیب نہیں ہوگا۔''

ماجدہ خاموش ہوگئی۔ کسی اور لڑکی نے بھی کوئی سوال نہیں کیا۔ امینہ ان کو ساتھ لے کر مکان کے باہر آ گئی۔ مکان کے دروازے کے سامنے ایک بڑی سی گاڑی کھڑی تھی۔ شاہ میاں، ممدو اور دو مقامی آدمی گاڑی کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ وہ چاروں آپس میں ہندی میں باتیں کر رہے تھے۔

لڑکیوں کو اس بڑی سی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر اس طرح بٹھا دیا گیا کہ ان کے ایک طرف امینہ اور دوسری طرف شاہ میاں بیٹھا تھا۔ ممدو اور دونوں مقامی آدمی آگے بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک مقامی آدمی نے گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور اس کے ساتھ ہی گاڑی وہاں سے روانہ ہوگئی۔

تینوں لڑکیاں خاموش تھیں اور اپنے اپنے خیالوں میں گم تھیں۔ اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے مرد آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

ان کا یہ سفر کافی دیر تک جاری رہا۔ وہ شہر سے باہر نکل آئے تھے اور ریت کے ٹیلوں

سے بھرے ہوئے ویرانے میں داخل ہو چکے تھے۔ یہاں دور دور تک سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ گہرے سناٹے میں صرف گرم ہوا کی سائیں سائیں سنائی دے رہی تھی۔ ایک بنجر میدان تھا جو حد نظر تک پھیلا ہوا تھا۔ کہیں کوئی درخت نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف کسی کسی جگہ کوئی جنگلی جھاڑی نظر آ جاتی تھی۔

''کیسی جگہ ہے یہ؟'' ماجدہ کے دماغ میں اپنے گاؤں کی سبزے سے لہلہاتی ہوئی، ہزار ہا درختوں اور پودوں سے بھری ہوئی زمین، بل کھاتی ہوئی ندی، بادلوں سے ڈھکے آسمان اور جھما جھم برستے ہوئے پانی کے دلکش مناظر ابھر رہے تھے۔ یہ کیسی جگہ تھی؟ یہاں کا آسمان بھی بادلوں سے کس قدر عاری تھا، بالکل بے داغ نیلگوں چادر کی طرح لیکن ایسی چادر جس میں سے شعلے برس رہے تھے۔

شام ہونے کے ساتھ ساتھ گرمی میں کچھ کمی ہوگئی تھی اور ہوا کے گرم تھپیڑوں کی شدت اور حدت میں بھی کچھ کمی آ گئی تھی، لیکن باقی منظر ویسے کا ویسا ہی اجاڑ تھا۔ ریتیلا میدان، اس پر جگہ جگہ سوکھے ہوئے پھوڑوں کی طرح ابھرے ہوئے ٹیلے اور کہیں کہیں مردار جھاڑیاں..... نہ کہیں ہریالی، نہ کوئی گنگناتی ہوئی ندی، نہ کسی پرندے کی کانوں میں رس گھولتی آواز..... ہر طرف آنکھوں کو تھکا دینے والی اور دل و دماغ کو ناخوش کرنے والی یاس انگیز ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔

ان لوگوں کا سفر اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ اندھیرا نہیں ہوگیا۔ منظر کی یکسانیت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔

اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے لوگ باتیں کر رہے تھے۔ ممدو بھی ان کے ساتھ خوب بول رہا تھا۔ ماجدہ اور فردوسی ان کی گفتگو کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکتی تھیں۔

''آؤ، اترو۔'' امینہ نے گاڑی سے اترتے ہوئے لڑکیوں سے کہا۔ دوسری طرف شاہ میاں موجود تھا۔ تینوں لڑکیاں امینہ کے حکم پر گاڑی سے نیچے اتر آئیں اور سہم کر کھڑی ہوگئیں۔

اسی وقت امینہ ذرا سا آگے بڑھ کر ممدو سے، جو دونوں مقامی لوگوں کے ساتھ چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا، کچھ بات کرنے لگی۔

''ہم لوگ پاکستان میں ہیں۔'' میمونہ نے موقع پاتے ہی سرگوشی میں اپنی دونوں اسیر ساتھیوں سے کہا۔ ''ہم پاکستان آ گئے ہیں۔''

''کیا؟'' ماجدہ نے ناقابلِ یقین انداز میں گھبرا کر کہا۔ ''پاکستان؟ مگر تمہیں کیسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

معلوم؟''

''میں نے ان لوگوں کی باتیں سنی ہیں۔'' میمونہ نے کہا۔ ''وہ آدمی ممدو سے کہہ رہا تھا کہ آج میں تم لوگوں کو پاکستانی سرحد میں تین میل اندر تک چھوڑ دوں گا، کیونکہ تمہارے ساتھ چھوٹی بچیاں ہیں۔''

اسی وقت امینہ ان کے پاس واپس آ گئی اور ان کی بات چیت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

وہ لوگ کچھ دیر تک وہاں رکے ہوئے آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے۔ وہ سب لڑکیوں سے کچھ فاصلے پر تھے۔ ویسے بھی ماجدہ اور فردوسی تو ان کی باتیں بالکل نہیں سمجھ سکتی تھیں، کیونکہ وہ لوگ ہندی میں بات کر رہے تھے۔ دونوں مقامی لوگ گاڑی میں دوبارہ بیٹھ گئے اور گاڑی وہاں سے واپس روانہ ہو گئی۔ تینوں لڑکیاں گاڑی کو جاتے دیکھ رہی تھیں اور اب وہ واضح طور پر سمجھ سکتی تھیں کہ انہیں پیدل چلنا ہوگا، کیونکہ دور دور تک اول شب کے ملگجے اندھیرے کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا، روشنی کی کوئی رمق نظر نہیں آ رہی تھی۔ سارے راستے ان لوگوں کو ویرانی اور سناٹے ہی ملے تھے۔ چٹیل، ریتیلے میدان تھے جو حدِ نظر تک پھیلے ہوئے تھے اور کوئی بستی نظر نہیں آتی تھی۔ شاید گاڑی بستی اور آبادی سے بچتی بچاتی خاص طور سے ویران علاقے میں سفر کرتی ہوئی آئی تھی۔

''اچھا، تو ہمارے ساتھ ساتھ چلی آؤ۔'' امینہ نے لڑکیوں سے کہا اور خود اس نے ماجدہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ممدو نے فردوسی کا اور شاہ میاں نے میمونہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''ساتھ ساتھ رہنا ضروری ہے اس لیے تم لوگوں کے ہاتھ پکڑ لیے ہیں۔'' شاہ میاں نے نرمی سے کہا۔ ''اجنبی علاقہ ہے، رات کا وقت ہے، تم لوگ اس جگہ سے بالکل واقف نہیں ہو۔ اگر کہیں اِدھر اُدھر بھٹک گئیں تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔''

اور پھر رات کی نیم تاریکی میں یہ قافلہ کسی نامعلوم منزل کی طرف پیدل چل پڑا۔

منزل صرف ان مغوی لڑکیوں کے لیے نامعلوم تھی۔ انہیں اغوا کرنے والوں کو تو سب کچھ معلوم تھا کہ آگے انہیں کیا کرنا ہے۔

نیم تاریکی میں ان کا پیدل سفر جاری تھا، دن بھر کی تپتی ہوئی دھوپ کے رخصت ہو جانے کے بعد فضا میں قدرے فرحت بخش نرمی کا احساس ہوتا تھا، لیکن یہ نرمی بھی اپنے اندر ایک عجیب قسم کا کھردرا پن لیے ہوئے تھی۔ سوکھی سوکھی نرمی، جس میں ہر چیز چبھتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

میمونہ کی بات پوری نہیں ہو سکی تھی کہ امینہ قریب آ گئی تھی اور میمونہ کو چپ ہو جانا پڑا تھا، تاہم اس نے اپنی دونوں ساتھیوں کو اتنا تو بتا ہی دیا تھا کہ وہ لوگ اب پاکستان کے علاقے میں تھیں۔

پاکستان کا نام سنتے ہی ماجدہ کے دل میں ہیجان و اضطراب کی تیز و تند لہریں اٹھنے لگی تھیں۔ اس نے ستارہ آپا سے پاکستان کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔ ستارہ آپا تو پاکستان میں ہی رہتی تھیں۔ وہ بتاتی تھیں کہ 1972ء میں بنگلہ دیش بنا تھا تو اس وقت ان کی عمر پندرہ سال کی تھی اور وہ میٹرک کا امتحان دینے والی تھیں۔ 1972ء تک تو سب پاکستان میں ہی رہتے تھے۔ ستارہ آپا کو اردو لکھنا پڑھنا بھی آتی تھی۔ ان کے اسکول میں اردو بھی پڑھائی جاتی تھی۔ ستارہ آپا مغربی پاکستان کبھی نہیں گئی تھیں۔ وہاں ان کا کوئی عزیز رشتے دار نہیں تھا لیکن وہ مغربی پاکستان کے بارے میں بہت زیادہ جانتی تھیں۔ انہوں نے اسکول کی کتابوں اور اخباروں میں پاکستان کے بارے میں بہت کچھ پڑھا تھا اور برابر پڑھتی رہتی تھیں۔ ستارہ آپا بتاتی تھیں کہ 1972ء میں بڑے زور کی لڑائی ہوئی تھی، لاکھوں لوگ مارے گئے تھے، جن میں مغربی پاکستان کے لوگ بھی تھے اور بنگال کے بنگالی اور غیر بنگالی لوگ بھی اور پھر پاکستان وہاں سے غائب ہو گیا تھا، اس کی جگہ بنگلہ دیش آ گیا تھا۔ اسکولوں کی کتابوں سے، عام کتابوں سے پاکستان کا ذکر آہستہ آہستہ ختم ہوتا گیا تھا، لیکن پاکستان لوگوں کی زندگی سے نہیں نکل سکا تھا۔ بنگلہ دیش میں بہت زیادہ غربت تھی، بیروزگاری تھی، مہنگائی تھی، کام کرنے والوں کو کام نہیں ملتا تھا اور پیٹ کو روٹی نہیں دستیاب تھی۔

ستارہ آپا بتاتی تھیں کہ جب بنگلہ دیش بنا تو شروع شروع میں لاکھوں بنگالی مغربی پاکستان سے بھاگ بھاگ کر جوشِ مسرت کے عالم میں اپنے نئے اور پیارے وطن بنگلہ دیش میں آنے لگے، جو اب ایک آزاد اور خود مختار ملک تھا لیکن یہاں آ کر انہیں نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ نئے اور آزاد وطن میں غربت ہی غربت تھی، مہنگائی اور بیروزگاری تھی، کھانے کو نہیں ملتا تھا۔ پاکستان سے آنے والے بتاتے تھے کہ پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی میں روزگار کی کوئی کمی ہی نہیں تھی۔ وہاں تو ہر آدمی کو خواہ وہ کہیں کا بھی رہنے والا ہو، بڑی آسانی سے روزگار مل جاتا تھا اور تب بنگالیوں کی ایک بڑی تعداد نے پاکستان کا رخ اختیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ مردوں کے علاوہ بہت ساری عورتیں بھی پاکستان جا رہی تھیں لیکن اب پاکستان جانا آسان نہیں تھا۔ پاکستان اب ایک دوسرا ملک تھا، جو بنگلہ دیش سے بہت دور تھا اور ان دونوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ملکوں کے درمیان ہندوستان جیسا وسیع ملک حائل تھا۔ پھر بھی بنگال کے لوگ نہ جانے کیا کیا جتن کر کے کراچی پہنچ رہے تھے اور وہاں جاتے ہی انہیں کام مل جاتا تھا۔ ستارہ آپا بتاتی تھیں کہ کراچی میں بنگالی بہت سارے مختلف کام کرتے ہیں اور وہ پیسے کما کما کر اپنے گھر بھیجتے ہیں۔ بہت سے لوگ تو اپنے پورے پورے خاندانوں کے ساتھ کراچی میں آباد ہو گئے تھے۔

ماجدہ کو کھلنا میں اپنا آخری دن یاد آیا، جب اس کی سہیلیاں بانو اور اختری اس سے ملنے کے لیے آئی تھیں اور وہ تینوں بھیگی ہوئی فضا میں چہل قدمی کرتی ہوئی ندی تک گئی تھیں۔ تب بانو نے ماجدہ کو خالدہ آپا کے خط کے بارے میں بتایا تھا، جو کراچی سے آیا تھا۔ بانو نے بتایا کہ خالدہ آپا نے لکھا تھا کہ وہ کراچی میں بڑے آرام سے ہیں، ان کے دونوں بیٹے کسی کارخانے میں کام کر رہے ہیں اور خود خالدہ آپا بھی کسی ہسپتال میں نوکری کر رہی ہیں۔

بانو کی بات سن کر اختری نے اپنے منور چاچا کا تذکرہ کیا تھا، جن کا پورا خاندان یہاں سے کراچی چلا گیا تھا اور سب لوگ وہاں بہت مزے میں تھے۔

بانو نے یہ بھی بتایا کہ خالدہ آپا نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ کراچی میں بہت سے بنگالی آباد ہیں اور وہاں بنگالیوں کے کئی علاقے ہیں۔

یہ ساری باتیں سن سن کر ماجدہ کے دل میں اکثر یہ خواہش انگڑائی لیتی تھی کہ وہ بھی کبھی کراچی دیکھے، اس ملک کو دیکھے جس کا نام کبھی اس کے اپنے وطن کے نام کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ لیکن یہ بات تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ وہ اس طرح پاکستان جائے گی۔

☆======☆======☆

وہ لوگ نہ جانے کب تک چلتے رہے۔ ماجدہ کے دل سے وقت کا احساس مٹ چکا تھا۔ وہ اپنے گہرے، غمناک خیالات میں گم تھی۔ ''گھر میں اس وقت نہ جانے کیا ہو رہا ہو گا..... بابا اور اماں کیا کر رہے ہوں گے..... ہاشم کیا کر رہا ہو گا..... اب تک تو شاید ان لوگوں نے میری تلاش بھی ترک کر دی ہو گی۔''

اچانک وہ اپنے خیالات سے چونک کر ہوشیار ہو گئی۔ سامنے، بہت دور، کچھ روشنیاں ٹمٹماتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ میمونہ اور فردوسی نے بھی وہ روشنیاں دیکھ لی تھیں۔

''ہم شاید کسی بستی کے قریب پہنچ رہے ہیں۔'' میمونہ نے آہستہ سے کہا۔

''خاموش رہو۔'' ممدو نے محتاط انداز میں اسے تنبیہ کی۔ ''خاموشی سے چلتی رہی، بولو مت۔''

میمونہ خاموش ہو گئی اور وہ لوگ اس طرف بڑھتے رہے جدھر کچھ روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ جیسے جیسے وہ جگہ قریب آتی گئی ویسے ویسے اندھیرے میں ایک بستی کے دھندلے دھندلے سے خدوخال واضح ہوتے گئے۔ بہت سے مکانات کا سلسلہ نظر آ رہا تھا، لیکن زیادہ تر مکانات مکمل تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے اور ان کے نقوش بھی بمشکل ہی نظر آ رہے تھے۔ کسی کسی مکان میں روشنی بھی ہو رہی تھی۔

ان لوگوں کا یہ مختصر سا قافلہ ایک ایسے مکان کے دروازے پر جا کر رکا جہاں کچھ روشنی ہو رہی تھی۔

ممدو نے محتاط انداز میں مکان کے دروازے پر رُک رُک کر دستک دی۔ دروازہ کھلنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ایک چھدری داڑھی والا شخص لالٹین ہاتھ میں اٹھائے ہوئے دروازے کے پیچھے سے نمودار ہوا۔

''السلام علیکم!'' ممدو اور شاہ میاں نے اس کو دیکھ کر ایک ساتھ کہا۔

''وعلیکم السلام!'' داڑھی والے شخص نے مسکرا کر جواب دیا اور اس کے بعد ان کے درمیان ہونے والے الفاظ کے تبادلے کو تھوڑا بہت میمونہ کے علاوہ اور کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔

جو زبان یہ لوگ بول رہے تھے، وہ اس سے مختلف نہیں تھی جو ماجدہ سارے راستے سنتی چلی آئی تھی۔

ان لوگوں کو اندر لے جایا گیا اور ایک نیم روشن کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ یہاں ایک لالٹین جل رہی تھی۔ اس آدمی کے علاوہ، جس نے دروازہ کھولا تھا یہاں دو آدمی اور بھی تھے۔ انہوں نے کمرے میں آ کر لالٹین کی روشنی میں تینوں لڑکیوں کو بہت غور سے دیکھا۔ ان کے اس طرح دیکھنے سے لڑکیاں کچھ پریشان ہو گئیں۔ پھر وہ لوگ کمرے سے نکل گئے۔ امینہ لڑکیوں کے ساتھ تھی۔

''تم لوگ، ہاتھ منہ دھو لو۔'' امینہ نے لڑکیوں سے کہا۔ ''اس کے بعد ہم لوگ کھانا کھائیں گے۔ رات کے کھانے کو بہت دیر ہو چکی ہے۔''

لڑکیوں نے امینہ کی نگرانی میں ہاتھ منہ دھویا اور پھر امینہ نے ان کو کھانا لا کر دیا۔ کھانا ٹھنڈا اور بدمزہ تھا لیکن اس وقت وہی غنیمت تھا۔

انہیں کھانا کھلا دینے کے بعد امینہ کمرے سے باہر چلی گئی اور اس نے دروازہ باہر سے بند کر دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اچھا تو تم کو یقین ہے کہ تم نے ان لوگوں کی ہندی میں ہونے والی بات چیت کو صحیح طور پر سمجھ لیا تھا اور یہ کہ ہم واقعی پاکستان میں ہیں؟'' موقع ملتے ہی ماجدہ نے سخت اضطراب کے عالم میں میمونہ سے پوچھا۔

''میں اسکول میں اردو بھی پڑھتی ہوں۔'' میمونہ نے متانت سے جواب دیا۔ ''میں تھوڑی بہت اردو بول اور سمجھ سکتی ہوں۔ اس شخص نے وہی کہا تھا جو میں نے تم لوگوں کو بتایا۔ اس نے ممدو سے کہا تھا کہ وہ ہمیں پاکستان کی سرحد میں تین میل اندر تک چھوڑے گا۔''

''یا اللہ..... ہم کتنی دور آ گئے ہیں۔'' فردوسی نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ ''پاکستان تو بنگلہ دیش سے بہت دور ہے۔ میرے بابا بتاتے ہیں کہ صرف ہوائی جہاز کے ذریعے یا پانی کے جہاز کے ذریعے ہی پاکستان جایا جا سکتا ہے۔ ہم لوگ کس طرح پاکستان آ گئے؟''

''ہم ہندوستان سے گزرتے ہوئے پاکستان آئے ہیں۔'' میمونہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ لوگ ٹرین میں بٹھا کر ہمیں یہاں تک لے آئے ہیں۔''

''تو اب؟'' ماجدہ نے سراسیمگی کے ساتھ کہا۔ ''اور اب کیا ہوگا؟ اب یہ لوگ ہمارے ساتھ کیا کریں گے؟ ہم تو واقعی اپنے گھروں سے بہت دور آ گئے ہیں۔''

''خدا ہی ہماری مشکل آسان کرے گا۔'' فردوسی نے روتے ہوئے کہا۔

گفتگو کا سلسلہ زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکا کیونکہ کھانا کھانے کے بعد تینوں کو بہت زور کی نیند آنے لگی تھی۔ وہ تینوں جلد ہی گہری نیند میں گم ہو گئیں۔

صبح کو کافی دن چڑھے ماجدہ کی آنکھ کھلی۔ اس نے اپنے آپ کو اسی کمرے میں پایا جس میں وہ رات کو تھی، لیکن وہ اس وقت اکیلی تھی۔ فردوسی اور میمونہ کے بستر خالی تھے۔ امینہ بھی کمرے میں موجود نہیں تھی۔

ماجدہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''شاید وہ دونوں ہاتھ منہ دھونے گئی ہوں گی۔'' اس نے دل میں سوچا۔ ''امینہ بھی تو موجود نہیں ہے۔''

اس نے اٹھ کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن دروازہ باہر سے بند تھا۔

''لعنت ہو۔'' اس نے تلملا کر دل ہی دل میں کہا۔ ''نہ جانے سب کے سب کہاں غائب ہو گئے۔''

تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا اور امینہ اندر داخل ہوئی۔ وہ اکیلی تھی۔

''اچھا تو تم اٹھ گئیں۔'' اس نے ماجدہ کو دیکھ کر خوش دلی کے ساتھ کہا۔ ''چلو..... جلدی

سے ہاتھ منہ دھو کر کچھ کھا پی لو۔''

''فردوسی اور میمونہ کہاں ہیں؟'' ماجدہ نے قدرے تشویش کے ساتھ پوچھا۔

''انہیں ان کے گھروں کو روانہ کر دیا گیا ہے۔'' امینہ نے بڑے سرسری انداز میں جواب دیا۔ ''تم کو بھی جلد ہی تمہارے گھر بھیج دیں گے۔''

ماجدہ صدمے اور خوف کے بھاری بوجھ تلے دب کر رہ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ امینہ جھوٹ بول رہی ہے۔ فردوسی اور میمونہ کو ہرگز ان کے گھروں کو نہیں بھیجا گیا ہے اور نہ ہی اس کو اس کے گھر بھیجا جائے گا۔ اگر گھر واپس بھیجنا ہی مقصود ہوتا تو اتنی دور پاکستان تک لانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ اس کی اور اس کی دونوں ساتھیوں کی راہیں جدا جدا ہو چکی ہیں، لیکن بے بسی اور بے چارگی کا وہ عالم تھا کہ وہ اُف بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے رہنے پر مجبور تھی۔

ماجدہ ہاتھ منہ دھو کر آئی تو شاہ میاں اور رات والا آدمی، جس نے دروازہ کھولا تھا کمرے کے اندر آئے۔ وہ اس کے لیے ناشتہ لے کر آئے تھے لیکن ماجدہ ان لوگوں کے اصرار کے باوجود ٹھیک سے کچھ بھی نہ کھا سکی۔ دونوں ساتھیوں کے بچھڑ جانے کا غم اور آنے والے وقت کا خوف اسے کھائے جا رہا تھا۔ اب تک تو یہ لوگ اسے بھگاتے بھگاتے، دوڑاتے دوڑاتے پاکستان تک لے آئے تھے۔ اب اس کے بعد کیا ہونا تھا؟

امینہ ذرا دیر کے لیے کمرے سے باہر چلی گئی تھی اور جب وہ دوبارہ واپس آئی تو ماجدہ اسے دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ امینہ نے ایک سیاہ برقع اوڑھ رکھا تھا، البتہ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔

''لو..... اسے اوڑھ لو۔'' اس نے ایک چھوٹا سا سیاہ برقع ماجدہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ہم اب یہاں سے نکل رہے ہیں۔''

ماجدہ نے اپنے وطن میں برقع پوش عورتیں شاذ و نادر ہی دیکھی تھیں۔ اس کے اپنے گاؤں میں کوئی بھی عورت برقع نہیں اوڑھتی تھی، البتہ جب کبھی وہ کھلنا جاتی تھی تو وہاں کچھ برقع پوش عورتیں نظر آ جاتی تھیں۔ ماجدہ کو برقع اوڑھنا بھی نہیں آتا تھا۔ امینہ نے اس کی مدد کی اور اسے وہ چھوٹا سا برقع اوڑھا دیا جو اس کے جسم کے لحاظ سے مناسب تھا۔ ماجدہ کو سخت وحشت ہونے لگی۔

''یہ ضروری ہے۔'' امینہ نے اس کی پریشانی کو بھانپتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں اس کی ضرورت ہے۔ بس تھوڑے وقت کی بات ہے، جب اپنے گھر پہنچ جاؤ گی تو پھر اسے اتار دینا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

امینہ نے اسے برقع پہنا دیا اور اس کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ دل تو ہر وقت ہی خون کے آنسو روتا رہتا تھا۔ اب میمونہ اور فردوسی کے غائب ہو جانے کے بعد صدمے کے بوجھ میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

امینہ اس کو ساتھ لے کر گھر سے باہر نکل آئی۔ شاہ میاں ان دونوں کے ساتھ تھا۔ ماجدہ کو خیال آیا کہ ممدو نظر نہیں آ رہا ہے۔ اس نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں، اسے ممدو کہیں بھی نظر نہیں آیا۔

''شاید میمونہ اور فردوسی کے ساتھ ممدو بھی کہیں چلا گیا ہے۔'' اس نے دل میں سوچا۔

وہ لوگ گھر سے باہر نکل کر کچھ ہی دیر میں بازار میں آ گئے۔ ماجدہ اپنے اردگرد اب جو زبان سن رہی تھی، وہ اسے کوئی اور ہی زبان لگ رہی تھی، وہ ہندی نہیں تھی، یہ تو کچھ مختلف لگ رہی تھی لیکن یہ بھی ماجدہ کے لیے اتنی ہی ناقابلِ فہم تھی جتنی کہ ہندی اس کے لیے ناقابلِ فہم تھی۔

اسے برقع اوڑھ کر چلنے میں الجھن ہو رہی تھی اور دقت پیش آ رہی تھی لیکن امینہ نے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور وہ اسے سہارا دے رہی تھی۔ وہ اسے صرف سہارا نہیں دے رہی تھی بلکہ اس کو پکڑ کر اپنے ساتھ بھی رکھے ہوئے تھی۔ شاہ میاں بھی ان دونوں کے ساتھ موجود تھا۔

وہ لوگ ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں بہت سی بسیں کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ ان میں سے ایک بس میں سوار ہو گئے۔ بس کا اگلا حصہ عورتوں کے لیے مخصوص تھا۔ امینہ کی ہدایت پر ماجدہ نے نقاب گرالی تھی اور اپنے چہرے کو پورے طور سے چھپا لیا تھا۔

بس میں کچھ عورتیں پہلے سے بیٹھی ہوئی تھیں۔ امینہ نے ماجدہ کو کنارے والی سیٹ پر بٹھا دیا جس کے بعد کوئی سیٹ نہیں تھی اور خود اس کے برابر بیٹھ گئی۔ اب کوئی دوسری عورت ماجدہ کے پاس نہ تو بیٹھی ہوئی تھی نہ بیٹھ سکتی تھی جو اس سے کوئی بات چیت کر سکے۔ بعد میں آنے والی عورتیں امینہ کے برابر بیٹھیں۔

بس مسافروں سے بھرتی چلی جا رہی تھی۔ پچھلے حصے میں جو مردوں کے لیے مخصوص تھا، بہت شور مچا ہوا تھا۔ بہت سے لوگ نہ جانے کیا کیا بول رہے تھے جس کا ایک لفظ بھی ماجدہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پھر کچھ دیر کے بعد بس وہاں سے روانہ ہو گئی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی لامتناہی سفر شروع ہو گیا۔ ماجدہ نے تو کبھی بس کا سفر ہی نہیں کیا تھا، وہ اپنے گاؤں سے زیادہ سے زیادہ کھانا تک جاتی تھی اور وہ بھی کشتی سے۔ کوئی قریب کا سفر درپیش ہوتا تو وہ بھی یا تو پیدل طے ہوتا یا کشتی کے ذریعے طے ہوتا۔

راستے کی گرد اور گرمی سے اس کا دم بولا یا جا رہا تھا اور اوپر سے یہ سیاہ رنگ کا برقع، جس میں اس کا پورا جسم اور چہرہ ڈھکا ہوا تھا۔ امینہ نے خود اپنا منہ تو کھول رکھا تھا لیکن اس کے لیے ہدایت تھی کہ وہ اپنا منہ ڈھانک کر رکھے۔

اذیت ناک سفر کی یہ طویل گھڑیاں بھی جو اس کے نصیبے میں آئی تھیں، کسی نہ کسی طرح گزر گئیں اور بالکل بے خبری کے عالم میں وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گئی جو اب تک کی تمام جگہوں سے بالکل مختلف تھی۔

انسانوں کا ایک سمندر تھا کہ چاروں طرف سے امڈا چلا آ رہا تھا۔ گاڑیاں تھیں کہ جیسے زمین سے اُمڈ رہی تھیں۔ اس قدر شور تھا کہ جیسے آسمان پھٹا پڑ رہا ہو۔ ماجدہ نے اپنی زندگی میں کھلنا سے بڑا کوئی دوسرا شہر نہیں دیکھا تھا اور اب وہ کراچی میں تھی۔

اسے اس بات کا علم اس وقت ہوا کہ وہ کراچی میں ہے، جب امینہ اور شاہ میاں اسے لے کر کراچی کے ایک علاقے موسیٰ کالونی کے ایک مکان میں پہنچے۔ اس مکان کی طرف ٹیکسی میں جاتے ہوئے ماجدہ نے ایک حیرت انگیز اور ناقابلِ تصور دنیا کے راستوں اور بازاروں میں سفر کیا۔ اتنا بڑا شہر..... شہر کیا تھا، قیامت تھی قیامت۔

یہاں بھی ماجدہ کے چاروں طرف جو زبان بولی جا رہی تھی، وہ تقریباً ویسی ہی تھی جیسی زبان وہ ہندوستان کے علاقے میں سنتی چلی آئی تھی۔ البتہ ہندوستان سے پاکستان کی سرحد میں داخل ہونے کے بعد کچھ وقت کے لیے اس نے جو زبان سنی تھی، وہ کچھ الگ الگ سی لگ رہی تھی، لیکن اب اس ہولناک شہر میں داخل ہو جانے کے بعد، جہاں ہر طرف انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آ رہا تھا، اسے ایک بار پھر وہی زبان سنائی دے رہی تھی۔ بنگالی تو کہیں تھی ہی نہیں..... ایک لفظ بھی بنگالی زبان کا سننے کو نہیں مل رہا تھا۔

امینہ نے اس کو سختی کے ساتھ منع کر رکھا تھا کہ وہ راستے میں اس سے کوئی سوال نہ کرے۔ ویسے اگر وہ کوئی سوال کرتی بھی تو امینہ اور شاہ میاں کو اس سے کوئی خطرہ نہیں تھا، کیونکہ ماجدہ صرف بنگالی بول سکتی تھی اور کراچی میں شاید ہی کوئی ٹیکسی ڈرائیور بنگالی ہو۔

یہ چھوٹے چھوٹے مکانوں کی ایک کچی بستی تھی جہاں ماجدہ، امینہ اور شاہ میاں کے ساتھ پہنچی۔

''ہم لوگ اب کراچی میں ہیں۔'' امینہ نے مسکراتے ہوئے ماجدہ سے کہا۔ خوشی اس کے لب و لہجے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ ''یہ جگہ موسیٰ کالونی کہلاتی ہے اور یہاں تمہیں کسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اجنبیت کا احساس نہیں ہوگا۔ یہاں زیادہ تر بنگالی رہتے ہیں۔''

ماجدہ کے دماغ میں وہ باتیں ایک بار پھر سے تازہ ہوگئیں جو اس نے مادھو پور میں اپنے قیام کے آخری دن اپنی سہیلیوں سے سنی تھیں۔ ''کراچی میں بنگالیوں کے کئی علاقے ہیں۔''

ماجدہ کو موسیٰ کالونی کے ایک ایسے مکان میں پہنچا دیا گیا جو کئی چھوٹے چھوٹے کمروں پر مشتمل تھا۔ یہاں ''مہمانوں'' کا خیر مقدم کرنے والوں میں شوکت نامی ایک عورت، سکندر نامی ایک مرد اور شازیہ اور سلیمہ نامی دو نوعمر لڑکیاں شامل تھیں۔ یہ سب لوگ بنگالی تھے اور ''مہمانوں'' سے ان کی گفتگو فوراً ہی بنگالی زبان میں شروع ہوگئی۔

کئی دن کے بعد تمام تر صدمے، تشویش، بے یقینی اور اضطراب کے باوجود ماجدہ کے دل میں اپنی گمشدہ زبان واپس مل جانے کا خوشگوار احساس پیدا ہوا۔ وہ اب ایسے لوگوں کے درمیان تھی جو کم از کم اس کی بات تو سمجھ سکتے تھے اور وہ خود ان کی بات سمجھ سکتی تھی۔

اس کا اس گھر کے لوگوں سے تعارف کروایا گیا اور اسے بتایا گیا کہ فی الحال کچھ دنوں تک اسے ان لوگوں کے ساتھ ہی رہنا ہوگا۔

''مگر میں اپنے گھر واپس جانا چاہتی ہوں۔'' ماجدہ نے بلک بلک کر روتے ہوئے کہا۔

''میں اپنے ماں باپ کے پاس جانا چاہتی ہوں۔''

''چلی جانا..... چلی جانا۔'' شوکت نے کہا۔ ''ایک دن ہم تمہیں ضرور تمہارے گھر بھیج دیں گے۔ فی الحال تو یہی تمہارا گھر ہے۔''

ماجدہ کی ساری گریہ وزاری بیکار گئی، جس طرح اب تک بے کار گئی تھی اور اب تو وہ اپنے گھر سے اتنی دور چلی آئی تھی کہ ان حالات کو قبول کر لینے کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

اس رات امینہ شوکت اور شاہ میاں نے اسے پاس بٹھا کر بہت سی باتیں سمجھائیں۔ ان کا انداز صرف سمجھانے والا نہیں تھا۔ اس میں دھمکی بھی شامل تھی۔

''دیکھو..... اگر کوئی بھی تم سے پوچھے کہ تم یہاں کس طرح آئی ہو، تو یہ ہرگز مت کہنا کہ تم کو تمہاری مرضی کے خلاف یہاں لایا گیا ہے بلکہ تم یہ کہنا کہ تمہارے والدین نے تمہیں کام کرنے کے لیے یہاں بھیجا ہے۔ تم یہاں نوکری کرو گی اور پیسے جمع کرو گی۔ یہاں کی پولیس بڑی ظالم ہے۔ وہ غیر قانونی طور پر آنے والے بنگلہ دیشیوں کو پکڑ کر جیل میں بند کر دیتی ہے اور ان کو سخت سزائیں دیتی ہے۔ پھر وہ لوگ برسوں تک جیل میں بند پڑے رہتے

ہیں۔ اگر پولیس کو پتہ چل گیا کہ تم غیر قانونی طور پر یہاں آئی ہو تو سمجھ لو کہ باقی زندگی جیل میں سڑتے ہوئے گزارنی ہوگی۔''

نو سالہ دیہاتی لڑکی ماجدہ قانونی اور غیر قانونی طریقوں سے آمد و رفت کی باریکیوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی، لیکن وہ پولیس اور جیل کے نام سے سخت خوفزدہ ہوگئی۔ اسے یاد تھا کہ دو سال پہلے اس کے گاؤں کے ایک آدمی کو، جس پر ایک بڑے سرکاری افسر کے گھر میں چوری کا الزام تھا۔ پولیس والوں نے پکڑ کر تھانے میں اتنا مارا تھا کہ وہ مر گیا تھا۔ اس کے بعد گاؤں میں سخت خوف و ہراس اور اس کے ساتھ ہی غم و غصہ پھیل گیا تھا۔ اس شخص کی بیوی اس کی موت کے چھ ماہ بعد ملیریا میں مبتلا ہو کر مر گئی تھی۔

ماجدہ ابھی مرنا نہیں چاہتی تھی۔

''شاید..... شاید..... کبھی کوئی راستہ نکل آئے۔'' اس کے ننھے سے دماغ میں امید کی جو لو روشن تھی، اس کو اس نے گل نہیں ہونے دیا لیکن خوف کے مارے اس نے اپنی زبان بند ہی رکھنے کا فیصلہ کیا۔

اگلے دن اس نے گھر کے ایک کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے شاہ میاں کو ایک باوردی پولیس والے کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ لوگ بہت آہستہ آہستہ آپس میں کچھ گفتگو کر رہے تھے۔

خوف کی ایک تیز و تند لہر ماجدہ کے سارے وجود میں دوڑ گئی۔ وہ جلدی سے کھڑکی کے پاس سے ہٹ آئی۔ اس کا دل بُری طرح سے دھڑک رہا تھا۔ شاہ میاں پولیس والے سے نہ جانے کیا بات کر رہا تھا..... کہیں پولیس والا اسے پکڑ کر جیل میں نہ بند کر دے۔

ذرا دیر بعد شاہ میاں واپس گھر میں آ گیا اور ماجدہ نے یہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا کہ وہ اکیلا تھا۔ پولیس والا اس کے ساتھ نہیں تھا۔

چند دن کے بعد شاہ میاں اور امینہ وہاں سے چلے گئے۔ ان چند دنوں کے دوران بھی شاہ میاں کا خاصا وقت گھر سے باہر گزرتا تھا۔ اکثر وہ اور سکندر ساتھ ساتھ گھر سے باہر نکل جاتے تھے۔ امینہ بھی اکثر گھر سے باہر رہتی تھی۔ جانے سے پہلے امینہ نے ماجدہ سے کہا۔ ''میں اور شاہ میاں اب کچھ عرصے کے لیے یہاں سے جا رہے ہیں۔ تم اپنی شوکت چاچی اور سکندر چاچا کے ساتھ آرام سے رہنا۔ ہم جلد ہی واپس آئیں گے اور پھر تم کو تمہارے گھر لے چلیں گے۔''

ماجدہ اس جھوٹ پر بے بسی کے ساتھ رونے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

موسیٰ کالونی کی گندی میلی کچیلی بستی ماجدہ کو بالکل پسند نہیں آئی۔ شوکت کا گھر جس جگہ واقع تھا، وہاں قریب ہی ایک گندے پانی کا نالہ بہتا تھا جس کی بدبو ہر وقت گھر میں بسی رہتی تھی۔ ماجدہ کو اپنے گاؤں کی لہریں مارتی ہوئی ندی اور ہریالی کس قدر یاد آتی تھی۔

یہ بات تو اسے پہلے سے معلوم تھی کہ پاکستان کی زبان اردو ہے۔ ستارہ آپا نے اسے اس کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ عربی کی طرح سیدھے ہاتھ کی طرف سے لکھی جاتی ہے اور اب وہ پاکستان میں تھی..... کراچی میں، جہاں اردو بولی جاتی تھی۔

شازیہ اور سلیمہ دونوں سگی بہنیں تھیں۔ شازیہ تقریباً گیارہ سال کی تھی اور سلیمہ اس سے ایک سال چھوٹی تھی۔ انہوں نے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ آج سے تقریباً پانچ سال پہلے اپنے والدین کے ساتھ بنگلہ دیش کے شہر فرید پور سے کراچی آئی تھی۔ وہ لوگ بہت غریب تھے اور ان کے پاس کھانے کو بھی نہیں تھا۔ دونوں میاں بیوی اپنی دونوں بچیوں کو لے کر تلاش معاش میں کراچی آ گئے تھے۔

''ہمارے والد نے ایجنٹوں کو بھاری رقم دینے کے لیے ہمارا مکان بیچ دیا اور ہماری ماں کے زیور بیچ دیئے۔'' انہوں نے بتایا۔ ''پھر ایجنٹوں نے ہمیں بنگلہ دیش سے نکال کر ہندوستان اور وہاں سے پاکستان پہنچایا۔ اپنے سفر کے بارے میں ان لڑکیوں کو جو کچھ یاد تھا وہ انہوں نے جب ماجدہ کو بتایا تو ماجدہ کو اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے کئی سوالوں کے جوابات مل گئے۔ اسے اور میمونہ اور فردوسی کو اس قافلے کے لوگوں سے اس لیے الگ رکھا گیا تھا کیونکہ وہ قافلہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جو اپنی مرضی سے ایجنٹوں کو یقیناً پیسہ دے کر پاکستان جا رہے تھے، جس طرح شازیہ اور سلیمہ کے والدین آئے تھے۔ اس لیے ایجنٹوں کو ان سے کوئی خوف نہیں تھا، جبکہ ماجدہ اور میمونہ اور فردوسی کو ان کی مرضی کے خلاف زبردستی پکڑ کر لایا گیا تھا اور ایجنٹوں کو ڈر تھا کہ وہ کہیں کسی سے مدد نہ مانگ لیں۔ اس لیے ان کو قافلے کے دوسرے لوگوں سے الگ رکھا گیا اور ہندوستان میں داخل ہونے کے بعد انہیں الگ الگ ٹرینوں سے روانہ کیا گیا۔ ماجدہ کو وہ ہنس مکھ، خوبصورت عورت ایک بار پھر یاد آئی جس نے ان لڑکیوں سے بات کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن نورو نے اسے ڈانٹ کر بھگا دیا تھا۔

ماجدہ کا ننھا سا ذہن اس داستان کے بہت سے خفیہ پیچ و خم کو سمجھ رہا تھا لیکن ابھی تو بہت کچھ سمجھنا باقی تھا۔

شازیہ اور سلیمہ نے بتایا کہ کراچی آتے ہی ان کے باپ کو ایک ٹھیکے دار کے پاس نوکری

مل گئی تھی اور ماں کو ایک قریبی بنگلے میں کام مل گیا تھا۔ وہ سب لوگ یہیں موسیٰ کالونی میں رہتے تھے لیکن صرف ایک سال کے بعد ہی ان دونوں کا سڑک پر ٹریفک کے ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ شازیہ اور سلیمہ اکیلی رہ گئیں۔ اس شہر میں ان کا اور کوئی عزیز نہیں تھا۔ تب شوکت نے انہیں گھر میں پناہ دی اور انہیں اپنے ساتھ رکھ لیا۔ شوکت اور اس کا میاں سکندر انہیں اپنی بیٹیاں کہتے تھے۔ وہ دونوں انہیں امی اور ابو کہتی تھیں۔

''دو سال پہلے تک دو اور لڑکیاں بھی امی اور ابو کے ساتھ رہتی تھیں۔'' شازیہ نے کہا۔ ''وہ بنگلہ دیش سے پاکستان آتے ہوئے اپنے قافلے سے بچھڑ گئی تھیں۔ کسی نیک دل انسان نے انہیں یہاں کراچی میں ابو کے پاس پہنچا دیا۔ وہ کئی سال تک یہاں رہیں پھر ابو اور امی نے ان کی شادی کرا دی اور وہ یہاں سے چلی گئیں۔''

''شادی کرا دی؟'' ماجدہ نے چونک کر کہا۔ ''کس کے ساتھ؟''

''معلوم نہیں.....'' شازیہ نے کہا۔ ''ہم نے ان کے شوہروں کو نہیں دیکھا۔ نکاح کہیں اور ہوا تھا اور ان کے شوہر ان کو ساتھ لے گئے تھے۔''

''تو..... وہ یہاں کبھی آتی تو ہوں گی؟'' ماجدہ نے پوچھا۔

''نہیں۔'' سلیمہ نے کہا۔ ''ہم نے ان کو یہاں پھر کبھی نہیں دیکھا۔ امی کہتی ہیں کہ ان کے شوہر بہت امیر ہیں اور وہ ان کے گھروں میں عیش کر رہی ہیں۔''

شازیہ اور سلیمہ دونوں موسیٰ کالونی کے قریب واقع ایک بنگلے میں جھاڑو برتن وغیرہ کا کام کرتی تھیں اور یہاں سے انہیں جو تنخواہ ملتی تھی، وہ لا کر شوکت کو دے دیتی تھیں۔

''ہمیں وہاں سے بہت کچھ ملتا ہے۔'' شازیہ نے کہا۔ ''کپڑے بنانے اور جوتے خریدنے کی تو ہمیں ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ بیگم صاحبہ اور ان کی بیٹیاں ایسے نئے نئے سوٹ ہمیں دے دیتی ہیں کہ بس دیکھتے ہی رہو..... اور بھی کتنی چیزیں ان سے ملتی رہتی ہیں..... تنخواہ تو بس مفت کی ہی سمجھو.....''

☆======☆======☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنی آمد کے بعد سے ماجدہ نے اپنے آپ کو ان دونوں بہنوں شازیہ اور سلیمہ کے ہی زیادہ قریب پایا تھا۔ ان دونوں نے اپنے بارے میں ماجدہ کو سب کچھ بتا دیا تھا۔

ماجدہ اپنی آمد کے بعد کئی روز تک بہت زیادہ سہمی ہوئی رہی تھی اور اس نے شازیہ اور سلیمہ کو اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا جبکہ شازیہ اور سلیمہ اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا چکی تھیں۔ شازیہ اور سلیمہ کو اس کے بارے میں شوکت اور سکندر نے صرف یہی بتایا تھا کہ وہ امینہ اور شاہ میاں کے ساتھ بنگلہ دیش سے یہاں آئی ہے اور یہاں نوکری کرے گی اور یہیں رہے گی۔ شازیہ اور سلیمہ نے خود ماجدہ سے اس کے بارے میں تفصیلات نہیں پوچھی تھیں، کیونکہ ابھی ان کے درمیان اجنبیت کے پردے حائل تھے لیکن چند دن کے اندر اندر جب اجنبیت کے یہ پردے اٹھنے لگے تو شازیہ اور سلیمہ نے ماجدہ سے اس کے بارے میں تفصیلات پوچھیں۔

ماجدہ بہت خوفزدہ تھی۔ وہ ایک اجنبی سرزمین پر اجنبی لوگوں کے درمیان تھی، جہاں کوئی بھی اس کا اپنا نہیں تھا۔ ان سب لوگوں نے اسے یہ کہہ کر بہت زیادہ ڈرا دیا تھا کہ اگر پولیس کو یہ معلوم ہو گیا کہ وہ غیر قانونی طور پر بنگلہ دیش سے پاکستان آئی ہے تو پولیس اس کو پکڑ لے گی اور جیل میں بند کر دے گی، جہاں سے اس کو چھڑانے والا کوئی نہیں ہو گا۔ تاہم اس نے اپنے بارے میں بتاتے ہوئے دبے دبے اور مبہم الفاظ میں شازیہ اور سلیمہ کو یہ بتا دیا کہ شاہ میاں اور امینہ اسے اس کی مرضی کے خلاف بنگلہ دیش سے یہاں لائے ہیں اور وہ اپنے گھر واپس جانا چاہتی ہے۔

''شاہ میاں چاچا اور امینہ چاچی آج سے کوئی ڈیڑھ دو سال پہلے بھی یہاں آئے تھے۔'' شازیہ نے کہا۔ ''تب ہم نے انہیں پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ کئی دن تک یہاں رہے تھے پھر واپس

چلے گئے تھے۔ امی نے بتایا تھا کہ وہ کاروباری لوگ ہیں اور اکثر بنگلہ دیش سے پاکستان آتے رہتے ہیں۔''

''وہ لوگ کیسے بھی کیوں نہ ہوں، لیکن امی اور ابو بہت اچھے ہیں۔'' سلیمہ نے کہا۔ ''انہوں نے ہمارا خیال کیا اور ہمیں سہارا دیا۔ اب تم یہاں رہو گی تو وہ تمہارا بھی خیال کریں گے۔ امی ہم لوگوں سے کہہ رہی تھیں کہ ہم بھی تمہارا خیال رکھیں۔''

اس سے اگلے دن شوکت اور سکندر نے ماجدہ کو بلا کر اپنے پاس بٹھایا۔ سلیمہ اور شازیہ اس وقت بنگلے پر کام کرنے گئی ہوئی تھیں۔

''دیکھو بیٹی۔'' شوکت نے اس کو سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''تم نے شازیہ اور سلیمہ کو یہ بتایا ہے کہ تم کو تمہاری مرضی کے خلاف یہاں لایا گیا ہے۔ اس بات کے ذکر سے اب کوئی فائدہ نہیں ہے، بلکہ سراسر تمہارا ہی نقصان ہے۔ شاہ میاں اور امینہ تم کو کس طرح یہاں لائے ہمیں نہیں معلوم لیکن اب جبکہ وہ تم کو ہمارے حوالے کر گئے ہیں، تو ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم تمہاری پرورش کریں اور تم کو خوش رکھیں۔ تم کو معلوم ہے کہ سلیمہ اور شازیہ بھی ہماری سگی بیٹیاں نہیں ہیں لیکن ہم نے اپنی بیٹیوں کی طرح انہیں اپنے ساتھ رکھا ہے۔ اسی طرح ہم تمہیں بھی رکھیں گے۔ امینہ اور شاہ میاں کو بھول جاؤ اور کسی سے بھی اس معاملے کے بارے میں کچھ نہ کہو۔ ہم نے تم کو پہلے بھی بتایا تھا کہ اگر پولیس کو پتہ چل گیا کہ تم غیر قانونی طور پر پاکستان آئی ہو تو وہ لوگ تم کو جیل میں بند کر دیں گے اور تمہاری زندگی تباہ ہو جائے گی۔ تمہیں نہیں معلوم، کراچی کی جیل میں کتنے بنگلہ دیشی مرد اور عورتیں برسوں سے بند پڑے ہیں جو غیر قانونی طور پر پاکستان آئے تھے اور کوئی ان کو پوچھنے والا نہیں ہے۔ اگر تم بھی ان لوگوں میں شامل ہونا چاہتی ہو تو تمہاری مرضی..... ہم تو تمہاری بھلائی چاہتے ہیں۔''

''میں اپنے گھر واپس جانا چاہتی ہوں۔'' ماجدہ نے روتے ہوئے کہا۔ ''یہ لوگ مجھے زبردستی اٹھا لائے ہیں۔ میں اپنے ماں باپ کے پاس واپس جانا چاہتی ہوں۔''

''اس کے لیے تمہیں انتظار کرنا ہو گا؟'' سکندر نے نرمی کے ساتھ کہا۔ ''ہم کوئی موقع دیکھ کر تم کو تمہارے گھر بھیج دیں گے۔ مگر تمہیں صبر سے انتظار کرنا ہو گا۔ ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں، تم کو ضرور تمہارے گھر واپس بھجوا دیں گے لیکن ابھی تم اپنی زبان بند رکھو.....''

ماجدہ سخت ذہنی اذیت اور پریشان خیالی کا شکار ہو گئی تھی۔ ان لوگوں کا رویہ اسے خاموشی اختیار کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

موسیٰ کالونی میں اگرچہ بنگالی کافی بڑی تعداد میں آباد تھے، تاہم یہاں دوسری قومیتوں کے لوگ بھی کافی تھے جو مختلف زبانیں بولتے تھے لیکن ان سب کے درمیان اردو مشترکہ زبان تھی۔ طرح طرح کے سودے بیچنے والے آتے تھے، ٹھیلے والے آتے تھے، سبزی فروش اور ثمر فروش آتے تھے جو گلیوں میں آوازیں لگاتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے دکاندار تھے، دوسرے آنے جانے والے لوگ تھے، وہ سب اردو بولتے تھے، اپنی آمد کے پہلے دن سے ہی ماجدہ اردو کے کئی الفاظ سے واقف ہوگئی تھی جو یہاں بنگالی لوگ بولتے تھے۔

پھر تقریباً ایک ماہ کے اندر اندر اس نے اردو کے اور بھی بہت سے الفاظ سیکھ لیے۔ اس کی ملاقات پاس پڑوس کے کئی اور بنگالی گھرانوں کی عورتوں سے بھی ہوئی اور سکندر اور شوکت کی سخت ہدایات کے تحت اس نے اپنے بارے میں یہی بتایا کہ وہ شوکت کی رشتے دار ہے اور بنگلہ دیش سے آئی ہے۔ بے یقینی اور شدید خوف کی فضا اسے اس کے علاوہ اور کچھ کہنے کی اجازت ہی نہیں دیتی تھی۔

شازیہ اور سلیمہ، دونوں ایک ہی بنگلے میں کام کرتی تھیں جو موسیٰ کالونی کے قریب ہی واقع تھا۔ وہ دونوں وہاں چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال اور خدمت پر مامور تھیں اور صبح نو بجے سے لے کر شام کے چھ بجے تک وہاں رہتی تھیں۔ دوپہر کا کھانا انہیں بنگلے سے ہی ملتا تھا اور شام کو جب وہ کام ختم کر کے اپنے گھر واپس آتی تھیں تو اکثر سامان سے لدی پھندی ہوتی تھیں۔ بیگمات بچا ہوا کھانا ان کے حوالے کر دیتی تھیں، جسے وہ گھر لے آتی تھیں۔ اکثر کھانے کے علاوہ پھل وغیرہ بھی انہیں مل جاتے تھے۔

ماجدہ نے یہاں ایسے ایسے کھانے کھائے جو اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں کھائے تھے اور جن کے لذت آمیز ذائقے سے وہ بالکل ناواقف تھی۔ یہاں آ کر اسے معلوم ہوا کہ صرف چاول اور مچھلی ہی واحد نعمت نہیں ہے، بلکہ یہ دنیا طرح طرح کی نعمتوں سے بھری پڑی ہے۔ اس نے یہاں ایسے ایسے پھل کھائے جو اس کے مادھو پور میں کہیں دیکھنے کو بھی نہیں ملتے تھے۔ وہ تو ان کے ذائقے سے تو درکنار، ان کے ناموں تک سے ناواقف تھی۔

شازیہ اور سلیمہ کی لائی ہوئی نعمتیں اس گھر کے دسترخوان کا اہم حصہ تھیں۔ عام طور سے ہر دوسرے تیسرے دن کافی کھانا اور پھل وغیرہ آ جاتے تھے۔

ماجدہ نے دیکھا کہ سلیمہ اور شازیہ کے پاس بہت عمدہ عمدہ کپڑوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ ہر روز دوسرے کپڑے پہن کر کام پر جاتی تھیں اور ان کے یہ کپڑے قیمتی اور بہت اچھے

ہوتے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی کپڑا ان کا اپنا خریدا ہوا یا سلوایا ہوا نہیں تھا۔ یہ سارے کپڑے انہیں اس بنگلے سے مل جاتے تھے جہاں وہ کام کرتی تھیں۔ وہ بتاتی تھیں کہ وہاں کی بیگمات کے پاس تو نئے نئے کپڑوں کے انبار لگے رہتے تھے۔ ان کی الماریاں طرح طرح کے قیمتی ملبوسات سے بھری رہتی تھیں اور جو سوٹ بھی ان کی نظروں سے اتر جاتا تھا یا جس کا ڈیزائن نئے فیشن کے مطابق نہیں ہوتا تھا، اسے وہ اٹھا کر کسی ملازمہ کو دے دیتی تھیں۔ ماجدہ یہ سب کچھ سن سن کر اور دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی تھی۔ یہاں لوگوں کے پاس نہ جانے کس قدر پیسہ تھا۔

سلیمہ اور شازیہ کے دو ایک سوٹ جو انہیں بیگمات کی طرف سے ملے تھے، ماجدہ کو دے دیئے گئے۔ ماجدہ کے پاس کوئی کپڑے ہی نہیں تھے۔ وہ تو بس ایک جوڑے میں بنگلہ دیش سے کراچی تک آ گئی تھی جسے دھونے تک کا موقع اسے نہیں مل سکا تھا، لیکن یہاں آ کر اسے بہت قیمتی اور نفیس کپڑے مل گئے۔ اس نے جب پہلی بار سلیمہ کا ایک سوٹ اپنے بدن پر ڈالا تو وہ خود کو کسی شہزادی کی طرح لگی۔ گھر میں ایک پرانی سی ڈریسنگ ٹیبل موجود تھی جس میں قدِ آدم آئینہ لگا ہوا تھا جو اگرچہ زنگ سے کافی دھندلا گیا تھا، پھر بھی اس میں شکل کسی حد تک صاف نظر آتی تھی۔ ماجدہ نے جب ان ''نئے'' کپڑوں میں اپنے آپ کو دیکھا تو وہ خود کو پہچان نہیں سکی۔ یہ کپڑے اس پر بہت اچھے لگ رہے تھے۔ اس نے زندگی میں کبھی اس قدر اچھے اور قیمتی کپڑے نہیں پہنے تھے۔ ان کے مقابلے میں اس کے پرانے کپڑے تو جیسے چیتھڑے لگتے تھے۔

لیکن اس نے ان کپڑوں کو پھینکا نہیں، بلکہ انہیں بہت سنبھال کر رکھ لیا۔ ان کپڑوں میں اس کے وطن کی مٹی کی خوشبو تھی۔ ان کپڑوں سے اس کے گھر کی، والدین کی اور ہاشم کی یادیں وابستہ تھیں۔ اگرچہ وقت بڑی تیزی سے بدل رہا تھا، حالات زندگی بدل رہے تھے لیکن اپنوں سے دوری کا دکھ اور دیارِ غیر میں رہنے کی مجبوری نے دل میں جو ناسور ڈالے تھے وہ برابر رستے رہتے تھے۔ ایک امید تھی، موہوم سی امید..... شاید کبھی کچھ ہو جائے۔

ایک ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ شوکت نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ اس کے لیے کہیں کام تلاش کر رہی ہے اور عنقریب اس کو بھی کام کرنا پڑے گا۔

''میں، مَیں کیسے کام کر سکوں گی شوکت چاچی؟'' ماجدہ نے گھبرا کر کہا۔ ''مجھے تو اردو نہیں آتی۔ بیگم صاحبہ مجھ سے جو کچھ کہیں گی، وہ میں نہ سمجھ سکوں گی نہ کر پاؤں گی۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کرلوگی، سب کرلوگی۔'' شوکت نے کہا۔''شروع شروع میں سب کے ساتھ ایسا ہوتا ہے مگر بعد میں سب سیکھ جاتے ہیں، تم بھی سیکھ جاؤ گی۔''

اس کے چند روز کے بعد ہی صبح کے وقت شوکت اسے ساتھ لے کر موسیٰ کالونی کے قریب ہی واقع ایک بنگلے میں گئی۔ بنگلے کو باہر سے دیکھ کر ہی وہ دہشت زدہ ہوگئی۔ بہت بڑا بنگلہ تھا۔ اس کی سامنے کی دیوار دور تک چلی گئی تھی۔ لوہے کا سیاہ رنگ کا بھاری بھرکم گیٹ تھا جس میں آنے جانے کے لیے ایک کھڑکی لگی ہوئی تھی جو اندر سے بند تھی۔ شوکت کے کھٹکھٹانے پر وہ کھڑکی کھل گئی اور اسے بھاری بھرکم، بڑی بڑی مونچھوں والے ایک آدمی کا چہرہ نظر آیا۔ شوکت نے اس سے اردو میں کچھ بات کی اور اس آدمی نے ان دونوں کو اندر بلا لیا۔

''یہ اس بنگلے کا چوکیدار ہے۔'' شوکت نے ماجدہ کو بتایا۔''اس کا نام شیراز خاں ہے۔''

ماجدہ نے گیٹ میں داخل ہو کر بنگلے میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں اور اس کا سر چکرانے لگا۔ وسیع و عریض احاطے میں ایک جانب تین نئی نئی جگمگاتی ہوئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ایک آدمی کپڑا ہاتھ میں لیے ایک گاڑی صاف کر رہا تھا۔ ایک دوسرا آدمی پائپ سے لان کی گھاس میں پانی ڈال رہا تھا۔

بنگلہ بہت بڑا تھا اور سامنے ہی جو وسیع برآمدہ تھا، اس میں بہت سی کرسیاں اور صوفے پڑے ہوئے تھے۔ ماجدہ ہر چیز کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

ایک عورت نے جو سامنے برآمدے میں ہی موجود تھی، شوکت سے اردو میں کچھ بات کی اور شوکت ماجدہ کے ساتھ برآمدے میں داخل ہو کر ایک طرف کو کھڑی ہوگئی۔ وہ عورت اندر چلی گئی۔

ذرا دیر کے بعد ایک خوبصورت اور جوان العمر عورت ایک دو سالہ بچی کو گود میں لیے ہوئے برآمدے میں آئی۔ اس کے جسم پر خوبصورت لباس تھا اور وہ ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں اور کانوں میں سونے کے بڑے بڑے بُندے پہنے ہوئے تھی۔ شوکت نے جلدی سے اسے سلام کیا اور ماجدہ کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہا۔ وہ غور سے ماجدہ کو دیکھنے لگی اور پھر شوکت اور اس عورت میں گفتگو شروع ہوگئی جسے ماجدہ بہت کم سمجھ پا رہی تھی۔

وہ زیادہ تر باتوں کو اس وقت سمجھ سکی جب وہ عورت اسے اور شوکت کو لیے ہوئے بنگلے کے اندرونی حصے میں گئی اور وہ لوگ ایک کمرے میں پہنچ گئے۔ ماجدہ کو تو پہلی نظر میں یہ کمرہ

ہی لگا تھا مگر یہ عام کمروں سے بالکل مختلف تھا۔ یہ ایک بڑا سا کمرہ تھا، خوب روشن اور صاف ستھرا، اس میں لکڑی کی چھوٹی چھوٹی خوبصورت الماریاں تھیں اور دیواروں پر ٹائلز لگے ہوئے تھے جن میں پھلوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ ایک طرف ایک اونچا چولہا رکھا ہوا تھا، جو ایک نہیں بلکہ کئی چولہوں پر مشتمل معلوم ہوتا تھا۔ ان میں سے دو جل رہے تھے اور ان پر ہانڈیاں سنسنا رہی تھیں۔ درمیانہ عمر کی وہی عورت جو ابھی آئی تھی چولہے کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔

کچھ دیر کے بعد ہی ماجدہ سمجھ سکی کہ یہ باورچی خانہ تھا۔ اس کی عقل حیران تھی کہ باورچی خانہ ایسا بھی ہوسکتا ہے۔

بیگم نے ماجدہ کی طرف اشارہ کر کے اس عورت سے کچھ بات کی اور پھر بیگم، شوکت اور اس عورت کے درمیان گفتگو ہوتی رہی۔ شوکت کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خاصی خوش اور مطمئن ہے۔ کچھ دیر کے بعد وہ لوگ باورچی خانے سے نکل آئے۔ بیگم کسی کمرے کے اندر غائب ہوگئی اور جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں کچھ نوٹ تھے جو اس نے شوکت کو دیئے۔ ان کے درمیان کچھ باتیں ہوئیں اور شوکت اور ماجدہ وہاں سے باہر آ گئیں۔

''تمہیں کل سے یہاں باورچی خانے میں کام کرنے کے لیے آنا ہے۔'' شوکت نے اسے بتایا۔''یہاں باورچی خانے میں جو عورت کام کرتی ہے اور جو وہاں موجود تھی اس کی مدد کے لیے ایک لڑکی کی ضرورت ہے۔ اس عورت کا نام نجمہ ہے۔ وہ تمہیں سارا کام سکھا دے گی۔ بس تم اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرتی رہنا۔''

''میں کوشش کروں گی۔'' ماجدہ نے آہستہ سے کہا۔

''تم شازیہ اور سلیمہ کے ساتھ ہی گھر سے یہاں تک آ جانا۔'' شوکت نے کہا۔''وہ دونوں تمہیں چھوڑتی ہوئی آگے چلی جائیں گی۔ تمہیں تین بجے تک ڈیوٹی دینی ہوگی۔ تین بجے میں خود آ کر تم کو لے جاؤں گی۔ ابھی تمہیں راستوں وغیرہ کا ٹھیک سے پتہ نہیں۔''

شوکت نے اس گھر کی بیگم سے جو روپے لیے تھے ان کے بارے میں اس نے ماجدہ کو کچھ نہیں بتایا اور نہ ہی یہ بتایا کہ اس کو کیا تنخواہ ملے گی۔

اگلے دن وہ سلیمہ اور شازیہ کے ساتھ اس بنگلے تک پہنچی۔ سلیمہ اور شازیہ جہاں کام کرتی تھیں، وہ جگہ اس سے آگے تھی۔

ماجدہ کا پہلا دن کچھ زیادہ خوشگوار نہیں گزرا۔ وہ اور نجمہ ایک دوسرے کی بات سمجھ نہیں پا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہے تھے۔ تاہم ماجدہ نے اٹھا دھری کے کام خوب کیے اور نجمہ کے اشاروں کو سمجھتے ہوئے اس کی بہت مدد کی۔ نجمہ اس کی مستعدی اور چوکسی سے خوش ہوئی۔

تین بجے شوکت اسے لینے آ گئی۔

اگلے دو ماہ کے اندر اندر ماجدہ نے نہ صرف یہ کہ کافی کام سیکھ لیا بلکہ وہ اردو بھی خاصی سمجھنے لگی۔ اسے کھانوں میں استعمال ہونے والی تمام چیزوں کے، سبزیوں کے اور پھلوں وغیرہ کے نام یاد ہو گئے، برتنوں کے نام یاد ہو گئے اور وہ زیادہ بہتر طور پر کام کرنے لگی۔ اب وہ نجمہ اور گھر کی بیگم اور دوسرے لوگوں سے ٹوٹی پھوٹی اردو میں بات چیت بھی کر لیتی تھی۔

ماجدہ کو موسیٰ کالونی میں رہتے ہوئے چھ ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ اس عرصے کے دوران اس کے لیے زبان کا مسئلہ کافی حد تک حل ہو چکا تھا۔ وہ اردو میں اپنا مافی الضمیر بڑی حد تک بیان کر سکتی تھی اور دوسروں کی بات سمجھ سکتی تھی۔

اس تمام عرصے کے دوران گھر کی یاد اس کا سب سے زیادہ اہم اور قیمتی سرمایہ بنی رہی۔ اگرچہ اب گزرے ہوئے مناظر پر آہستہ آہستہ وقت کی دھول جمنی شروع ہو گئی تھی اور زندگی کی موجودہ نوعیت اور مصروفیات اس کے وجود پر حاوی ہوتی جا رہی تھی، لیکن جس دکھ کو وہ اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔ اس سے تو چھٹکارا پانے کی کوشش کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی تھی۔

اس نے جب سے بنگلے میں کام کرنا شروع کیا تھا، تب سے اس پر زندگی کے بہت سارے نئے اور نامعلوم گوشوں کا انکشاف ہوا تھا۔ وہ جس بنگلے میں کام کر رہی تھی، اس کے مالک کے بارے میں شوکت نے اسے بتایا تھا کہ اس کا موٹروں کے پُرزے فروخت کرنے کا بہت بڑا کاروبار ہے اور شہر میں اس کی دو دکانیں ہیں اور اس ایک مکان کے علاوہ، جس میں وہ رہتا ہے اس کے کئی اور مکانات بھی ہیں۔ وہ بہت دولت مند آدمی تھا۔

ماجدہ حیرت کے ساتھ دیکھتی تھی کہ اس گھر میں صرف چار افراد رہتے تھے۔ ایک تو صاحب خود ایک بیگم اور دو بچے..... بڑا لڑکا تقریباً چھ سال کا تھا اور چھوٹی لڑکی کوئی دو سال کی، لیکن نوکر اس مکان میں پانچ تھے جو اب ماجدہ کو ملا کر چھ ہو گئے تھے۔ ایک ڈرائیور تھا، ایک چوکیدار، ایک مالی تھا، ایک آدمی گھر کی صفائی ستھرائی کرنے اور باہر کے کاموں کے لیے تھا۔ ایک عورت باورچی خانے میں کام کرتی تھی اور اب ماجدہ بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئی تھی۔ نوکروں کی تعداد گھر کے مکینوں سے زیادہ تھی۔ گھر اندر سے اس قدر بڑا تھا کہ ماجدہ کو اس کے بڑے بڑے کمروں سے خوف آتا تھا۔ یہ بڑے بڑے کمرے طرح طرح کے ایسے

قیمتی اور اعلیٰ درجے کے ساز و سامان سے بھرے ہوئے تھے جو ماجدہ کی نظروں سے پہلے کبھی نہیں گزرا تھا، مگر زیادہ تر کمرے خالی پڑے رہتے تھے۔

اس عظیم الشان مکان کے مقابلے میں ماجدہ موسیٰ کالونی کے گھروندوں جیسے چھوٹے چھوٹے کچے پکے اور گندے گھروں کو دیکھتی، شوکت اور سکندر کے گھر کو دیکھتی جس کے قریب سے گندے پانی کا نالہ گزرتا تھا۔ مادھو پور میں اپنے گم گشتہ گھر کو یاد کرتی اور گاؤں کے دوسرے گھروں کو یاد کرتی تو اسے احساس ہوتا کہ اس ایک دنیا میں بیک وقت کتنی بہت سی دنیائیں آباد ہیں اور وہ ساری کی ساری دنیائیں ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہیں۔ موسیٰ کالونی سے اس بنگلے تک جہاں ماجدہ کام کرتی تھی، بہت زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ وہ پیدل ہی آتی جاتی تھی لیکن ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتے ہی جیسے زمین کے تیور بدل جاتے تھے، آسمان کے رنگ بدل جاتے تھے، ہواؤں کے رخ بدل جاتے تھے۔

گھر میں نوکروں کو ملا کر کل دس افراد تھے لیکن کھانا ہمیشہ دس سے زیادہ افراد کا پکتا تھا۔ اکثر مہمان آتے رہتے تھے جو زیادہ تر رات کو آتے تھے اور کھانا بھی کھاتے تھے۔

ماجدہ کی ہم عمر کوئی لڑکی اس گھر میں موجود نہیں تھی۔ تاہم بیگم نے اپنے کئی بڑے عمدہ اور قیمتی شلوار سوٹ ماجدہ کو دے دیئے اور اس سے کہا کہ وہ شوکت سے کہہ کر ان کو اپنے سائز کے مطابق بنوا لے۔ کھانے کو تو اتنا ملتا تھا کہ ماجدہ نے زندگی میں کھانے کی اس قدر فراوانی نہیں دیکھی تھی۔ نجمہ اس سے کہتی تھی، جتنا کھانا چاہتی ہو کھا لو..... جی بھر کے کھا لو، مگر کبھی چوری نہ کرنا۔ مجھے چوری سے سخت نفرت ہے۔

ماجدہ کو چوری کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ باورچی خانے میں نجمہ کی حکمرانی تھی اور بیگم اس کے معاملات میں بہت کم دخل دیتی تھی۔ وہ صرف احکامات جاری کر دیتی تھی، ان پر عمل کرنا نجمہ کا کام تھا۔ بیگم کا زیادہ تر وقت سونے، ٹی وی دیکھنے اور بچوں کی دیکھ بھال میں صرف ہوتا تھا۔ اس کے کمرے میں ایک بڑا سا ٹی وی تھا جو زیادہ تر وقت کھلا رہتا تھا۔ ماجدہ نے پہلی بار کراچی میں وی سی آر دیکھا جس پر ہندوستانی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔

ماجدہ کو دونوں بچے بہت اچھے لگتے تھے۔ جب فرصت میں ہوتی تو ان کے ساتھ کھیلتی اور ان سے ملی جلی اردو اور بنگالی زبان میں پیار محبت کی باتیں کرتی۔ بیگم اس کی زبان سن کر خوب ہنستی، مگر وہ بچوں کو اپنی بات سمجھانے میں ضرور کامیاب ہو جاتی تھی۔ اس بڑے سے گھر کی ہر چیز سے آرام، عیش، خوشی، امیری، خوشحالی اور فارغ البالی جیسے اُمڈی پڑتی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیگم ایک دن بازار گئی تو اس کے اور نجمہ کے لیے چوڑیاں لے کر آئی۔ ماجدہ کو بہت اچھا لگا۔ اس نے گھر جا کر وہ چوڑیاں پہنیں اور ان کے ساتھ بہت اچھے کپڑے پہنے۔ اس نے خود کو آئینے میں دیکھا اور ایک غمناک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھر گئی..... کاش..... کاش..... ہاشم بھی ہوتا، بابا اور اماں بھی ہوتے..... بھائی بہن بھی ہوتے..... اسے سجا بنا دیکھ کر وہ سب کے سب کتنا خوش ہوتے..... لیکن وہ لوگ تو جیسے کسی اور ہی دنیا کی داستان بن گئے تھے۔

ماجدہ کو یہ کبھی نہیں معلوم ہو سکا کہ اس کو کیا ماہانہ تنخواہ ملتی ہے۔ اس کی تنخواہ اس کے ہاتھ میں نہیں آتی تھی۔ روز صبح کو وہ شازیہ اور سلیمہ کے ساتھ اپنے کام کی جگہ پر آتی تھی اور تین بجے کے قریب شوکت اس کو لینے کے لیے آ جاتی تھی۔ مہینے کی تنخواہ شوکت ہی بیگم سے وصول کرتی تھی اور اپنی تحویل میں رکھتی تھی۔

''میں تمہارے پیسے اپنے پاس جمع کر رہی ہوں۔'' شوکت نے اسے بتایا تھا۔ ''کل یہ پیسے تمہارے ہی کام آئیں گے۔'' وہ ماجدہ کو تھوڑے سے پیسے دے دیتی تھی تاکہ وہ کوئی چھوٹی موٹی چیزیں خرید لے اور اپنے چھوٹے موٹے اخراجات پورے کر لے۔ ماجدہ نے خود اس سے کبھی پیسے نہیں مانگے تھے۔

اس روز شام کو جبکہ ماجدہ گھر میں تھی، اچانک باہر گلی میں کچھ شور سا اٹھا۔ کوئی آدمی زور زور سے کراہ رہا تھا، آہ وزاری کر رہا تھا۔ لوگ صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے۔

آہ و زاری کرنے والا سعید نامی شخص ایک قریبی مکان میں رہتا تھا اور کسی کارخانے میں کام کرتا تھا۔ وہ ان لاکھوں بنگالیوں میں سے ایک تھا جو کراچی میں غیر قانونی طور پر مقیم تھے۔

مہینے کی پہلی تاریخ تھی اور سعید کارخانے سے اپنی تنخواہ لے کر گھر آ رہا تھا کہ گلی کے نکڑ پر کھڑے ہوئے دو پولیس والوں نے اسے روک کر اس کا شناختی کارڈ طلب کیا۔ سعید کے پاس اپنی شناخت کے لیے کوئی سرکاری دستاویز موجود نہیں تھی۔ پولیس والوں نے اس کو دو چار تھپڑ مارے اور اس کی جیب میں سے ساری رقم نکال کر اسے دھکا دے دیا۔ سعید بُری طرح رونے اور فریاد کرنے لگا لیکن کوئی اس کی سننے والا نہیں تھا۔ پولیس والوں نے اسے دھمکی دی کہ اگر اس نے زیادہ شور مچایا تو وہ اس کو غیر قانونی طور پر پاکستان آنے کے جرم میں

پکڑ کر جیل میں بند کر دیں گے جہاں سے اسے کوئی چھڑانے والا نہیں ہوگا۔

پولیس والے تو پیسے چھین کر چلے گئے تھے اور سعید اپنی خالی جیب لیے ہوئے ماتم کر رہا تھا۔ گہری سانولی رنگت، چھوٹے قد اور دبلے پتلے، منحنی سے جسم والا سعید، جو ایک پرانی سی بش شرٹ اور پتلون میں ملبوس تھا، کئی لوگوں کے درمیان گھرا ہوا بے بسی کے عالم میں اپنی دکھ بھری داستان سنا رہا تھا۔

ماجدہ کو اس واقعے سے دکھ تو بہت ہوا لیکن اسے اس پر کوئی تعجب نہیں ہوا۔

یہاں آنے کے کچھ ہی دنوں کے بعد وہ یہاں رہنے والے بہت سے بنگالیوں کے دکھوں اور مشکلات سے واقف ہو گئی تھی۔ شوکت اور سکندر نے خاص طور سے اس کو ان ساری باتوں سے آگاہ کیا تھا۔

یہاں بنگالیوں کی خاصی تعداد ایسی تھی جو غیر قانونی طور پر پاکستان میں مقیم تھی اور یہ لوگ مستقلاً ایک خوف کے عالم میں زندگی گزارتے تھے۔ پولیس والے ان سے باقاعدہ بھتہ لیتے تھے اور اس کے علاوہ اکثر ان کی کمائی بھی چھین لیتے تھے۔ پولیس کی ٹولیاں گلیوں میں منڈلاتی رہتی تھیں اور عام طور سے پہلی تاریخ کو گلیوں کے نکڑ پر کھڑے ہو کر کام پر سے واپس آنے والے غیر قانونی تاریکِ وطن بنگالیوں کا انتظار کرتیں۔ وہ انہیں روک کر ان سے ان کی مہینہ بھر کی کمائی چھین لیتیں اور احتجاج کی صورت میں جیل میں بند کر دینے کی دھمکی دیتیں۔ بنگالیوں کو پولیس والوں سے بہت بچ بچا کر رہنا پڑتا تھا۔ پیسے چھین لینے کے واقعات آئے دن ہوا کرتے تھے۔

ماجدہ یہ ساری باتیں سن کر اور بھی زیادہ خوفزدہ ہو گئی تھی اور اس نے اپنی زبان کو بند ہی رکھنا مناسب سمجھا تھا۔ وہ خود بھی تو غیر قانونی طور پر یہاں مقیم تھی۔

موسیٰ کالونی میں اپنے ایک سالہ قیام کے دوران ماجدہ کو یہاں رہنے والے بنگالیوں کی زندگی کے اور بھی بہت سے گوشوں سے واقف ہونے کا موقع ملا تھا۔

یہاں رہنے والی عورتوں کی بھاری اکثریت بنگلوں اور گھروں میں گھریلو ملازماؤں کے طور پر کام کرتی تھی۔ کچھ عورتیں ایسی بھی تھیں جو سارا دن کے لیے صرف ایک ہی گھر میں کام کرتی تھیں لیکن بہت سی ایسی تھیں جو ایک دن میں کئی کئی گھروں میں کام کرتی تھیں اور سارا دن ایک گھر سے دوسرے گھر میں کام کر کے ہر جگہ سے الگ الگ تنخواہ وصول کرتی تھیں۔ تمام کام کرنے والی عورتوں کو بہت اچھی تنخواہیں ملتی تھیں اور وہ اپنے ساتھ اپنی چھوٹی عمر کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بچیوں کو بھی کام پر لے جاتی تھیں۔ اس طرح وہ کم وقت میں زیادہ گھروں کا کام کر لیتی تھیں اور زیادہ پیسے کما لیتی تھیں۔ ان عورتوں کو اپنے اور اپنے بچوں کے کپڑوں کے لیے کوئی رقم خرچ نہیں کرنا پڑتی تھی، کیونکہ خوشحال گھرانوں سے ان کو اور ان کے بچوں کو بہت سارے کپڑے مل جاتے تھے جو بہت اچھی حالت میں ہوتے تھے۔ بہت سی عورتیں اپنے مردوں کے لیے بھی کپڑے مانگ لیتی تھیں۔ اسی لیے گھروں میں کام کرنے والی زیادہ تر عورتیں بہت اچھے اور قیمتی ملبوسات میں نظر آتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر یہ گمان نہیں گزرتا تھا کہ وہ گھروں میں کام کرنے والی ''ماسیاں'' ہیں۔ ماجدہ کو یہ بات بھی معلوم تھی کہ کراچی میں گھروں میں جھاڑو برتن کرنے والی عورت کو ''ماسی'' کہا جاتا ہے۔

بنگالی مرد کئی طرح کے کام کرتے تھے، مگر سب سے زیادہ وہ مرغیوں کی دکانوں پر کام کرتے تھے۔ بہت سے بنگالی تعمیراتی ٹھیکے داروں کے ساتھ کام کرتے تھے۔ بہت سے ہوٹلوں، کارخانوں اور فیکٹریوں وغیرہ میں بھی کام کرتے تھے۔

مگر بہت سارے بنگالی مرد ایسے بھی تھے جو کچھ نہیں کرتے تھے اور صرف عیش کرتے تھے۔ ان کی بیویاں گھروں میں کام کرتی تھیں اور یہ خود آرام کرتے تھے۔ کتنے ہی بنگالیوں نے دو دو شادیاں کر رکھی تھیں اور ان کے ڈھیروں بچے تھے، جن کی پرورش سے ان کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ ان بچوں کو ان کی مائیں ہی کسی نہ کسی طرح پالتی تھیں جو صبح سے شام تک گھروں میں جھاڑو برتن کرتی تھیں۔ ان میں سے بہت سارے مرد نشے کے عادی تھے اور بیویوں کی کمائی سے نشے کا شوق بھی پورا کرتے تھے۔ کبھی کبھی جب پولیس ان کو پکڑتی تو ان کی بیویاں ہی پولیس کو پیسے دے کر انہیں چھڑاتیں۔

ماجدہ کھلی آنکھوں اور کھلے کانوں کے ساتھ اس بستی میں رہ رہی تھی اور زیادہ سے زیادہ معلومات کو اپنے دل و دماغ میں سمیٹتی جا رہی تھی، تاہم بہت سی باتیں تھیں جو اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آتی تھیں۔

اسے آج تک ٹھیک سے یہ نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ سکندر کیا کام کرتا ہے۔ شازیہ اور سلیمہ کو بھی یہ بات وثوق کے ساتھ نہیں معلوم تھی۔ ان سب کو یہی بتایا گیا تھا کہ سکندر کسی ہوٹل کو مرغیاں سپلائی کرنے کا کاروبار کرتا ہے لیکن اس کی زبان سے اس قسم کی کاروباری مصروفیات کے بارے میں شاید ہی کبھی کوئی بات سنی گئی ہو۔

اکثر وہ کئی کئی دن کے لیے گھر سے غائب ہو جاتا اور شوکت لڑکیوں کو بتاتی کہ وہ

کاروبار کے سلسلے میں گیا ہوا ہے۔

اکثر رات کے وقت کچھ لوگ اس کے پاس آتے اور وہ ان کے ساتھ کمرے میں بند ہو کر بیٹھ جاتا اور گھنٹوں گزر جاتے۔ اکثر شوکت بھی ان لوگوں کے ساتھ ہوتی۔ ان کی ان مصروفیات کو بھی کاروباری سرگرمیاں قرار دیا جاتا تھا۔

ایک روز شام کے وقت کچھ لوگ گھر پر آئے۔ وہ تین آدمی تھے اور لمبی لمبی قمیصیں اور بھاری گھیر کی شلواریں پہنے ہوئے تھے۔ انہیں کمرے میں بٹھایا گیا اور سکندر اور شوکت ان کے ساتھ بات چیت میں مصروف ہو گئے۔ شوکت نے سلیمہ کو حکم دیا کہ وہ مہمانوں کے لیے چائے بنا کر لے آئے۔ سلیمہ چائے بنا کر لے گئی۔

کچھ دیر کے بعد شوکت نے کمرے کے دروازے پر آ کر شازیہ کو آواز دی اور اس سے کہا۔ ''چائے کے برتن اٹھا لو شازیہ۔'' شازیہ کمرے میں گئی اور اس نے وہاں سے چائے کے برتن اٹھا لیے۔ مہمان کافی دیر تک بیٹھے رہے۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا، معلوم نہیں ان کے درمیان کیا گفتگو ہوتی رہی تھی۔ کافی دیر کے بعد وہ لوگ رخصت ہو گئے۔ سکندر انہیں چھوڑنے ان کے ساتھ باہر چلا گیا اور پھر کافی دیر کے بعد واپس آیا۔

اس کے چند ہی دن کے بعد ایک روز شوکت نے شازیہ اور سلیمہ کا کام چھڑوا دیا۔ اس نے ان دونوں سے کہا کہ وہ ان کے لیے ایک زیادہ تنخواہ والے کام کا بندوبست کر رہی ہے، جو ان کے موجودہ کام سے بہت بہتر ہوگا۔ چنانچہ اگلے دن سے شازیہ اور سلیمہ نے کام پر جانا چھوڑ دیا اور وہ سارا دن گھر پر ہی رہنے لگیں۔ ماجدہ جب اپنے کام سے واپس آتی تو شازیہ اور سلیمہ کو گھر پر ہی پاتی۔

اس روز جب ماجدہ شوکت کے ساتھ گھر واپس آئی تو اس نے سلیمہ اور شازیہ کو گھر میں موجود نہیں پایا۔ کچھ دیر تک ان کا انتظار کرنے کے بعد ماجدہ نے شوکت سے ان کے بارے میں پوچھا۔

''ان کے نکاح ہو گئے ہیں اور وہ اپنے شوہروں کے ساتھ چلی گئی ہیں۔'' شوکت نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا اور ماجدہ کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

''نکاح؟'' اس نے لرز کر کہا۔ ''مگر..... کیسے؟ اتنی جلدی؟ اچانک؟ اور..... کس کے ساتھ؟''

''جلدی تو نہیں، ہاں اچانک ضرور ہے.....'' شوکت نے کہا۔ ''ہم نے ان کی شادی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کافی عرصہ پہلے طے کر دی تھی۔ اب اچانک ان کے شوہروں نے کہا کہ وہ نکاح کر کے اپنی بیویوں کو لے جانا چاہتے ہیں۔ میں تو ان سے مہلت مانگ رہی تھی، مگر انہوں نے کہا کہ انہیں جلد ہی کراچی سے باہر جانا ہے۔ چنانچہ میں نے اور تمہارے چاچا نے دونوں بیٹیوں کا نکاح کر دیا۔''

''مگر چاچی..... یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟'' ماجدہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے، کیا پوچھے۔ اس کا تو سر چکرانے لگا تھا۔

''کیوں بیٹی؟'' شوکت نے سکون کے ساتھ کہا۔ ''اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ لڑکیاں جب بڑی ہو جاتی ہیں تو ان کی شادیاں کر دی جاتی ہیں۔ وہ دونوں بھی بڑی ہو گئی تھیں۔ شادیاں پہلے سے طے تھیں۔ ان کے ہونے والے شوہروں نے جلدی کی۔ ہم نے شادی کر دی۔''

ماجدہ نے اپنے گاؤں میں بہت سی شادیاں دیکھی تھیں۔ یہاں موسیٰ کالونی میں بھی اس نے بنگالیوں کی کئی شادیاں دیکھی تھیں۔ وہ شادی کی رنگا رنگ تقریبات اور ان کے ہنگاموں اور شور و شغب سے بخوبی واقف تھی، لیکن یہ کیسی شادی تھی؟ نہ کوئی بارات آئی، نہ دلہنیں سجیں نہ مہمان آئے، کچھ بھی تو نہیں ہوا اور شادی ہو گئی۔

''ابھی تو سب کچھ جلدی میں ہو گیا۔'' شوکت نے کہا۔ ''مگر ہم جلد ہی بڑی دعوت کریں گے۔ بہت سے لوگوں کو بلائیں گے۔ وہ دونوں کچھ دنوں کے بعد واپس آئیں گی تو پھر دعوت ہو گی۔''

ماجدہ نے گزشتہ ایک سال کے دوران اتنے جھوٹ سنے تھے کہ اب اس کے کان جھوٹ کے عادی ہو چکے تھے اور وہ کوئی بھی جھوٹ سن کر چونکتی نہیں تھی۔ سال بھر پہلے شاہ میاں اور امینہ نے فردوسی اور میمونہ کے بارے میں کہا تھا کہ انہیں ان کے گھر بھیج دیا گیا ہے۔ وہ دونوں پاکستان میں آنے کے بعد غائب ہو گئی تھیں اور اب شازیہ اور سلیمہ کے بارے میں شوکت کہہ رہی تھی کہ ان کی شادی کر دی گئی ہے جبکہ آج صبح تک شازیہ اور سلیمہ میں سے کسی نے بھی اس سے یہ نہیں کہا تھا کہ ان کی شادیاں ہونے والی ہیں۔ خدا جانے کیا ہو رہا تھا..... یہ لڑکیاں کہاں غائب ہو جاتی ہیں؟ خوف کا ایک تازہ حملہ تھا جس نے اسے نیم جاں کر دیا۔ اپنے گھر کی یاد نے، جس کے ساتھ ہاشم کی یاد ہمیشہ بڑی مضبوطی کے ساتھ جڑی رہتی تھی، اسے ایک بار پھر اس قدر شدت کے ساتھ بے چین کر دیا کہ اسے اپنا دل کٹ کٹ کر گرتا ہوا

محسوس ہونے لگا۔

شوکت نے اس سارے معاملے کے بارے میں اس قدر سرسری انداز میں بات کی تھی جیسے یہ کوئی نہایت معمولی اور غیر اہم واقعہ ہو۔ شازیہ اور سلیمہ اس کی سگی بیٹیاں نہ سہی، لیکن کیا کسی بھی لڑکی کی شادی اس طرح سے ہوتی ہے؟

دس سالہ ماجدہ کا ذہن بُری طرح بھٹک رہا تھا۔ وہ ٹھیک سے کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

اس واقعے کو کئی دن گزر گئے۔ ایک روز شام کو جب وہ گلی سے گزر رہی تھی تو کوثر نے آواز دے کر اسے روکا۔

کوثر ایک جوان اور خوش شکل بنگالن تھی اور اس کی حال ہی میں تیسری بار شادی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے وہ دو شوہروں سے طلاق لے چکی تھی اور کچھ دنوں پہلے اس نے ایک پولیس والے سے تیسرا نکاح کیا تھا۔ وہ پولیس والا غیر بنگالی اور شادی شدہ تھا۔ وہ کوثر کو اپنے ساتھ نہیں لے گیا تھا بلکہ اس نے اسے یہیں رکھا تھا۔ وہ خود دوسرے تیسرے دن اس کے پاس آتا تھا۔ کوثر کے بارے میں اکثر لوگ کچھ عجیب عجیب سی باتیں کرتے تھے اور اسے پسند نہیں کرتے تھے مگر اس سے ڈرتے بھی تھے کیونکہ اس کے پولیس والوں سے مراسم تھے۔

''اری سن۔'' کوثر نے ماجدہ کو مخاطب کر کے کہا۔ ''وہ کہاں گئیں..... سلیمہ اور شازیہ؟''

''چاچی بتا رہی تھیں کہ ان کی شادی ہو گئی ہے۔'' ماجدہ نے محتاط انداز میں مختصر سا جواب دیا۔

''شادی؟ ہی ہی ہی۔'' کوثر نے بڑے تضحیک آمیز انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔ ''اور یہ تیری چاچی تیری شادی کب کر رہی ہے؟'' وہ ایک بار پھر زور سے ہنسی۔ بڑی سفاک ہنسی تھی اس کی۔

ماجدہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور جلدی جلدی چلتی ہوئی وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ نہ جانے وہ عورت اس طرح کیوں ہنس رہی تھی۔

سلیمہ اور شازیہ کے اچانک غائب ہو جانے کے بعد گھر خالی خالی سا ہو گیا تھا اور ماجدہ اور بھی زیادہ پریشان رہنے لگی تھی۔ شوکت تو اب ان دونوں لڑکیوں کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتی تھی، جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہ ہو لیکن ماجدہ کو ان کی کمی کا بڑی شدت کے ساتھ احساس ہوتا تھا۔ نہ جانے ان کو کہاں بھیج دیا گیا تھا۔

تقریباً چھ ماہ کا عرصہ مزید گزر گیا۔ اس عرصے کے دوران شازیہ اور سلیمہ بھی نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آئیں، نہ ان کے بارے میں شوکت نے کوئی خبر سنائی۔ ماجدہ کے دو ایک بار پوچھنے پر شوکت نے بس یہی کہا کہ وہ دونوں اپنے اپنے مالدار شوہروں کے ساتھ بہت خوش ہیں اور یہ کہ سکندر کی ان کے شوہروں سے ملاقات ہوئی تھی۔

وہ آدمی اس بچی کے ساتھ شام کو شوکت اور سکندر کے گھر آیا۔ آدمی اور بچی دونوں بنگالی تھے۔ بچی کی عمر کوئی سات آٹھ سال کی ہوگی اور وہ شکل سے کچھ بیمار سی لگتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ نیند میں ہو۔ وہ بیٹھے بیٹھے اونگھ رہی تھی۔ آدمی نے جب گھر کے دروازے پر دستک دی تھی تو سکندر نے دروازہ کھولنے کے بعد اسے اندر بلا لیا تھا۔ وہ لوگ ایک دوسرے کے جاننے والے تھے۔ شوکت بھی اس آدمی سے باتیں کرنے لگی۔ وہ بھی اس کو جانتی تھی۔

وہ آدمی بہت دبلا پتلا، مدقوق سا تھا اور بیمار لگتا تھا۔ باتیں کرنے کے دوران وہ بار بار کھانستا بھی جا رہا تھا۔

''وہ لومڑی تو اپنے یاروں کے ساتھ گل چھرے اُراتی رہتی ہے۔'' آدمی بڑے زہریلے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ وہ سب لوگ کمرے کے اندر بیٹھے ہوئے تھے اور ماجدہ دروازے کے باہر موجود تھی۔ وہ ان کی آوازوں کو بالکل صاف طور پر سن سکتی تھی۔ ''میں اس وبال کو کہاں اٹھائے اٹھائے پھروں۔ اب تم لوگ ہی اس کو سنبھالو۔''

''فکر نہ کرو مشتاق خان۔'' ماجدہ نے سکندر کی آواز سنی۔ ''جیسا تم چاہو گے، ویسا ہی ہو گا۔''

''بس اسے کچھ پتہ نہ چلے۔'' مشتاق خان نے آہستہ سے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''ورنہ وہ قیامت برپا کر دے گی۔''

''بے فکر رہو۔'' سکندر کی ہنسی فضا میں گونجی۔ ''اس قیامت کے فرشتوں کو بھی پتہ نہیں چلے گا۔''

مشتاق کے ساتھ آنے والی لڑکی باہر برآمدے میں نیم غنودگی کے عالم میں سکڑی سہمی بیٹھی ہوئی تھی اور وہ لوگ کمرے کے اندر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔

ذرا دیر بعد مشتاق چلا گیا۔ وہ لڑکی کو یہیں چھوڑ گیا تھا۔

''بے چاری بیمار اور پریشان بچی ہے۔'' مشتاق کے جانے کے بعد شوکت نے ماجدہ سے سرسری انداز میں کہا۔ ''اس کی ماں بڑی ظالم اور خراب عورت ہے۔ اس پر بہت ظلم کرتی ہے۔ اس کا باپ اسے ہمارے پاس چھوڑ گیا ہے۔ کچھ دنوں تک ہمارے ساتھ رہے گی۔ تب

تک وہ اس کے لیے کوئی دوسرا بندوبست کر لے گا اور اسے لے جائے گا۔''

لڑکی کا نام انیسہ تھا۔ ماجدہ اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اچھی شکل وصورت کی لڑکی تھی لیکن اس وقت بہت مضمحل اور ناتواں نظر آ رہی تھی۔ جب سب لوگوں نے کھانا کھایا تو شوکت نے اسے بھی کھانے پر ساتھ بٹھایا لیکن انیسہ نے بہت تھوڑا سا کھانا کھایا۔

اگلی صبح کو ماجدہ حسبِ معمول اپنے کام پر چلی گئی۔ شازیہ اور سلیمہ کے گھر سے چلے جانے کے بعد اب ماجدہ نجمہ کی بہن منظوراں کے ساتھ اپنے کام کی جگہ تک جاتی تھی۔ منظوراں موسیٰ کالونی کے قریب ہی رہتی تھی اور اسی طرف ایک بنگلے میں کام کرتی تھی، جدھر ماجدہ کام کرتی تھی۔ چنانچہ شوکت نے ماجدہ کے منظوراں کے ساتھ جانے کا بندوبست کر دیا تھا۔

سہ پہر کو جب ماجدہ واپس آئی تو اس نے انیسہ کو گھر میں موجود پایا۔ اس کی حالت کل کے مقابلے میں کچھ بہتر نظر آ رہی تھی لیکن وہ بہت سہمی ہوئی اور خوفزدہ لگ رہی تھی اور ایک کونے میں خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔

''اپنے گھر والوں کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔'' شوکت نے آہستہ سے ماجدہ سے کہا۔ ''میں نے اسے بتا دیا ہے کہ اس کا باپ چند روز کے بعد آئے گا اور اسے لے جائے گا۔ اگر تم سے کچھ کہے تو تم بھی یہی کہنا۔''

''ٹھیک ہے۔'' ماجدہ نے کہا۔

لیکن انیسہ نے ماجدہ سے کچھ نہیں کہا۔ وہ تو بس سارا وقت خاموش اور بجھی بجھی سی رہی۔ اس نے رات کا کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا۔

اگلے روز بالکل صبح سویرے جبکہ سب لوگ ابھی سو ہی رہے تھے، کسی نے زور زور سے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ شوکت اور سکندر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ ماجدہ بھی جاگ کر ہوشیار ہو گئی۔

سکندر نے جا کر دروازہ کھولا اور فوراً ہی دو باوردی پولیس والیاں سکندر کو دھکا دیتے ہوئے گھر کے اندر داخل ہو گئیں۔ ان کے پیچھے پیچھے دو پولیس والے بھی تھے۔ ماجدہ سامنے ہی موجود تھی۔ گھر پر پولیس کا چھاپہ پڑتے دیکھ کر خوف کے مارے خون اس کی رگوں میں منجمد ہونے لگا۔ اس کا فوری تاثر یہی تھا کہ پولیس اس کو پکڑنے کے لیے آئی ہے کیونکہ وہ غیر قانونی طور پر پاکستان میں رہ رہی ہے۔ سکندر اور شوکت کی طرف سے اس کے دل میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مسلسل پیدا کیا جانے والا خوف ہمیشہ اس کے وجود کا حصہ بنا رہتا تھا۔

وہ جلدی سے سامنے سے ہٹ کر اندر کمرے میں چلی گئی۔ انیسہ بھی اسی کمرے میں موجود تھی وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ باہر سے کچھ عجیب عجیب آوازیں آ رہی تھیں۔

''کیا بات ہے؟ کیا بات ہے؟'' شوکت کی سہمی ہوئی آواز اُبھر رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی سکندر کی آواز بھی..... ''آپ لوگ..... کیا چاہتے ہیں؟''

معلوم نہیں پولیس والوں نے کیا جواب دیا لیکن ان کی اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کی آوازیں ماجدہ کو صاف طور پر سنائی دے رہی تھیں، گھر ہی کتنا بڑا تھا جس کی تلاش میں کچھ زیادہ وقت لگتا۔ ایک منٹ کے بعد ہی ایک پولیس والی اس کمرے میں داخل ہوگئی۔ اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ ماجدہ نے اس عورت کو گھر میں داخل ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ شاید پولیس والوں کے پیچھے رہی ہوگی۔

''یہی ہے۔'' وہ عورت انیسہ کو دیکھتے ہی زور سے چلائی۔ ''یہی ہے.....'' وہ بے تابانہ انداز میں انیسہ کی طرف لپکی۔

اس عورت کو دیکھتے ہی انیسہ کے جسم میں جیسے ایک بجلی سی دوڑ گئی۔ اس کا سارا اضمحلال اور افسردگی جیسے ایک لمحے میں غائب ہوگئی اور وہ ''امی..... امی'' کہتی ہوئی تیزی سے بھاگ کر اس عورت سے لپٹ گئی۔

''میری بچی..... میری بچی.....'' عورت کی آواز اس کے گلے میں پھنسنے لگی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

اسی وقت باقی پولیس والے بھی اس کمرے کے اندر آ گئے۔ سکندر اور شوکت بھی ان کے ساتھ تھے۔ ماجدہ کے دل کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔

ایک پولیس والے نے سکندر کو گریبان پکڑ لیا۔ ''اس بچی کو تُو کہاں سے اغوا کر کے لایا ہے؟''

''نہیں صاحب جی۔'' سکندر نے عاجزانہ انداز میں کہا۔ ''میں اسے کہیں سے نہیں لایا ہوں، کل رات کو اس کا باپ اسے یہاں چھوڑ گیا تھا۔ اس نے ہم سے کہا تھا کہ ہم اسے کچھ روز کے لیے اپنے پاس رکھ لیں کیونکہ اس کی ماں اس کی بالکل پروا نہیں کرتی۔''

''جھوٹا ہے، کمینہ ہے، پورا ہے۔'' عورت زور زور سے روتے ہوئے بُری طرح چیخنے لگی۔ ''وہ اسے بیچ دینا چاہتا ہے۔ وہ کوئی کام دھندا نہیں کرتا، نشہ کرتا ہے، اسے نشے کے لیے

پیسے چاہیے ہوتے ہیں۔ میں ایک اسکول میں کام کرتی ہوں۔ وہ میری تنخواہ زبردستی چھین کر اسے نشے میں اڑا دیتا ہے۔ اسے ہر وقت پیسے چاہیے ہوتے ہیں اور اب وہ پیسوں کے لیے اپنی بیٹی کو بھی بیچ دینا چاہتا ہے۔ مگر میں اسے ایسا ہرگز نہیں کرنے دوں گی۔''

''نہیں نہیں بی بی! تم پریشان نہ ہو۔'' پولیس والے نے عورت سے کہا۔ ''تمہاری بچی کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوگا'' اور پھر وہ سکندر سے مخاطب ہو کر تیز و تند لہجے میں کہنے لگا۔ ''تُو نے اس بچی کو خریدا ہے؟ پیسے دیئے ہیں اس کے باپ کو؟''

''نن نہیں جناب، بالکل نہیں.....'' سکندر نے جلدی جلدی کہا۔ ''مجھے اس بچی سے کیا لینا ہے؟ مشتاق تو اپنی مرضی سے کچھ روز کے لیے اسے یہاں چھوڑ کر گیا تھا..... میں نے آپ کو بتایا نا، اس نے کہا تھا کہ کچھ دن کے بعد آ کر وہ اسے لے جائے گا۔ وہ اسے اس کی ماں کے ساتھ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا.....''

''جھوٹا ہے وہ۔'' عورت دوبارہ چلائی۔ ''وہ اس کو بیچنا چاہتا ہے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ اسے بیچنا چاہتا ہے۔''

اچانک پولیس والے نے کمرے میں موجود ماجدہ کو گہری اور پُرتجسس نظروں سے دیکھا۔

''یہ لڑکی کون ہے؟'' اس نے پوچھا۔

ماجدہ کی رگوں میں خون ایک بار پھر منجمد ہونے لگا۔ شاید..... شاید..... اس کے جیل جانے کا وقت آ گیا تھا۔

''میری بھتیجی ہے صاحب۔'' سکندر نے جلدی سے جواب دیا۔ ''ہمارے ساتھ ہی رہتی ہے۔''

ماجدہ کا جسم بالکل غیر ارادی طور پر ہولے ہولے کانپنے لگا۔ اس نے اپنے دانت سختی کے ساتھ بھینچ رکھے تھے۔

''ٹھیک ہے۔'' پولیس والے نے ماجدہ کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں ہمارے ساتھ تھانے چلنا ہوگا، وہاں چل کر تم سے اچھی طرح بات چیت ہوگی۔''

پولیس والے سکندر کو اپنے ساتھ لے گئے۔ وہ عورت اور اس کی بیٹی انیسہ بھی پولیس والوں کے ساتھ ساتھ تھے۔

''ضرورت پڑی تو تم کو بھی تھانے بلایا جائے گا۔'' پولیس والے نے شوکت سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مخاطب ہوکر کہا۔ ''کہیں اِدھر اُدھر بھاگنے اور چھپنے کی کوشش نہ کرنا۔''

''نہیں صاحب۔'' شوکت نے عاجزانہ انداز میں کہا۔ ''میں کیوں بھاگوں گی؟ ہم لوگوں نے کچھ بھی نہیں کیا ہے۔ ہم نے تو بس نیکی کی تھی، مشتاق کی بیٹی کو اپنے پاس رکھ لیا تھا۔''

پولیس پارٹی ان سب لوگوں کو گاڑی میں بٹھا کر لے گئی جو باہر سڑک پر کھڑی ہوئی تھی۔ شوکت دروازے میں کھڑی ہوکر دیکھتی رہی لیکن ماجدہ کمرے سے باہر ہی نہیں نکلی۔ خوف اور دہشت کے عالم میں اس کا سارا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ وہ پولیس والوں کے گھر سے باہر جاتے وقت تک کمرے میں ہی چھپی رہنا چاہتی تھی۔

گاڑی کے چلے جانے کے بعد شوکت واپس اس کمرے میں آ گئی جہاں ماجدہ موجود تھی۔

''دیکھا تم نے؟'' شوکت نے ماجدہ سے کہا۔ ''یہ ہوتا ہے نیکی کرنے کا انجام..... ہم نے تو اس بچی کی مدد کرنے کی کوشش کی تھی، مگر اس کی ماں ہمارے سر پر پولیس کو لے کر آ گئی۔''

انتہائی خوف و دہشت کا شکار ہونے کے باوجود ماجدہ حقائق کو صاف طور پر سمجھ رہی تھی۔ انیسہ جس طرح لپک کر اپنی ماں سے جا لپٹی تھی اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ مشتاق جھوٹ بول رہا تھا کہ انیسہ کی ماں اس پر توجہ نہیں دیتی۔ جو کچھ ماجدہ نے گزشتہ رات مشتاق کی زبان سے سنا تھا، اس کے بعد یہ سمجھنا آسان تھا کہ انیسہ کی ماں جو کچھ کہہ رہی تھی، وہ سچ تھا۔

''اب کیا ہوگا شوکت چاچی؟'' ماجدہ نے سپاٹ لہجے میں شوکت سے پوچھا۔ اسے سکندر کی گرفتاری کی فکر نہیں تھی۔ اسے تو سب سے زیادہ اپنی سلامتی کی فکر تھی۔

''میں ذرا دیر کے لیے باہر جا رہی ہوں۔'' شوکت نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے کہا۔ ''گھر میں ہی رہنا اور کہیں اِدھر اُدھر نہ چلی جانا۔ دروازہ اندر سے بند کر لو۔''

شوکت کئی گھنٹے کے بعد واپس آئی..... لیکن جب وہ واپس آئی تو اکیلی نہیں تھی، سکندر بھی اس کے ساتھ تھا۔

ماجدہ شوکت کے ساتھ سکندر کو دیکھ کر حیران بھی ہوئی اور قدرے مطمئن بھی۔ اس کے اطمینان کا سبب یہ تھا کہ وہ اب اپنے آپ کو محفوظ سمجھ سکتی تھی۔ پولیس نے سکندر کو گرفتار نہیں کیا تھا۔

''پولیس نے تمہارے چاچا کو چھوڑ دیا۔'' گھر میں آنے کے بعد شوکت نے فاتحانہ انداز میں ماجدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ان کے خلاف کوئی الزام نہیں ہے۔''

''اور وہ..... وہ مشتاق؟'' ماجدہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''اب مشتاق جانے اور پولیس جانے۔'' شوکت کے بجائے سکندر نے جواب دیا۔ ''پولیس کو جو کچھ پوچھنا ہے، وہ مشتاق سے پوچھے گی ہم سے جو کچھ پوچھنا تھا، پوچھ لیا۔''

سکندر اور شوکت دونوں خاصے خوش نظر آ رہے تھے لیکن ان کی اس خوشی میں ماجدہ اس طرح شریک نہیں تھی۔ اسے خوشی اس بات کی نہیں تھی کہ سکندر پولیس کے ہاتھوں سے بچ گیا۔ اس کو اصل خوشی اس بات کی تھی کہ انیسہ اپنی ماں کے پاس پہنچ گئی اور وہ خود پولیس کی گرفت میں آنے سے بچ گئی۔

مشتاق اس دن کے بعد سے پھر نظر نہیں آیا اور نہ ہی گھر میں اس کے بارے میں کوئی بات ہوئی۔ پولیس بھی اس کے بعد کبھی گھر پر نہیں آئی۔ سکندر اور شوکت پہلے کی طرح پوری آزادی کے ساتھ رہ رہے تھے اور ماجدہ ان کے ساتھ رہ رہی تھی۔

ماجدہ تقریباً گیارہ سال کی ہوگئی تھی۔ کراچی میں رہتے ہوئے اسے دو سال ہو گئے تھے۔ وہ اب اردو خوب روانی سے بولتی تھی۔ شوکت نے ایک پڑوسی لڑکی کی مدد سے جسے اردو لکھنا پڑھنا آتی تھی، ماجدہ کو اردو میں اس کا نام لکھنا سکھا دیا۔

''اردو میں اپنا نام لکھنے کی اچھی طرح مشق کر لو۔'' شوکت نے اسے سمجھایا۔ ''کچھ دنوں کے بعد ہم تمہارا شناختی کارڈ بنوا دیں گے۔ پھر تم پاکستانی بن جاؤ گی اور تمہیں کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔ جب تک تمہارا شناختی کارڈ نہیں بنے گا، تم کو خطرہ رہے گا۔ پولیس کبھی بھی تمہیں پکڑ کر لے جا سکتی ہے۔''

ماجدہ کو یہ تو معلوم تھا کہ کراچی میں مقیم بہت سارے بنگالیوں نے جو غیر قانونی طور پر پاکستان میں داخل ہوئے تھے، یہاں سرکاری اہلکاروں کو رشوت دے کر اپنے شناختی کارڈ بنوا لیے ہیں۔ اس طرح وہ پکے پاکستانی بن گئے ہیں اور پولیس انہیں نہیں پکڑتی۔ البتہ بڑی تعداد ایسے بنگالیوں کی تھی جن کے پاس شناختی کارڈ نہیں تھے اور وہ ہمیشہ پولیس کے خوف سے لرزاں رہتے تھے۔ ان میں مرد اور عورتیں دونوں شامل تھے۔ ماجدہ کے اردگرد جو مخصوص دنیا تھی، وہ اس قسم کی معلومات کی فراہمی کا فوری اور مؤثر ذریعہ تھی۔ البتہ بہت سی باتوں کی باریکیوں سے وہ ناواقف تھی مثلاً اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ جب تک اس کی عمر اٹھارہ سال کی

نہیں ہو جاتی، اس وقت تک اس کا شناختی کارڈ نہیں بن سکتا۔

گیارہ سال کی عمر میں ماجدہ میں نسوانی بلوغت کی علامتیں نمودار ہو گئیں۔ ماجدہ ان چیزوں کے بارے میں پہلے سے جانتی تھی، تاہم اس نے شوکت کو اس کے بارے میں بتانا ضروری سمجھا۔

شوکت اس کی بات سن کر جیسے ایک دم خوشی سے کھل اٹھی۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' اس نے نہایت خوشدلی کے ساتھ کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تم اب بڑی ہو گئی ہو۔ لیکن دیکھو، کسی سے اس بات کا ابھی تذکرہ مت کرنا، پہلے ہم تمہارا شناختی کارڈ بنوا دیں.....''

''شناختی کارڈ بن جائے گا تو پھر مجھے یہاں کوئی خطرہ نہیں رہے گا؟'' ماجدہ نے پُر امید لہجے میں شوکت سے پوچھا۔

''بالکل نہیں۔'' شوکت نے فوراً جواب دیا۔ ''شناختی کارڈ کا مطلب ہو گا کہ تم پاکستانی ہو اور تمہارے اس ملک میں رہنے پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔''

دو سال کا طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ ماجدہ نو سال کی عمر میں کراچی آئی تھی اور اس سارے عرصے کے دوران اس نے ان سب لوگوں سے کیسی کیسی فریاد نہیں کی تھی کہ اسے اس کے وطن بھیج دیا جائے لیکن جھوٹے وعدوں اور عیارانہ چالوں کے سوا اسے کچھ نہیں مل سکا تھا۔ وہ جب بھی یہاں سے بھاگنے کے بارے میں سوچتی تھی تو خوف، بے یقینی اور یاس انگیزی کی یورش اس کے قدموں کو جکڑ لیتی تھی۔ اگر پولیس نے پکڑ کر جیل میں بند کر دیا تو..... کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو اس کی مدد کے لیے آگے آتا۔

لیکن اب صورتِ حال ایک دم بدل گئی تھی۔ وہ ''بڑی'' ہو گئی تھی۔ اس کا شناختی کارڈ بن سکتا تھا اور ایک بار شناختی کارڈ بن جائے، پھر وہ غیر قانونی ہونے کے خطرے سے باہر آ سکتی تھی اور اپنی مرضی سے جی سکتی تھی۔

اس نے دل میں سوچا کہ جیسے ہی اس کا شناختی کارڈ بن جائے گا، ویسے ہی وہ یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرے گی..... کوئی تو اس کی مدد کرے گا..... وہ اپنے اردگرد موجود ان لوگوں کے بارے میں سوچنے لگی جن سے وہ مدد کی امید رکھ سکتی تھی۔

بلوغت کی حدود میں داخل ہونا اسے اپنے حق میں فال نیک محسوس ہو رہا تھا۔ شناختی کارڈ بن جائے گا۔ وہ پولیس کے خوف سے آزاد ہو جائے گی اور جہاں چاہے جا سکے گی،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جہاں چاہے رہ سکے گی کوئی اس کو پکڑے گا نہیں۔ اس کا ناپختہ ذہن ان تمام پیچیدگیوں اور پابندیوں سے تو واقف بھی نہیں تھا جو اس راہ میں حائل تھیں۔

اس رات وہ بہت دیر تک جاگتی رہی اور ایک عرصے کے بعد اس نے اپنے گھر اور ہاشم کو بڑی شدت، تڑپ اور درد کے ساتھ یاد کیا۔ ویسے تو اس کا دل کبھی بھی اپنے گھر والوں اور ہاشم کی یاد سے خالی نہیں رہتا تھا لیکن کبھی کبھی یادوں کا یہ درد اس قدر شدت کے ساتھ اس پر حملہ آور ہوتا تھا کہ اس کا سارا وجود لرز لرز کر رہ جاتا تھا۔ آج کی رات بھی ایسی ہی ایک رات تھی۔ یاد کے درد کی بجلیاں تھیں کہ اس کے جسم و جاں میں تڑپ رہی تھیں، لہرا رہی تھیں اور اسے مارے ڈال رہی تھیں..... ''کیسے ہوں گے وہ سب لوگ..... مجھے کتنا یاد کرتے ہوں گے۔ اب تو اتنا عرصہ گزر گیا ہے، ہو سکتا ہے کہ انہوں نے سمجھ لیا ہو کہ شاید میں کہیں مر کھپ گئی ہوں گی..... یا شاید وہ اب بھی مجھ کو پا لینے کی امید لگائے بیٹھے ہوئے ہوں..... ہائے..... ہاشم..... میں تم کو کس طرح بتاؤں کہ میں کراچی میں ہوں۔''

اس کی آنکھوں سے اتنے آنسو بہے کہ اس کا تکیہ بھیگ گیا۔ امید کی ایک نئی کرن جو اس کے دل میں پیدا ہوئی تھی۔ وہ اس کے خون سے روشنی حاصل کر رہی تھی۔

اگلی صبح کو جب وہ بیدار ہوئی تو خود کو کافی بدلا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ وہ بڑی ہو گئی تھی۔ اس کا شناختی کارڈ بننے والا تھا اس کو پولیس اور قانون کے خوف کے حصار سے نجات ملنے والی تھی۔ اس کے لیے اپنے وطن واپسی کا راستہ روشن ہونے والا تھا۔

یہ راستہ کس طرح طے ہو گا، اس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی، مگر وہ یہ ضرور جانتی تھی کہ ایک اچھا آغاز ہونے والا ہے۔

اس کے تقریباً ایک ہفتے کے بعد ایک روز شام کو کچھ لوگ سکندر اور شوکت سے ملنے کے لیے آئے۔ وہ بنگالی نہیں تھے۔ انہیں کمرے میں بٹھایا گیا اور ماجدہ ان کے لیے چائے لے کر گئی۔ وہ دو آدمی تھے، سکندر اور شوکت سے اردو میں باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک سکندر کو اپنے باغ میں تیار ہونے والی آموں کی فصل کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ دوسرا شخص بھی عمر رسیدہ تھا۔ ماجدہ نے ان لوگوں کو سلام کیا جو اس کے باپ کی عمروں کے تھے اور انہوں نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اسے غور سے دیکھا۔

کچھ دیر کے بعد وہ لوگ چلے گئے۔ ان کے آنے اور جانے میں کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی جس پر ماجدہ توجہ دیتی۔ سکندر کے پاس تو اکثر لوگ آیا کرتے تھے اور اکثر یوں بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوتا تھا کہ مہمانوں کے خیر مقدم میں اور ان کے ساتھ بات چیت کرنے میں سکندر کے ساتھ ساتھ شوکت بھی شریک ہوتی تھی اور ماجدہ چائے لے کر آتی تھی۔

مہمان چلے گئے اور کچھ دیر کے بعد ماجدہ ان کے بارے میں سب کچھ بھول گئی۔

اس کے چند روز کے بعد ایک شام کو سکندر نے ماجدہ کو آواز دے کر اپنے پاس بلایا۔ شوکت وہاں پہلے سے موجود تھی۔

سکندر چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے۔ یہ کاغذات اردو میں چھپے ہوئے تھے جن کا ایک لفظ بھی ماجدہ نہیں پڑھ سکتی تھی۔

''لو بیٹی، ان کاغذات پر اپنے دستخط کر دو۔'' سکندر نے اس سے کہا۔ ''میرا مطلب ہے اپنا نام لکھ دو۔ تمہیں اردو میں اپنا نام لکھنا تو آتا ہے نا؟''

''جی ہاں، آتا ہے۔'' ماجدہ نے اپنے دل میں اٹھنے والے زبردست ہیجان کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اردو میں اپنا نام لکھ سکتی ہوں۔''

''اچھا تو پھر ان کاغذات پر اپنا نام لکھ دو۔'' سکندر نے کہا۔ ''میں جہاں جہاں انگلی رکھتا جاؤں، تم وہاں وہاں اپنا نام لکھتی جاؤ..... یہ تمہارے شناختی کارڈ کے فارم ہیں۔''

''ہاں بیٹی۔'' شوکت نے کہا۔ ''تم ان فارموں پر دستخط کر دو گی تو اس کے بعد تمہارا شناختی کارڈ بن جائے گا اور پھر تم قانونی طور پر پاکستانی بن جاؤ گی، پھر پولیس تمہیں تنگ نہیں کر سکے گی۔''

ماجدہ کا دل تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگا۔ معاملات اس کے حق میں جا رہے تھے۔

سکندر نے ماجدہ سے چار فارموں پر دستخط کروائے۔ ماجدہ کو اردو پڑھنا بالکل نہیں آتی تھی۔ لیکن فارموں کو دیکھ کر اسے یہ بات سمجھنے میں بالکل مشکل نہیں پیش آئی کہ وہ چاروں فارم ایک ہی جیسے تھے۔ ماجدہ نے خوشی خوشی ان چاروں فارموں پر اردو میں اپنا نام لکھ دیا۔

''دیکھا۔'' شوکت نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اردو میں نام لکھنا کتنا کام آیا۔ اگر تم بنگالی میں دستخط کرتیں تو تمہارا شناختی کارڈ کبھی نہیں بن سکتا تھا۔''

''بہت پیسے خرچ ہوں گے تمہارا شناختی کارڈ بنوانے میں۔'' سکندر نے کہا۔ ''لیکن خیر چلو، تمہارے جمع پیسے کافی ہیں..... ان میں سے ہی کچھ پیسے خرچ ہو جائیں گے۔''

''کارڈ کب تک بن کر آ جائے گا سکندر چاچا؟'' ماجدہ نے بے تابی سے پوچھا۔

''تھوڑا وقت تو لگے گا۔'' سکندر نے کہا۔ ''کم از کم دو مہینے تو لگیں گے ہی۔ مگر اس کے

بعد جب تمہارا کارڈ بن کر آ جائے گا تو پھر تم کو کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔''

ماجدہ پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا اس کے بعد وہ اپنے وطن، اپنے گاؤں واپس جا سکے گی لیکن اس نے اپنی زبان کو روک لیا۔ یہ بات سکندر یا شوکت سے پوچھنے کی نہیں تھی۔ وہ لوگ کبھی نہیں چاہیں گے کہ وہ ان کے گھر سے چلی جائے۔ وہ ان پر بوجھ نہیں تھی، وہ تو ان کے بوجھ کو ہلکا کر رہی تھی۔ اس کی ہر ماہ کی تنخواہ تو شوکت کی ہی تحویل میں رہتی تھی۔

شناختی کارڈ کے لیے کاغذوں پر دستخط کرنے کے بعد اس کے اعتماد اور اضطراب، دونوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ شاید مصیبت کے دن پورے ہونے والے تھے اور اچھے دن ایک بار پھر آنے والے تھے۔

''ہاشم..... ہاشم..... اماں..... بابا.....'' اس کے دل کی گہرائیوں سے درد بھری خاموش آوازیں بلند ہوتی تھیں۔ ''میں آ رہی ہوں۔ میں آ رہی ہوں..... میں جلد ہی تم لوگوں کے پاس آ رہی ہوں۔''

درد آگیں سرگوشی اور الم آشنا انبساط کی ان ساعتوں میں وہ چاہتی تھی کہ کوئی اس کا اپنا ہو، کوئی ساتھی ہو، جسے وہ اس خوشخبری میں شریک کر سکے، جسے وہ یہ بتا سکے کہ اس کی نجات کی گھڑی قریب آ رہی ہے اور عنقریب اس کو خوف اور بے یقینی کے عذاب سے چھٹکارا ملنے والا ہے۔ پھر وہ آزاد ہو گی اور آزاد ہوتے ہی اپنے وطن جانے کی کوشش شروع کر دے گی۔

مگر کون اس کی مدد کرے گا؟ کون مدد کرے گا؟ سکندر اور شوکت کے کانوں میں تو بھنک بھی نہیں پڑنی چاہیے۔ کون مدد کرے گا؟ شاید بیگم..... وہ تو بہت اچھی عورت تھی۔ وہ ماجدہ کو اس لیے بہت پسند کرتی تھی کیونکہ اس کی بچی ماجدہ سے بہت مانوس ہو گئی تھی اور اس کی گود میں چڑھی چڑھی پھرتی تھی۔ ماجدہ اس کے ساتھ کھیلتی تھی اور دلچسپ بات تو یہ تھی کہ ماجدہ نے اسے بنگالی کے چند الفاظ بھی سکھا دیئے تھے۔

ماجدہ اب صبح کے وقت نجمہ کی بہن منظوراں کے ساتھ کام پر جاتی تھی۔ منظوراں قریب ہی رہتی تھی اور اس کے کام کی جگہ پر اسے چھوڑ کر خود آگے چلی جاتی تھی۔ وہ دونوں راستے میں بہت سی باتیں کرتی جاتی تھیں۔ منظوراں کی اردو سرائیکی آمیز ہوتی تھی اور ماجدہ کی اردو بنگلہ آمیز، لیکن دونوں ایک دوسرے کی بات اچھی طرح سمجھ لیتی تھیں۔

اس روز بھی وہ صبح کے وقت منظوراں کے ساتھ جا رہی تھی اور اس کے دل میں سوزِ دروں کی ایک عجب کیفیت موجود تھی۔ گزشتہ رات اس نے ہاشم کو خواب میں دیکھا تھا۔ ان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گزرے ہوئے ماہ و سال کے دوران وہ نہ جانے کتنی بار ہاشم کو اور اپنے والدین کو، اپنے گاؤں کو خوابوں میں دیکھ چکی تھی۔ بعض اوقات یہ خواب بڑے ہی ناقابلِ فہم اور کسی حد تک مضحکہ خیز بھی ہوتے تھے۔ بڑے عجیب سے، منتشر اور ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے ہوتے تھے جن سے مل کر اکثر کوئی تصویر ٹھیک سے بنتی نہیں تھی، لیکن ایک بات بہرحال یقینی رہتی تھی اور وہ یہ کہ ان میں ان لوگوں کی صورتیں موجود ہوتی تھیں جو اسے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھے اور جن سے جدائی کا غم برداشت کرتے کرتے وہ نڈھال ہوگئی تھی۔

اس نے گزشتہ رات ہاشم کو عجیب اوٹ پٹانگ انداز میں خواب میں دیکھا تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ وہ اور ہاشم کھلنا کے سینما ہاؤس میں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے ہوئے فلم دیکھ رہے ہیں اور ان کے ساتھ وہ عورت بھی ہے جس نے ماجدہ کو پان کھلا کر بے ہوش کیا تھا۔ وہ عورت ان دونوں کے ساتھ بیٹھی فلم دیکھ رہی تھی اور پھر وہ ہنس ہنس کر ہاشم سے باتیں کرنے لگی..... اور پھر وہ ہاشم کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گئی اور ماجدہ حیران حیران نظروں سے ان دونوں کو اِدھر اُدھر تلاش کرنے لگی اور تب اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ دل میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔

منظوراں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس کے ذہن کے پردے پر ہاشم کی تصویر تھرتھرا رہی تھی۔ کاش وہ کسی طرح سے اڑ کر جا سکے اور سیدھی ہاشم کے پاس پہنچ جائے۔

اچانک درد کی اس شدت میں اور تنہائی کے بے کراں کرب میں سکون کے چند لمحوں کی تلاش میں وہ منظوراں سے مخاطب ہوئی۔ ''جلد ہی میرا شناختی کارڈ بن جائے گا اور پھر میں پوری طرح پاکستانی بن جاؤں گی۔'' اس نے منظوراں کو یہ خوشخبری سنانے میں احتیاط سے کام لیا تھا اور یہ ہرگز نہیں بتایا تھا کہ اس کے بعد وہ یہاں سے نکل بھاگنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اسے توقع تھی کہ منظوراں اسے اس بارے میں مزید کچھ بتائے گی۔ وہ شوکت اور سکندر سے زیادہ باتیں کر کے اپنے تجسس کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ حالات و تجربات اس کو اس کی عمر سے زیادہ کی سمجھ عطا کر رہے تھے لیکن منظوراں نے اس کو جو کچھ بتایا، وہ اس کے لیے حد درجہ حیرت انگیز تھا اور دردناک بھی۔

''کیا تمہاری عمر اٹھارہ سال ہوگئی ہے؟'' منظوراں نے اس سے پوچھا۔

''نہیں تو۔'' ماجدہ نے چونک کر کہا۔ ''میں تو ابھی گیارہ سال کی ہوئی ہوں۔''

''تو پھر تمہارا شناختی کارڈ کس طرح بن سکتا ہے؟'' منظوراں نے اسے گھورتے ہوئے

کہا۔ ''شناختی کارڈ بننے کے لیے اٹھارہ سال کی عمر ضروری ہوتی ہے۔ اس سے کم عمر کے بچوں کا رجسٹریشن ہوتا ہے، ان کا شناختی کارڈ نہیں بنتا۔ تم سے کس نے کہا کہ تمہارا شناختی کارڈ بن سکتا ہے۔''

ماجدہ نے حیرت اور غم کی گہرائیوں میں ڈوبتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھالا۔ وہ منظوراں کو بآسانی یہ بات بتا سکتی تھی کہ سکندر اور شوکت نے اس سے کہا ہے کہ اس کا شناختی کارڈ بن جائے گا اور انہوں نے فارموں پر اس کے دستخط بھی لے لیے ہیں، لیکن اس نے ایک فوری فیصلے کے تحت اپنے آپ کو ایسا کہنے سے روک لیا۔ اسے سوچنے کی ضرورت تھی۔

''وہ..... پڑوس کی ایک عورت کہہ رہی تھی کہ اب میرا شناختی کارڈ بن سکتا ہے۔'' ماجدہ نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

''وہ پاگل ہے، بے وقوف ہے۔'' منظوراں نے کہا۔ ''میرا بڑا بیٹا پندرہ سال کا ہے۔ اس کا شناختی کارڈ نہیں بنا ہے۔ میرا کارڈ ہے، میرے میاں کا کارڈ ہے، لیکن میرے کسی بچے کا کارڈ نہیں ہے۔ ان کا صرف رجسٹریشن ہوتا ہے، پھر جس بچے کی عمر اٹھارہ سال ہو جائے، اس کا شناختی کارڈ بن جاتا ہے۔ اس عورت نے تمہیں غلط بتایا ہے۔''

ماجدہ خاموش ہوگئی۔ اس نے منظوراں سے اس بارے میں مزید کوئی بات نہیں کی۔ وہ منظوراں کے ساتھ اس معاملے کو وہیں کا وہیں ختم کر دینا چاہتی تھی۔

منظوراں اسے بنگلے کے گیٹ پر چھوڑ کر آگے چلی گئی اور ماجدہ گیٹ کی کھلی ہوئی کھڑکی سے بنگلے کے اندر داخل ہوگئی۔

اس کے دل و دماغ میں ایک زبردست طوفان برپا ہوگیا تھا۔ اس نئے صدمے نے اس کو مزید کچل ڈالا تھا۔ اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ منظوراں غلط بیانی سے کام نہیں لے رہی ہوگی یا اس کی معلومات ناقص ہوں گی۔ وہ ایک سن رسیدہ عورت اور کئی بچوں کی ماں تھی۔ اس کا اور اس کے میاں کا شناختی کارڈ موجود تھا۔ وہ اس معاملے میں پوری معلومات رکھتی تھی اور کوئی غلط بات نہیں کہہ سکتی تھی۔

''تو پھر شوکت اور سکندر نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟'' وہ سوچ رہی تھی۔ ''اور وہ کاغذ کیسے تھے جن پر انہوں نے میرے دستخط لیے تھے؟''

اس نے تو شوکت یا سکندر سے درخواست نہیں کی تھی کہ وہ لوگ اس کا شناختی کارڈ بنوا دیں۔ اسے تو اس بارے میں کچھ زیادہ معلوم بھی نہیں تھا۔ شوکت اور سکندر نے یہ سب کچھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنی مرضی سے کیا تھا۔ وہ لوگ خود ہی فارم لے کر آئے تھے اور انہوں نے ماجدہ سے فارموں پر دستخط کروائے تھے۔

''کاش میں اردو پڑھ سکتی۔'' ماجدہ نے بڑے دکھ کے ساتھ سوچا۔ ''تو میں جان سکتی تھی کہ وہ فارم کس چیز کے تھے، اور وہ واقعی کوئی فارم تھے بھی یا نہیں.....''

اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے اٹھ رہے تھے اور وہ سخت حیران و پریشان ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنی اس نئی پریشانی کا حل کس سے دریافت کرے۔

کافی سوچ بچار کے بعد اس نے ایک فیصلہ تو یہ کیا کہ وہ شوکت اور سکندر کو یہ نہیں بتائے گی کہ اسے منظوراں کی زبانی یہ معلوم ہوا ہے کہ اٹھارہ سال سے کم عمر کے بچوں کے شناختی کارڈ نہیں بنائے جاتے، ان کا صرف رجسٹریشن ہوتا ہے اور ساتھ ہی اس نے یہ بھی طے کیا کہ وہ اس بارے میں کسی بہانے سے بیگم سے بھی پوچھے گی۔ بیگم ضرور اس کو بالکل صحیح جواب فراہم کرے گی کیونکہ وہ اس پر بہت مہربان تھی۔

چنانچہ اس نے شوکت اور سکندر کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا کہ منظوراں نے اس کو بتایا ہے کہ اٹھارہ سال سے کم عمر کے لڑکے یا لڑکی کا شناختی کارڈ نہیں بنتا۔ اس نے کئی دن گزر جانے کے باوجود ان دونوں سے شناختی کارڈ کے موضوع پر کوئی گفتگو نہیں کی۔

وہ کئی دن سے موقع کی تاک میں تھی کہ بیگم سے اس معاملے کے بارے میں کوئی پختہ معلومات حاصل کرے۔ اس روز گھر واپسی سے کوئی آدھا گھنٹہ پہلے اسے بیگم سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع مل گیا۔ اس نے اس بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے کئی باتیں پہلے سے سوچ رکھی تھیں جن میں سے کسی پر بھی موقع کے مطابق عمل کر کے وہ بالکل صحیح صورتِ حال کو جان سکتی تھی۔

ماجدہ باورچی خانے کا کام ختم کرنے کے بعد بیگم کی بچی تحسین کے ساتھ لان میں کھیل رہی تھی کہ اسی وقت بیگم بھی ادھر آ گئی، جسے دیکھتے ہی ماجدہ فوراً ہوشیار ہو گئی لیکن وہ تحسین کے ساتھ اس طرح کھیلتی رہی۔ بیگم ان دونوں کو دیکھ کر خوش ہوتی تھی۔

''بیگم صاحب، تحسین کا شناختی کارڈ کب بنے گا؟'' اچانک ماجدہ نے بڑی گہری سنجیدگی کے ساتھ بیگم سے پوچھا۔

''کیا؟ تحسین کا شناختی کارڈ؟'' بیگم نے قدرے حیرت کے ساتھ کہا۔ ''یہ تمہیں تحسین کے شناختی کارڈ کی یاد کہاں سے آ گئی؟''

''سب لوگوں کے پاس شناختی کارڈ ہوتا ہے بیگم صاحب۔'' ماجدہ نے کہا۔ ''تو کیا بچوں کے پاس بھی شناختی کارڈ ہوتا ہے؟''

بیگم اس کی بات سن کر زور زور سے ہنسنے لگی۔

''ہماری بستی میں بہت سے بنگالیوں کے پاس شناختی کارڈ ہیں۔'' ماجدہ نے بڑی معصومیت کے ساتھ کہا۔ ''لیکن.....شاید بچوں کے پاس نہیں ہیں۔''

''بچوں کے شناختی کارڈ نہیں ہوتے۔'' بیگم نے سنجیدگی سے کہا۔ ''صرف اٹھارہ سال یا اس سے زیادہ کی عمر کے لوگوں کے شناختی کارڈ بنائے جاتے ہیں۔ بچے جب تک اٹھارہ سال کی عمر کے نہیں ہو جاتے، ان کے شناختی کارڈ نہیں بنتے۔ تم بھی جب اٹھارہ سال کی ہو جاؤ گی تو اپنا شناختی کارڈ بنوا لینا.....''

''جی.....جی بیگم صاحب۔'' ماجدہ نے کمزور آواز میں کہا۔ ''اس میں تو ابھی بہت دیر ہے۔''

اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی اور بیگم جلدی سے بھاگتی ہوئی ٹیلیفون کے پاس چلی گئی۔ ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو ختم ہو گئی۔

تو.....تو.....منظوراں نے بالکل سچ کہا تھا۔ اس کا شناختی کارڈ نہیں بن سکتا تھا، کیونکہ اس کی عمر ابھی صرف گیارہ سال تھی۔

شوکت اور سکندر کے بہت سارے جھوٹوں میں ایک اور نئے جھوٹ کا اضافہ ہو چکا تھا لیکن ماجدہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس جھوٹ کی ضرورت کیا تھی اور اس کے پیچھے کون سا مقصد کارفرما تھا۔ یہ بات اتنی سیدھی سادی بھی نہیں تھی کہ اسے بآسانی نظر انداز کیا جا سکتا۔ ان لوگوں نے اس سے شناختی کارڈ کے نام پر کچھ کاغذات پر دستخط لیے تھے.....کیوں؟ کوئی نہ کوئی مقصد تو ضرور ہو گا۔

اس مقصد سے واقف ہونے کے لیے ماجدہ کو بہت دنوں تک انتظار کرنا پڑا۔

اس نے شوکت اور سکندر کو یہ قطعی نہیں بتایا کہ اسے یہ بات مصدقہ طور پر معلوم ہو چکی ہے کہ اٹھارہ سال سے کم عمر کے لوگوں کا شناختی کارڈ نہیں بنتا، تاہم کوئی ہفتہ بھر کے بعد اس نے شوکت سے اپنے شناختی کارڈ کے بارے میں پوچھا کہ وہ کب تک بن کر آئے گا۔

''آ جائے گا۔'' شوکت نے کہا۔ ''سرکاری کام ہیں، سرکاری لوگ یہ کام آسانی سے تو نہیں کر دیتے۔ انہیں وقت چاہیے ہوتا ہے اور رقم بھی.....''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماجدہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ تو صرف شوکت کے مؤقف کو جانچنا چاہتی تھی۔ شوکت ابھی تک اپنے سابقہ مؤقف پر قائم تھی۔

اس روز بھی سہ پہر کے تین بجے شوکت اسے لینے کے لیے آئی۔ وہ شوکت کے ساتھ بنگلے سے باہر آ گئی۔ بنگلے کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔ ماجدہ کو اس وقت بہت تعجب ہوا جب شوکت اس کار کے پاس جا کر رک گئی اور اس کے رکتے ہی کار کا پچھلا دروازہ بھی کھل گیا۔

''ہم عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر چل رہے ہیں۔'' شوکت نے ماجدہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''یہ لوگ ہمیں وہاں تک لے جائیں گے اور پھر واپس ہمارے گھر چھوڑ دیں گے۔''

ماجدہ اس بات سے خوش ہوئی۔ اس نے عبداللہ شاہ غازی کے مزار کے بارے میں سنا تھا جو کراچی میں کلفٹن کے علاقے میں واقع تھا اور جہاں موسیٰ کالونی سے بھی اکثر لوگ زیارت کے لیے جایا کرتے تھے۔ ماجدہ کو مزار کی زیارت پر جانے کی خوشی سے زیادہ گاڑی میں بیٹھ کر ایک لمبا سفر کرنے اور کلفٹن تک جانے کی خوشی تھی۔ اس نے کلفٹن صرف ایک بار دیکھا تھا جب شوکت اور سکندر اسے سلیمہ اور شازیہ کو یہاں لے کر آئے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب ماجدہ کو کراچی آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ شوکت اور سکندر اس کو ہمہ وقت خوفزدہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی دلجوئی کی بھی کوشش میں لگے رہتے تھے اور ماجدہ نے پہلی بار سمندر دیکھا تھا۔ شوکت سارا وقت اس کے ساتھ رہی تھی اور اس کا ہاتھ تھامے رہی تھی۔

''کہیں بھیڑ میں اِدھر اُدھر نہ ہو جانا۔'' شوکت نے اس سے کہا تھا۔ ''تم تو اردو بھی ٹھیک طرح نہیں بول سکتیں۔'' ماجدہ کو کلفٹن جانا اچھا لگا تھا۔ اس قسم کے کسی بھی موقع پر اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی تھی اور وہ تڑپ کر سوچتی تھی کہ کاش..... کاش..... یہاں ہاشم اس کے ساتھ ہوتا۔

آج ایک بار پھر اسے کلفٹن جانے کا موقع مل رہا تھا۔ چنانچہ وہ بڑی خوشی کے ساتھ تیار ہو گئی۔ جب وہ گاڑی میں داخل ہوئی تو اس نے ڈرائیور کے علاوہ دو آدمیوں کو وہاں موجود پایا۔ وہ ان میں سے ایک کو فوراً پہچان گئی۔ یہ آدمی کچھ دن پہلے ایک دوسرے شخص کے ساتھ سکندر کے پاس آ چکا تھا اور وہ ان لوگوں کے لیے چائے لے کر گئی تھی۔ ماجدہ کو پچھلی سیٹ پر ان دونوں آدمیوں کے درمیان بٹھا دیا گیا اور شوکت اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے برابر بیٹھ گئی۔ کسی

نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ یقیناً ان لوگوں کو پہلے سے معلوم ہو گا کہ کہاں جانا ہے۔ گاڑی فیڈرل بی ایریا کے علاقے سے نکل کر کلفٹن کے طویل سفر کے لیے روانہ ہو گئی اور بالآخر مزار پر پہنچ گئی۔ وہ لوگ طویل سیڑھیاں چڑھ کر اوپر مزار تک گئے۔ ان لوگوں نے نیچے سے ہی بہت سے ہار پھول خرید لیے تھے جو انہوں نے مزار پر چڑھائے اور کچھ دیر تک وہاں رکنے کے بعد واپس آ گئے۔ انہوں نے کچھ دیر تک سمندر کی سیر بھی کی اور ماجدہ کو اس بات سے بہت خوشی ہوئی کہ اسے ایک بار پھر سمندر دیکھنے کا موقع ملا۔

جب وہ لوگ وہاں سے روانہ ہوئے تو شام ہو گئی تھی اور اجالے کا رنگ سرمئی ہو گیا تھا۔ واپسی کا سفر بھی خاصا طویل تھا اور پھر یہ سفر بالکل غیر متوقع طور پر کسی دوسری ہی جگہ جا کر ختم ہو گیا۔

گاڑی کسی مکان کے گیٹ میں داخل ہوئی اور ماجدہ نے چونک کر دیکھا کہ وہ کسی اور جگہ آ گئی ہے۔ ''شاید..... شوکت کو یہاں کچھ کام ہو.....'' اس نے دل میں سوچا۔

گاڑی رکی اور وہ سب لوگ نیچے اتر آئے اور اندر کی طرف بڑھے۔ ماجدہ حیران تھی کہ وہ کہاں آ گئی ہے اور یہ کون لوگ ہیں۔ اس نے گھبرا کر شوکت کی طرف دیکھا، لیکن وہ اسے بالکل مطمئن نظر آئی۔ وہ لوگ ایک کمرے میں داخل ہو گئے، جو کافی بڑا اور سجا سجایا تھا۔ وہ لوگ وہاں صوفوں پر بیٹھ گئے۔ کمرے کی آرائش و زیبائش میں ماجدہ کے لیے کوئی بھی چیز حیرانی کا باعث نہیں تھی، کیونکہ وہ جس بنگلے میں کام کرتی تھی اس بنگلے کے کمرے اس سے بھی زیادہ عمدہ طور پر سجے سجائے تھے۔

ان تینوں آدمیوں میں سے جو گاڑی میں تھے، صرف ایک آدمی کمرے میں آیا تھا۔ یہ وہی آدمی تھا جسے ماجدہ پہلے سے پہچانتی تھی۔ وہ ایک سن رسیدہ آدمی تھا اور قیمتی شلوار سوٹ میں ملبوس تھا۔ وہ ایک صوفے پر ماجدہ کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

''تمہیں کلفٹن جانا اچھا لگا؟'' اس نے مسکرا کر ماجدہ سے پوچھا اور ماجدہ کو تعجب ہوا کہ وہ شخص اس سے اس طرح کیوں بات کر رہا تھا۔ وہ دونوں تو ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں تھے۔

''ہاں۔'' ماجدہ نے آہستہ سے گردن ہلا دی۔

اسی وقت ایک عورت ایک ٹرالی دھکیلتی ہوئی کمرے کے اندر آ گئی۔ ٹرالی میں چائے کی پیالیاں اور کھانے پینے کا بہت سارا سامان بھرا ہوا تھا۔ ماجدہ کو یہ سب کچھ ناقابلِ یقین سا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لگ رہا تھا۔ اس کے ساتھ تو یہاں معزز مہمانوں جیسا سلوک کیا جا رہا تھا۔ وہ بنگلے میں کام کرنے والی ایک ادنیٰ سی غریب الوطن خادمہ..... کیا وہ واقعی اس قسم کی میزبانی کی مستحق تھی؟ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ماجرا کیا ہے اور یہ کن لوگوں کا گھر ہے۔ وہ آدمی شوکت اور سکندر کے گھر میں ایک دو بار آ چکا تھا اور ماجدہ اسے پہچانتی تھی۔ پچھلی دفعہ تو وہ خود ہی اس کے لیے چائے لے کر گئی تھی، تو شاید اب جبکہ شوکت اس کے گھر آئی تھی تو وہ اس کی میزبانی کر رہا تھا۔ یہ گویا ایک طرح سے جوابی کارروائی تھی۔

یہ بات کسی حد تک اس کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے اپنی حیرت پر قدرے قابو پا لیا لیکن پھر بھی، کہاں موسیٰ کالونی کا وہ ادنیٰ سا گھر اور کہاں یہ شاندار بنگلہ.....

''لو ماجدہ۔'' اس آدمی نے بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ٹرالی میں سے ایک خالی پلیٹ اٹھا کر ماجدہ کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ ''جو چیزیں تمہیں پسند ہوں، وہ لے لو۔ خوب اچھی طرح کھاؤ۔''

شوکت سے کہنے کی ضرورت نہیں پیش آئی۔ اس نے تو خود ہی جلدی سے ہاتھ بڑھا کر ایک پلیٹ اٹھالی تھی اور ٹرالی میں سے مختلف چیزیں اٹھا اٹھا کر اپنی پلیٹ میں رکھنے لگی۔

''آپ بھی تو کچھ لیجیے سائیں۔'' شوکت نے ایک سموسہ دانتوں سے کترتے ہوئے اس شخص سے کہا۔ ''آپ بھی پلیٹ اٹھایئے۔''

''ہاں ہاں، میں بھی لوں گا۔'' اس شخص نے کہا اور ایک پلیٹ اٹھالی۔

''ان کا نام شریف الدین ہے۔'' شوکت نے پہلی بار اس شخص کے بارے میں کچھ بتاتے ہوئے ماجدہ سے اردو میں کہا۔ ''یہ بہت بڑے رئیس اور زمیندار ہیں، بہت دولت مند آدمی ہیں۔''

ماجدہ رئیس اور زمیندار کا مطلب جانتی تھی۔ یہ شخص واقعی بہت دولت مند معلوم ہوتا تھا۔

''ان کی زمینیں اور جاگیر پنجاب کے شہر بہاولنگر میں ہیں۔'' شوکت نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے اردو میں کہا۔ ''کراچی میں بھی ان کی جائیداد ہے۔ شریف الدین بہت اچھے آدمی ہیں۔''

شریف الدین آہستہ سے ہنسا۔ ''ارے بھائی، اچھے تو تم لوگ ہو..... اچھا لو، کچھ کھاؤ پیو۔ ماجدہ..... تم یہ لو..... یہ رس گلا ہے۔ بنگالی دکان کا رس گلا..... بالکل بنگال جیسا۔'' اس

نے ایک رس گلا ماجدہ کی پلیٹ میں ڈال دیا۔

کھانے پینے اور چائے کا دور ختم ہوا تو شوکت اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے ماجدہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''میں ذرا قریب ہی ایک دوسری جگہ جا رہی ہوں، ابھی تھوڑی دیر میں آ جاؤں گی، پھر واپس گھر چلیں گے۔''

''میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی چاچی۔'' ماجدہ نے گھبرا کر اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں یہاں اکیلی بیٹھ کر کیا کروں گی؟''

''مجھے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔'' شوکت نے اس کی بات کو سنی اَن سنی کر کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''میں بس ابھی پندرہ بیس منٹ میں یہاں واپس آ جاؤں گی۔ جب تک تم یہاں رکو..... اور اس کے ساتھ ہی وہ کمرے کے دروازے سے باہر نکل گئی۔ شریف الدین کمرے میں ہی رہا۔

''تم کچھ اور کھاؤ ماجدہ۔'' شریف الدین نے بڑے نرم لہجے میں ماجدہ سے کہا۔ ٹرالی میں ابھی بہت ساری چیزیں موجود تھیں لیکن ماجدہ گھبرا رہی تھی۔ یہ جو کچھ ہو رہا تھا، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور اگر کچھ سمجھ میں آ رہا تھا تو اس میں ایک انجانے خوف کا عنصر شامل تھا۔ اب اس کا کچھ کھانے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ آخر شوکت اسے یہاں ایک اجنبی گھر میں، اجنبی لوگوں کے درمیان چھوڑ کر کہاں چلی گئی تھی اور کیوں چلی گئی تھی۔

شریف الدین اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا لیکن ماجدہ کو اس کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے بجائے اسے اب سخت وحشت ہونے لگی تھی۔ کچھ دیر کے بعد شریف الدین وہاں سے چلا گیا اور ماجدہ کمرے میں اکیلی رہ گئی۔ بہت دیر گزر گئی۔ ماجدہ کو سخت وحشت ہونے لگی۔ وہ یہاں سے بھاگنا چاہتی تھی۔

تب وہ عورت کمرے میں داخل ہوئی جو چائے کی ٹرالی لے کر آئی تھی۔

''تم نے کچھ کھایا ہی نہیں۔'' اس نے بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ماجدہ سے کہا۔ ''اور کچھ کھا لو۔ یہاں کھانے کو بہت ہے، اللہ سائیں کے حکم سے کسی چیز کی بھی کمی نہیں ہے۔''

''نہیں، میں اب اور کچھ نہیں کھاؤں گی۔'' ماجدہ نے کہا۔ ''میں تو بس شوکت چاچی کا انتظار کر رہی ہوں۔ اتنی دیر ہو گئی اور وہ اب تک نہیں آئیں۔''

''شوکت چاچی نے تمہیں کچھ بتایا نہیں؟'' اس عورت نے ماجدہ کی آنکھوں میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آنکھیں ڈال کر کہا۔

''کیا؟'' ماجدہ نے چونک کر کہا۔ ''کیا؟ کیا نہیں بتایا؟ تم..... کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''یہی کہ شوکت اب یہاں تمہیں لینے نہیں آئے گی۔ وہ تو تمہیں تمہاری سسرال میں چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ تم اب اپنے شوہر کے گھر میں ہو۔''

''کیا؟'' ماجدہ ایک چیخ مار کر اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔ ''شوہر؟ کیسا شوہر؟ میری تو ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔''

''تعجب ہے۔'' عورت نے کہا۔ ''تمہاری تو شادی ہو چکی ہے۔ بالکل پکی شادی، سائیں شریف الدین کے ساتھ، اور شوکت اور اس کے میاں نے یہ شادی خود کرائی ہے۔ سائیں شریف الدین تمہارے شوہر ہیں، تم ان کی بیوی ہو۔''

''نہیں نہیں..... بالکل نہیں۔'' ماجدہ نے تڑپ کر روتے ہوئے کہا۔ ''یہ جھوٹ ہے..... یہ سب جھوٹ ہے۔ میری کسی سے شادی نہیں ہوئی، کبھی نہیں ہوئی۔ شوکت چاچی اور سکندر چاچا جھوٹ بولتے ہیں۔ میری کوئی شادی نہیں ہوئی ہے۔''

اس وقت شریف الدین کمرے میں داخل ہوا۔ ماجدہ نے پہلی بار اس کو جانچنے والے انداز میں دیکھا۔ اس کی عمر ماجدہ کو اپنے باپ سے زیادہ لگ رہی تھی۔ چہرے کی کھال کئی جگہ سے ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ چہرہ بہت موٹا تھا اور ٹھوڑی اور گردن ایک دوسرے میں ضم نظر آتے تھے۔ بڑا سا پیٹ آگے کو نکلا ہوا تھا۔

تو یہ تھا اس کا ''شوہر!''

''شوکت اور سکندر جھوٹ نہیں بول رہے ہیں ماجدہ۔'' شریف الدین نے ماجدہ کی طرف دیکھ کر سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ''وہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تمہاری میرے ساتھ شادی ہو چکی ہے اور اب تم میری بیوی ہو۔''

''نہیں سائیں نہیں.....'' ماجدہ نے روتے ہوئے کہا۔ ''انہوں نے آپ سے جھوٹ بولا ہے۔ میں اس شادی کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ میری کوئی شادی نہیں ہوئی ہے۔''

''تمہاری شادی ہوئی ہے.....'' شریف الدین نے اپنی بات پر اصرار کیا۔ ''بالکل جائز اور قانونی طریقے سے..... جس طرح شادیاں ہوتی ہیں۔ تم نے نکاح نامے پر دستخط کیے ہیں۔''

''نکاح نامے پر دستخط؟'' ماجدہ نے چونک کر کہا اور اس کے ساتھ ہی اس کے دل و

دماغ پر بجلی سی گر گئی۔ ان لوگوں کا کھیل اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔

''ہاں..... نکاح نامے پر دستخط.....'' شریف الدین نے کہا اور پھر اپنی جیب میں سے ایک کاغذ نکال کر ماجدہ کو دکھایا۔ ''یہ دیکھو.....'' اس نے ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہارے دستخط ہیں یا نہیں؟ یہ ہمارا نکاح نامہ ہے۔ تم نے اس پر خود دستخط کر کے مجھے اپنے شوہر کے طور پر قبول کیا ہے۔''

ماجدہ نے اس کاغذ کو ایک لحظے میں پہچان لیا۔ یہ ان چار کاغذوں میں سے ایک تھا جن پر شوکت اور سکندر نے اس سے یہ کہہ کر دستخط کروائے کہ یہ اس کے شناختی کارڈ بنوانے کے فارم ہیں اور اس نے خوشی خوشی ان پر اردو میں اپنے دستخط کر دیئے تھے۔

''میں نے کسی نکاح نامے پر دستخط نہیں کیے تھے۔'' ماجدہ نے بلک بلک کر روتے ہوئے کہا۔ ''ان لوگوں نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ یہ شناختی کارڈ کے فارم ہیں اور میں ان پر اپنے دستخط کر دوں تو میرا شناختی کارڈ بن جائے گا۔''

''نہیں.....'' شریف الدین نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ان فارموں کا شناختی کارڈ سے کوئی تعلق نہیں، یہ نکاح نامہ ہے اور میرا اور تمہارا باقاعدہ نکاح ہو چکا ہے۔ اب تم میری بیوی ہو اور میں تمہارا شوہر ہوں۔''

''لیکن مجھ سے تو کسی نے نہیں پوچھا سائیں۔'' ماجدہ نے روتے ہوئے کہا۔ ''مجھ سے تو کسی نے نہیں پوچھا۔ میں نے تو ہاں نہیں کی..... یہ سب غلط ہے سائیں..... ان لوگوں نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ سب نے مجھے دھوکا دیا ہے۔'' ماجدہ زار و قطار رونے لگی۔ شدتِ غم سے اس کا کلیجہ شق ہوا جا رہا تھا۔

''اب اس رونے دھونے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' کمرے میں موجود عورت نے کہا۔ ''نکاح تو ہو چکا ہے تمہارا..... اور اب یہ کوئی ٹوٹ تھوڑی سکتا ہے اور یہ نکاح تمہارے چاچا چاچی کی مرضی اور اجازت سے ہوا ہے۔ ان لوگوں نے تمہیں اپنے گھر سے رخصت کر دیا ہے۔ اب ان کا گھر تمہارا گھر نہیں ہے۔ تمہارا گھر اب یہی ہے سائیں شریف الدین کا گھر.....''

''چند دن تک یہاں رہو، پھر ہم اپنے شہر چلیں گے..... بہاولنگر..... وہاں تم آرام سے رہنا۔ پھر تمہیں کسی کے گھر جا کر کام کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔''

شریف الدین کمرے سے چلا گیا اور وہ عورت ماجدہ کے پاس بیٹھ گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''میرا نام تسلیم ہے۔'' اس عورت نے نرمی سے ماجدہ سے کہا۔ ''میں سائیں شریف الدین کے خاندان کی پرانی خادمہ ہوں، تم مجھے تسلیم چاچی کہہ سکتی ہو اور دیکھو..... اب پرانی باتوں کو دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ سائیں نے تم سے شادی کر لی ہے اور تمہارے چاچا چاچی نے سائیں کے ساتھ تمہاری شادی کر دی ہے۔ لڑکیوں سے ان کی مرضی نہیں پوچھی جاتی۔ ان کے بزرگ جہاں مناسب سمجھتے ہیں، ان کی شادی کر دیتے ہیں۔ اب تم اپنے دل پر اس بات کا بوجھ مت لو۔ اب تمہیں سائیں کے ساتھ ہی رہنا ہے۔ اس کا حکم ماننا ہے۔ شوہر تو عورت کے سر کا تاج ہوتا ہے۔ اب وہی تمہارے سر کا تاج ہے۔ اس کو ناراض مت کرنا۔''

ماجدہ نے تسلیم کی زبان سے نرمی اور ہمدردی کے انداز میں جب یہ سب کچھ سنا تو وہ اور بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ چاروں طرف پھیلے ہوئے گہرے اندھیرے میں تسلیم اسے روشنی کی ایک مہربان کرن کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔

''میں کیا کروں، تسلیم چاچی۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔ ''مجھ سے تو کسی نے نہیں پوچھا۔ مجھے بتایا تک نہیں کہ میری شادی کی جا رہی ہے۔ مجھے تو اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔''

''چلو، اب تو معلوم ہو گیا۔'' تسلیم نے آہستہ سے کہا۔ ''اب تم اپنے آپ کو تیار کر لو، تمہاری نئی زندگی شروع ہونے والی ہے۔ آج رات آرام کرو۔ آج سائیں کسی ضروری کام میں مصروف ہیں۔ کل وہ تمہارے ساتھ ہوں گے۔'' ماجدہ کے سارے وجود میں ایک خوف آمیز لرزش دوڑ گئی۔ تسلیم کے الفاظ اس کے دل و دماغ پر ہتھوڑوں کی طرح برس رہے تھے۔ اس سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا، وہ صرف روئے جا رہی تھی۔ تسلیم اسے تسلیاں دے رہی تھی۔

''تم خوش قسمت ہو کہ سائیں نے تم سے نکاح کیا ہے۔'' تسلیم نے کہا۔ ''سائیں کے پاس بہت دولت ہے۔ وہ بہت مالدار ہیں۔ تم ان کی بیوی بن کر خوش رہو گی۔''

ماجدہ اس کی باتیں سن رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں ہاشم کی تصویر گھوم رہی تھی۔ نوعمر، نوجوان، سجیلا، سبک، مہربان، آنکھوں کی راہ سے دل میں اتر جانے والا ہاشم..... وہ کہاں رہ گیا تھا۔ کتنی دور رہ گیا تھا..... اور یہاں تو سب کچھ لٹا جا رہا تھا۔ اس لوٹ کو روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ خود بھی اس قدر بے بس ہو چکی تھی کہ اپنے آپ کو لوٹے جانے سے نہیں بچا سکتی تھی۔

تسلیم نے اسے کھانا دیا لیکن اس نے کچھ کھانے سے انکار کر دیا۔ تب تسلیم نے اس کمرے میں رکھا ہوا ٹی وی چلا دیا۔

''تمہارے لیے کمرہ پہلے سے ٹھیک کر دیا گیا ہے۔'' اس نے ماجدہ سے کہا۔ ''تم جب بھی سونا چاہو سونے کے لیے جا سکتی ہو۔ ابھی کچھ دیر تک ٹی وی دیکھو۔ میں ابھی تھوڑی دیر بعد آؤں گی۔''

تسلیم کمرے سے باہر چلی گئی۔ ماجدہ کو ٹی وی پر چلنے والی فلم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی اپنی زندگی کی المیہ فلم اس کے اعصاب کو جھنجھوڑے ڈال رہی تھی۔

معلوم نہیں، کتنی دیر گزر گئی اور ٹی وی پر آنے والی فلم کب ختم ہوئی اور اس کی جگہ کوئی دوسرا پروگرام شروع ہو گیا۔ ماجدہ کچھ نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کا دماغ جیسے سن ہو گیا تھا اور اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو گئی تھی۔ خوف کا ایک مرحلہ ختم نہیں ہو پاتا تھا کہ دوسرا مرحلہ شروع ہو جاتا تھا۔ پہلے سے زیادہ خطرناک.....

بہت دیر کے بعد جب تسلیم دوبارہ کمرے میں آئی تو اس نے ماجدہ کو اسی طرح اس جگہ بیٹھے ہوئے پایا جہاں وہ اسے چھوڑ کر گئی تھی۔ وہ تو وہاں سے ہلی بھی نہیں تھی۔

''اب اگر تم سونا چاہو تو اپنے کمرے میں چل سکتی ہو۔'' تسلیم نے اس سے کہا۔

ماجدہ کے لیے سب کمرے ایک جیسے تھے۔ وہ کسی بھی کمرے میں جاتی، اس کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس کے لیے تو یہ ساری دنیا ایک قفس بن کر رہ گئی تھی۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ بیٹھے رہنے سے شاید لیٹ جانا اچھا تھا۔

تسلیم اسے ایک دوسرے کمرے میں لے آئی۔ یہاں ایک ایسا صاف ستھرا نرم و گداز اور آرام دہ بستر اس کا منتظر تھا جس کے لمس سے وہ یکسر نا آشنا تھی۔ اس نے ایسے، بلکہ اس سے بھی بہتر بستر دیکھے تھے، اس گھر میں جہاں وہ کام کرتی تھی، لیکن وہ ان بستروں کو صرف دیکھ سکتی تھی یا زیادہ سے زیادہ چھو سکتی تھی۔ ان پر بیٹھنے یا لیٹنے کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

لیکن وہ نہایت درجہ غیر معمولی راحت جو ایسے بستر پر بیٹھنے یا لیٹنے کے عمل سے وابستہ تھی، ماجدہ کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ اس کے لیے تو یہ سب کچھ کسی مردہ دنیا کا حصہ تھا۔

''یہ تمہارا کمرہ ہے اور یہ اس کے ساتھ غسل خانہ ہے۔'' تسلیم نے اسے بتایا۔ ''بجلی کے سوئچ یہاں اس طرف ہیں۔ تم آرام سے لیٹ کر سو جاؤ۔ تمہارے رات کو پہننے کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کپڑے غسل خانے میں موجود ہیں، بدل لینا۔ اگر اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دو۔''

''نہیں، مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔'' ماجدہ نے آہستہ سے کہا۔

''اور ہاں، رات کو کمرے سے باہر نکلنے کی کوشش نہ کرنا۔ ٹامی بڑا بھاری بھرکم کتا ہے اور اسے رات کو کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ویسے تو یہاں چوکیدار رہتے ہیں، لیکن سائیں نے حفاظت کی غرض سے کتا بھی پالا ہوا ہے۔''

تسلیم اسے ساری ضروری ہدایات دے کر رخصت ہو گئی اور دروازہ بند کرتی گئی۔ ماجدہ کو ایسا لگا جیسے اس نے دروازے کو باہر سے لاک کر دیا ہو۔

ماجدہ نے کپڑے بدلنے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ وہ اپنے انہی کپڑوں میں، جو اس کے جسم پر تھے بستر پر لیٹ گئی۔ اس کے جسم نے ایسے بستر کے نشاط آفریں لمس کا اس سے پہلے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا لیکن اب جو اتفاق سے یہ لمس اسے میسر آیا تھا، تو اس کو اپنے تن بدن میں کانٹے چبھتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

رات میں اسے بمشکل کچھ دیر کے لیے نیند آ سکی۔ ذرا سی آنکھ لگتی تھی تو طرح طرح کے ڈراؤنے اور گھناؤنے خواب نظر آنے لگتے تھے اور وہ چونک جاتی تھی۔ کئی بار باہر سے کسی کتے کے غرانے اور بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ کئی بار اسے ایسا بھی لگا جیسے کوئی کمرے کے بند دروازے کو کھرچ رہا ہو، اسے دھکیل کر کھولنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ساری رات ایسی ہی اذیت اور کرب میں گزری..... اور اس سے اگلا دن بھی اسی طرح گزرا۔ تسلیم سارا دن اس کی دلجوئی میں لگی رہی۔ شریف الدین سے دن میں اس کی ملاقات نہیں ہوئی۔

رات کو تسلیم نے اسے دلہن کی طرح سجایا اور اسے بہت کچھ سمجھاتی اور بتاتی رہی۔ اس کی باتیں سن سن کر ماجدہ بدحواس ہوئی جا رہی تھی۔

''یہ رات ہر عورت کی زندگی میں صرف ایک بار آتی ہے۔'' تسلیم نے اس سے کہا۔

''پھر چاہے ہزاروں راتیں کیوں نہ آئیں لیکن سہاگ رات بس ایک بار ہی آتی ہے۔''

ہاشم..... ہاشم..... ماجدہ کی روح کی گہرائیوں میں بس ایک ہی زخمی آواز بلند ہو رہی تھی۔

ماجدہ کو گیارہ سال سے کچھ زیادہ کی عمر میں جس ہولناک کرب سے گزرنا پڑا، اس نے اس کے وجود کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا۔ اس رات اس کے سارے خواب کرچی کرچی ہو گئے۔ ہاشم کہیں بہت دور کھڑا ہوا خون کے آنسو بہاتا رہا اور اس کے آنسوؤں میں ماجدہ کے

خون بھرے آنسو بھی شامل ہوتے رہے۔

☆======☆======☆

گزشتہ دو سال سے کچھ زیادہ کی مدت کے دوران گیارہ سالہ ماجدہ زندگی کے جن درد انگیز اور ہولناک تجربات سے گزرتی چلی آئی تھی، اس رات کا تجربہ ان میں سب سے زیادہ جان لیوا تھا۔ اس تجربے نے اس کو جیتے جی مار ڈالا۔ وہ ساری رات ٹوٹتی اور بکھرتی رہی اور اپنے دلِ لخت لخت کو جمع کرنے کی کوشش کرتی رہی لیکن نہ تو دلِ لخت لخت قابو میں آ رہا تھا اور نہ تنِ زار زار.....

صبح ہوئی تو اس پر گویا یہ انکشاف ہوا کہ اب وہ کسی اور ہی دنیا کی باسی بن چکی ہے..... تو یہ تھا سارے ناٹک کا آخری سین.....

دو سال پہلے کھلنا کے گھاٹ پر اس کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا تھا وہ کیسے کیسے سنگلاخ راستوں سے گزرتا ہوا آج بالآخر اپنے انجام تک پہنچ چکا تھا۔ دو سال کا یہ عرصہ اس کے لیے دھوکے، مکر و فریب، جھوٹ، دغابازی اور بدمعاشی سے بھرا ہوا عرصہ تھا۔

اس کے اس بھیانک سفر کا آغاز بنگلہ دیش سے ہوا تھا اور وہ تین ملکوں کی خاردار راہوں سے گزر کر یہاں تک پہنچی تھی۔ بنگلہ دیش..... ہندوستان..... پاکستان..... ہر جگہ سب کچھ ایک ہی جیسا تھا۔ اینا ؤں، شاہ میاؤں، نوروؤں اور ممدوؤں کا سلسلہ بنگلہ دیش سے شروع ہو کر پاکستان تک پوری آزادی اور بے خوفی کے ساتھ کارفرما تھا اور کوئی ان لوگوں کو روکنے والا نہ تھا۔

اس کو لگ رہا تھا کہ اس کے جسم کا سودا یا تو اسی وقت ہو گیا تھا جب اس نامعلوم عورت نے اسے کھلنا میں ندی کے کنارے گھاٹ پر پان کھلایا تھا، اسی لمحے اور اسی جگہ اس کی تقدیر کا فیصلہ ہو چکا تھا اور درمیان میں آنے والے، ملنے والے جتنے بھی لوگ تھے وہ اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کی راہ میں اپنا اپنا کردار ادا کر کے غائب ہوتے رہے تھے۔

وہ بہت ساری باتیں جو پہلے اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں، یا کم کم آتی تھیں، اس ایک رات کے بعد بڑی آسانی سے سمجھ میں آنے لگی تھیں۔ اس ایک رات میں اس نے شعور و آگہی کی نہ جانے کتنی منزلیں طے کر لی تھیں۔ ان تمام لوگوں کے مقاصد سے وہ پوری طرح واقف ہو گئی تھی جن کے ہاتھوں سے گزر کر وہ یہاں تک پہنچی تھی۔ بنگلہ دیش سے پاکستان کا غیر قانونی سفر جس کی سہولت فراہم کرنے میں بنگلہ دیش، ہندوستان اور پاکستان تینوں ملکوں کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سرکاری لوگ رشوت لے لے کر شامل تھے بدی سے بدی تک کا سفر تھا۔ اس سفر کے دوران اسے اپنی شدید خواہش اور کوشش کے باوجود نیکی کی کوئی منزل نہیں ملی تھی۔

اسے اغوا کر لیا گیا تھا، جس طرح ان دونوں لڑکیوں میمونہ اور فردوسی کو اغوا کیا گیا تھا اور پھر انہیں پاکستان لا کر عیاش مردوں کی جھولی میں ڈال دیا گیا تھا اور اس طویل اور پُر پیچ عمل میں خود اس کے ہم وطنوں کا سب سے زیادہ حصہ تھا۔ اب وہ اس بات کو بخوبی سمجھ سکتی تھی کہ میمونہ اور فردوسی کو پاکستان میں داخل ہوتے وقت ہی اس شہر میں جہاں ان لوگوں نے قیام کیا تھا، کسی کی جھولی میں ڈال دیا گیا تھا اور وہ بھی اس کی طرح نہ جانے کیسے کیسے لوگوں کے گھروں میں قید ہوں گی۔ وہ اب شازیہ اور سلیمہ کی ''شادی'' کا مطلب بھی بہت اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ اسے وہ لوگ یاد آئے جو ان ''شادیوں'' سے چند روز پہلے شوکت اور سکندر کے گھر آئے تھے۔ سلیمہ چائے لے کر گئی تھی اور شازیہ کو برتن اٹھانے کے لیے بلوایا گیا تھا۔

سب کچھ صاف نظر آ رہا تھا۔ شوکت اور سکندر نے ان دونوں غریب، یتیم لڑکیوں کے دام بھی کھرے کر لیے تھے۔ برسوں تک وہ لوگ ان سے محنت مزدوری کرواتے رہے اور رقم اپنے قبضے میں کرتے رہے اور جب وہ بڑی ہو گئیں تو ان کو شادی کے نام پر بیچ دیا..... اور یہی سب کچھ اس کے اپنے ساتھ بھی ہوا۔

موسیٰ کالونی آنے کے کچھ ہی دنوں کے بعد شوکت نے اسے بھی کام پر لگایا تھا اور اس کو کبھی یہ نہیں معلوم ہو چکا تھا کہ اس کو کتنی تنخواہ ملتی ہے۔ اس نے کبھی تنخواہ کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی تھی۔ شوکت سارے پیسے اپنی جیب میں رکھتی تھی، اور پھر جیسے ہی وہ ''بڑی'' ہو گئی، ویسے ہی اس کو بھی شادی کے نام پر کسی بہت ہی دولت مند عیاش کے حوالے کر دیا گیا۔

ماجدہ اب اس زنجیر کی ساری کڑیوں کو بالکل واضح طور پر دیکھ سکتی تھی انہیں گن سکتی تھی اور ان کی پکڑ کو پوری طرح محسوس کر سکتی تھی۔

اصل معاملے کی ساری تہیں ایک ایک کر کے کھلتی جا رہی تھیں۔ ماجدہ کو قافلے میں شامل وہ عورت یاد آ رہی تھی جس نے ان تین لڑکیوں کے پاس آ کر ان سے بات کرنے کی کوشش کی تھی، مگر اسے ڈانٹ کر بھگا دیا گیا تھا اور دھمکی دی گئی تھی کہ اگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئی تو اسے قافلے سے نکال باہر کیا جائے گا۔

اسے اردو میں نام لکھنا کیوں سکھایا گیا تھا اور اس کی مشق کیوں کرائی گئی تھی۔ شوکت یہ بات سن کر اس قدر خوش کیوں ہوئی تھی کہ ماجدہ بالغ ہو گئی ہے..... سب کچھ واضح ہو گیا تھا۔

ان لوگوں نے کتنی دور تک کی باتیں سوچ رکھی تھیں۔ انہیں اس لمحے کا انتظار تھا جب ماجدہ ''بڑی'' ہو جائے۔ یہ لمحہ ان کے لیے بہت قیمتی تھا۔ انہیں اس کی پوری پوری قیمت وصول کرنی تھی۔

ساری رات سوتے جاگتے، غنودگی، نیم غنودگی اور بیداری کے عالم میں، بے کراں ذہنی، روحانی اور جسمانی اذیت کے طرح طرح کے رنگ بدلتے ہوئے لمحات کے دوران ہاشم کی شکل اس کی دھندلاتی ہوئی نظروں کے سامنے ابھرتی رہی۔

ماجدہ پر ایک نیم مردہ خود فراموشی کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ اپنے آپ کو زندگی اور موت کے درمیان کی کسی منزل پر کھڑا ہوا پا رہی تھی۔ شاید کوئی منزل ایسی بھی ہوتی ہے جو زندگی ہوتی ہے اور نہ موت ہوتی ہے۔ انسان خود کو زندہ تصور کر سکتا ہے اور نہ مردہ گردان سکتا ہے۔ یہ انتہائے یاس اور ناقابلِ برداشت صدمے کے عروج کی منزل ہوتی ہے۔

ماجدہ صبح کو دیر تک بستر پر بے سدھ پڑی رہی۔ آسودہ و مطمئن، فاتح و سرخرو شریف الدین تو صبح کو جلد ہی اس کے پہلو سے اٹھ کر باہر چلا گیا تھا۔ ماجدہ اپنے ٹوٹے پھوٹے وجود کے ساتھ بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ اسے بستر سے اٹھنے کی نہ کوئی جلدی تھی نہ خواہش۔ اس کے لیے اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ جاگ رہی ہے، سو رہی ہے، آرام کر رہی ہے یا کسی کام میں مصروف ہے۔ کام اس کے لیے کوئی بھی نہیں تھا۔ بہت دنوں کے بعد اس کی زندگی میں ایک ایسی صبح آئی تھی جس میں کام کے لیے بھاگنے کی کوئی جلدی شامل نہیں تھی۔ اسے کہیں نہیں جانا تھا، اسے کچھ نہیں کرنا تھا، وہ جب تک چاہے بستر پر پڑی رہ سکتی تھی اور قسمت نے اس کو ایک ایسی صبح بخشنے کی اس سے کتنی بڑی قیمت وصول کی تھی۔ اتنی بڑی قیمت کہ اس کو بالکل قلاش کر دیا تھا۔

کافی دن چڑھے تسلیم اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ تھی جس میں کچھ درد کا شائبہ بھی شامل معلوم ہوتا تھا۔

''اب اٹھ جاؤ۔'' اس نے ماجدہ کے پاس آ کر کہا۔ ''نہا لو..... کپڑے تبدیل کر لو..... پھر میں تمہارے لیے ناشتہ لاؤں گی، سائیں تو صبح ہی صبح کسی کام سے نکل گئے ہیں اور اب وہ دوپہر کے کھانے پر آئیں گے۔ مجھ سے کہہ کر گئے ہیں کہ تمہارا پوری طرح خیال رکھوں۔''

زندہ تو بہر حال رہنا تھا..... اور اگر انسان زندہ رہتا ہے تو زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے پر بھی مجبور ہوتا ہے۔ ماجدہ نے ابھی مرنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنی بکھری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئی تو انائیوں کو مجتمع کیا اور بستر سے اتر کر کھڑی ہوگئی۔ تسلیم نے اسے سہارا دینا چاہا، لیکن اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا۔ اس کی نوجوانی کی عمر تھی، بڑھتی ہوئی عمر تھی اور وہ اپنے سارے بوجھ خود اٹھانے کی قدرت رکھتی تھی۔

غسل خانے میں جا کر جب اس نے شاور کے نیچے کھڑے ہو کر غسل کیا تو اس کو قدرے سکون ملا۔ ٹھنڈا پانی اس کے جسم کے مساموں میں داخل ہو کر اسے ایک بار پھر زندہ رہنے اور زندگی سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بخش رہا تھا۔

تسلیم نے اس کو ناشتہ کرایا، جو بہت سی اچھی اچھی چیزوں پر مشتمل تھا لیکن ماجدہ نے بہت کم چیزوں کو ہاتھ لگایا۔

''سائیں شریف الدین نے شوکت اور سکندر سے مجھے کتنے روپوں میں خریدا ہے؟'' ماجدہ نے پہلی بار شوکت کے ناموں کے ساتھ چاچی اور چاچا کے لاحقے لگائے بغیر اچانک تسلیم سے سوال کیا اور تسلیم اس کے اس سوال پر کچھ گھبرا گئی۔

''خریدا ہے.....؟ سائیں نے تو تم سے نکاح کیا ہے..... اور نکاح کے لیے جو بھی شرطیں ان کے درمیان طے ہوئی ہوں.....'' تسلیم نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''کتنی رقم لی ان لوگوں نے؟'' ماجدہ نے تسلیم کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے دوبارہ اصرار کیا۔

''مجھے ٹھیک سے نہیں معلوم۔'' تسلیم نے کہا۔ ''مگر شاید بیس پچیس ہزار روپے دیئے ہیں سائیں نے۔ تم خود سائیں سے پوچھ لینا۔''

ماجدہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کھلنا سے شروع ہونے والا اس کی زندگی کا یہ تاریک سفر بیس پچیس ہزار روپے کی رقم کی حد پر آ کر تمام ہو گیا تھا، لیکن اس کی تو ساری پونجی ہی لٹ چکی تھی۔

دوپہر کو شریف الدین گھر آیا۔ وہ ماجدہ کے لیے بازار سے کچھ نئے کپڑے، چوڑیاں اور سنگھار کا کچھ سامان لایا تھا۔ کراچی آنے کے بعد ماجدہ کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی نے اس کے لیے کوئی چیز خریدی تھی۔ شوکت اور سکندر کے گھر میں رہتے ہوئے وہ سلیمہ اور شازیہ کی اترن پہنتی تھی اور یہ اترن بھی کسی اور کی اترن ہوتی تھی، ان امیر گھرانوں کی لڑکیوں کی اترن جہاں سلیمہ اور شازیہ کام کرتی تھیں۔ ماجدہ کے لیے ایک نیا چیتھڑا بھی کبھی نہیں خریدا گیا تھا اور جب سلیمہ اور شازیہ اچانک غائب ہوگئی تھیں تو ان کے سارے کپڑے،

چپلیں اور استعمال کی دوسری اشیاء وہیں گھر میں پڑی ہوئی تھیں اور وہ ماجدہ کے استعمال میں آتی رہی تھیں۔ پھر بہت ساری چیزیں اسے اس بنگلے سے ملنے لگی تھیں جہاں وہ کام کرتی تھی۔ شوکت اور سکندر نے اسے کبھی کچھ خرید کر نہیں دیا۔ ماجدہ جلد ہی ''کماؤ پوت'' بن گئی تھی اور اسے ہر ماہ تنخواہ ملنے لگی تھی، لیکن اس کی گناہ گار آنکھوں نے کبھی اس تنخواہ کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی اور اب جبکہ وہ دونوں بردہ فروش اسے ایک وڈیرے کی جھولی میں ڈال کر بھاگ گئے تھے، تو انہوں نے ماجدہ کی کمائی ہوئی ساری رقم بھی ہضم کر لی تھی اور اس کی جو قیمت انہوں نے وصول کی تھی سو الگ.....

شریف الدین وہ پہلا شخص تھا جو کراچی میں ماجدہ کے لیے کچھ نئی چیزیں لے کر آیا تھا لیکن ماجدہ کو یہ ساری چیزیں کوڑے کرکٹ کا ڈھیر لگ رہی تھیں۔ اسے ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

دوپہر کا کھانا شریف الدین نے ماجدہ کے ساتھ ہی کھایا۔ تسلیم کھانے کے دوران موجود تھی اور چیزیں لا کر دے رہی تھی۔ ماجدہ بالکل خاموش تھی۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح ہو رہا تھا جبکہ شریف الدین اس سے پیار محبت کی باتیں کر رہا تھا اور اسے یقین دلا رہا تھا کہ وہ اس سے بہت محبت کرنے لگا ہے۔

اس کے بعد کا زیادہ تر وقت شریف الدین نے ماجدہ کے ساتھ ہی گزارا۔ اس نے ماجدہ کو ساتھ لے کر اپنا یہ دو منزلہ بنگلہ دکھایا جس کی بالائی منزل میں اس نے اپنے دور کے کچھ رشتے داروں کو آباد کر رکھا تھا۔ نچلی منزل میں صرف چند نوکر رہتے تھے۔ وہ خود جب کچھ دنوں کے لیے کراچی آتا تھا تو اسی بنگلے میں ٹھہرتا تھا۔

اگلے دو دنوں میں شریف الدین کا وجود تمام تر ناپسندیدگی اور بیزاری کے باوجود ماجدہ کے لیے اس حد تک گوارا ہو چکا تھا کہ وہ اس کی باتیں سن اور سمجھ سکتی تھی اور اس سے کچھ کہہ سن بھی سکتی تھی۔ قسمت کا مسلط کردہ یہ خوفناک فیصلہ آہستہ آہستہ اس کو جبری مفاہمت کی جانب لے جانے لگا تھا۔ شریف الدین نے اس سے بہت سی باتیں کی تھیں اور اس کو یقین دلایا تھا کہ وہ اس کو کوئی تکلیف نہیں ہونے دے گا۔

''آپ نے میرے لیے شوکت اور سکندر کو کتنی رقم دی سائیں؟'' ماجدہ نے شریف الدین سے براہِ راست سوال کرنے کی ہمت کر ڈالی۔

''کیا تمہیں کسی نے اس بارے میں کچھ بتایا؟'' شریف الدین نے اس سے سوال کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''نہیں۔'' ماجدہ نے کہا۔''لیکن میں اس بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔''

''میں نے انہیں پچیس ہزار روپے کی رقم ادا کی ہے۔'' شریف الدین نے سنجیدگی سے کہا۔''وہ لوگ اتنے عرصے سے تمہاری پرورش کر رہے تھے.....''

''انہوں نے میری پرورش پر کچھ خرچ نہیں کیا سائیں۔'' ماجدہ نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔''میں خود ایک بنگلے میں جھاڑو برتن کرتی تھی.....''

''اب ان باتوں کو بھول جاؤ۔'' شریف الدین نے کہا۔''ان کے ذکر سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔اب تم میری بیوی ہو اور تمہیں روپے پیسے کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

اچانک ماجدہ کے دل میں ایک نیا حوصلہ پیدا ہوا۔وہ اب ہر خوف سے بے نیاز ہو چکی تھی اور اپنے کسی بھی حشر کے لیے تیار تھی۔جو حشر اس کا ہو چکا تھا،شاید اس سے زیادہ بُرا حشر تو ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

''سائیں،شاید ان لوگوں نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ میں پاکستان میں غیر قانونی طور پر رہنے والی ایک بنگالی لڑکی ہوں جسے اغوا کر کے کراچی لایا گیا تھا۔اگر پولیس کو میرے بارے میں پتہ چلے گا تو وہ مجھے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دے گی۔''

''پولیس؟'' شریف الدین بڑے زور سے ہنسا۔''پولیس کی کیا اوقات ہے کہ وہ تم کو ہاتھ بھی لگا سکے۔پولیس ہم جیسے لوگوں کی جیب میں رہتی ہے۔تم اس قسم کی باتوں کو اپنے دل سے بالکل نکال دو۔میرے ساتھ تم بالکل محفوظ ہو۔کوئی تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا۔''

شریف الدین کے لہجے میں حیران کن حد تک خود اعتمادی شامل تھی۔''کل ہم یہاں سے بہاول نگر روانہ ہو جائیں گے۔وہاں میرے باپ دادا کے زمانے کی بہت بڑی حویلی ہے۔اب تم بھی ہم لوگوں کے ساتھ وہیں رہو گی۔''

اگلے دن علی الصباح وہ لوگ ایک بڑی سی گاڑی میں بہاول نگر کے لیے روانہ ہو گئے۔تسلیم بھی ساتھ تھی۔اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ ایک بندوق بردار آدمی بیٹھا ہوا تھا۔پچھلی سیٹ پر شریف الدین اس کے برابر ماجدہ اور ماجدہ کے برابر تسلیم بیٹھی ہوئی تھی۔

ایک اور نامعلوم دنیا کی جانب ماجدہ کا سفر شروع ہو چکا تھا۔دو سال پہلے اپنے آنے والے کل سے مکمل بے خبری کا جو المناک سلسلہ شروع ہوا تھا،وہ طرح طرح کی پیچیدگیوں کے ساتھ جاری تھا اور اس کا خاتمہ کہیں نظر نہیں آتا تھا۔اس کے ذہن میں ہر وقت یہی سوال گردش کرتا رہتا تھا کہ آگے کیا ہوگا.....آگے کیا ہوگا۔

گاڑی میں اے سی لگا ہوا تھا اور اس کے تمام شیشے بند تھے۔فاصلہ تیزی سے طے ہو رہا تھا۔ماجدہ کو کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ کن راستوں پر سفر کر رہی ہے۔شیشوں کے باہر کے تمام مناظر اس کے لیے اجنبی تھے۔وہ ان راہوں سے بالکل واقف نہیں تھی۔تاہم ایک بات اسے یقینی طور پر معلوم تھی کہ وہ لمحہ بہ لمحہ کراچی سے،اس شہر سے دور ہوتی جا رہی ہے جہاں اس نے اپنی زندگی کے دو سال گزارے تھے اور معلوم نہیں دوبارہ کبھی اس شہر میں آئے گی بھی آیا نہیں،لیکن اسے کراچی چھوڑنے کا کوئی غم نہیں تھا۔یہاں کوئی ایک بھی چہرہ ایسا نہیں تھا جس کو نہ دیکھ سکنے کا اسے کوئی ملال ہو۔شوکت اور سکندر کے گھناؤنے چہروں کے بارے میں سوچ کر ہی اسے گھن آتی تھی۔ان کے علاوہ جن لوگوں کے ساتھ راہ و رسم تھی،وہ سب اس کی زندگی میں کوئی خاص معنی نہیں رکھتے تھے۔

گاڑی کا تیز رفتار سفر جاری رہا۔وہ اپنے اردگرد کے مناظر دیکھتی رہی جو اس کے لیے کسی خصوصی دلچسپی سے خالی تھے۔

اس نے اس چھوٹی سی عمر میں کتنے لمبے لمبے سفر کر ڈالے تھے،کتنے ہی مختلف علاقوں، موسموں،نسلوں،قومیتوں،زبانوں اور بولیوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی وہ بنگلہ دیش، ہندوستان اور پاکستان کا سفر کرتی ہوئی کراچی آن پہنچی تھی جہاں آ کر زندگی کچھ عرصے کے لیے ایک طرح سے ٹھہر گئی تھی لیکن اب یہ ٹھہراؤ بھی اچانک ختم ہو گیا تھا اور ایک بار پھر کوئی نامعلوم سفر شروع ہو گیا تھا۔

''اب ہم حیدر آباد میں داخل ہو رہے ہیں۔'' اس کے برابر بیٹھے ہوئے شریف الدین نے اس کو بتایا۔اس وقت گاڑی ایک شہر کے اندر داخل ہو رہی تھی۔''یہ کراچی کے بعد سندھ کا سب سے بڑا شہر ہے۔''

ماجدہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔کھڑکی سے باہر کے مناظر نظر آ رہے تھے،گنجان آبادی والا کوئی شہر تھا اور سڑکوں پر بہت سی گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

حیدر آباد میں وہ ایک ہوٹل میں تقریباً آدھے گھنٹے رکے۔گاڑی کا دروازہ کھلنے پر ماجدہ کو ایسا لگا جیسے دوزخ کی آگ کی لپٹیں آ رہی ہوں۔گاڑی کے اندر کی ٹھنڈک میں تو باہر کے موسم کی سختی کا کوئی اندازہ ہی نہیں ہو پاتا تھا۔

انہوں نے وہاں کولڈ ڈرنک پیا اور کچھ تھوڑا بہت کھایا۔اس کے بعد وہ پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ان کا اگلا قیام سکھر میں ہوا۔ وہاں انہوں نے ایک ہوٹل میں کھایا کھایا اور اس کے بعد پھر آگے روانہ ہو گئے۔ شریف الدین ماجدہ کو راستے میں ملنے والے شہروں اور اہم مقامات کے بارے میں بتاتا جا رہا تھا۔

بالآخر وہ لوگ بہاول نگر پہنچ گئے۔

گاڑی ایک پرانے طرز کی حویلی کے لکڑی کے بھاری بھرکم اور بلند و بالا پھاٹک سے گزر کر ایک ڈیوڑھی میں داخل ہوئی، جہاں کئی خالی چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں اور ایک چارپائی پر دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ڈیوڑھی کا دوسرا اندرونی دروازہ کھول دیا اور گاڑی وہاں سے گزر کر ایک بہت وسیع احاطے میں داخل ہو گئی اور ایک طرف کو رک گئی۔ بندوق بردار نے جلدی سے اتر کر شریف الدین کے لیے دروازہ کھولا اور شریف الدین نیچے اترا۔ تسلیم نے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر ماجدہ کو بھی نیچے اتار لیا۔ ماجدہ اپنے چاروں طرف غور سے دیکھ رہی تھی۔ یہ جگہ اسے کراچی کے مکانات سے بالکل الگ لگ رہی تھی۔ کراچی کے بنگلے ایسے نہیں تھے۔ اس نے کسی بنگلے کے احاطے میں نہ تو بیل گاڑیاں کھڑی دیکھی تھیں نہ مویشی بندھے دیکھے تھے۔ یہ سب کچھ اس کے لیے بالکل نیا تھا، سارا منظر نامہ ایک دم مختلف تھا۔

اسی وقت ایک عورت تسلیم کے پاس آ گئی اور تسلیم نے اس سے کچھ کہا جسے ماجدہ بالکل نہیں سمجھ سکی۔ یہ اردو نہیں تھی۔ یہ کوئی دوسری زبان تھی۔ ماجدہ نے تسلیم اور شریف الدین کو بھی آپس میں شاید یہی زبان بولتے سنا تھا۔ باہر نکلتے ہی ماجدہ کو جس چیز کا فوری طور پر احساس ہوا، وہ تھی شدید گرمی..... جب تک وہ گاڑی میں تھی، تب تک تو گرمی کا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا، لیکن باہر نکلتے ہی اسے ایسا لگا جیسے آگ برس رہی ہو..... اور یہ گرمی کراچی کی گرمی سے نہ صرف بہت زیادہ تھی بلکہ مختلف بھی تھی۔

اچانک اسے وہ وقت یاد آیا جب وہ ٹرین کے راستے ہندوستان کے آخری علاقوں سے گزرتے ہوئے پاکستان میں داخل ہونے والی تھی۔ تب ان ہندوستانی اور آگے پاکستانی علاقوں میں ایسی ہی شدید گرمی تھی۔ گرم ہوا کے تھپیڑے جسم کو جلائے ڈال رہے تھے۔

تسلیم اسے لے کر ایک طرف کو چلی۔ وہ دوسری عورت بھی ان کے ساتھ تھی اور تسلیم سے مسلسل ایک اجنبی زبان میں باتیں کیے جا رہی تھی۔ وہ بڑے غور، دلچسپی اور تجسس کے ساتھ ماجدہ کو دیکھ رہی تھی، جیسے ماجدہ کوئی انسان نہ ہو بلکہ کوئی عجوبہ ہو۔ ماجدہ کو اس کا یہ انداز

کچھ اچھا نہیں لگا۔

☆======☆======☆

ماجدہ کو حویلی کے اندر کافی لمبا راستہ طے کرنا پڑا اور تب اسے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ یہ کراچی کے بنگلوں کے کمروں جیسا نہیں تھا بلکہ ان سے بہت مختلف تھا۔

''اب تم نہا دھو کر کپڑے بدل لو۔'' تسلیم نے اس سے کہا۔ اس عورت کے ساتھ ایک اجنبی زبان میں بات کرتے کرتے وہ ماجدہ کے ساتھ ایک دم اردو بولنے لگی تھی۔ ''ہم بہت لمبا سفر طے کر کے آئے ہیں، تھکن کے مارے بُرا حال ہو رہا ہے۔''

وہ لوگ علی الصبح کراچی سے روانہ ہوئے تھے اور اپنی منزل تک پہنچتے پہنچتے انہیں رات ہو گئی تھی۔ تسلیم ماجدہ کی راہنمائی کر رہی تھی۔ اس نے اسے غسل خانہ دکھایا اور ماجدہ جب وہاں سے نہا دھو کر نکلی تو اپنے آپ کو قدرے بہتر محسوس کر رہی تھی۔

''اب میں تمہارے لیے کھانا لاتی ہوں۔'' تسلیم نے کہا۔ ''کھانا کھا کر آرام کرنا۔''

ماجدہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے اس نئے قفس کو پُرتجسس نظروں سے دیکھ رہی تھی جو ان جگہوں سے بالکل مختلف تھا جو اس نے اب تک دیکھی تھیں۔

تسلیم اس کے لیے کھانا لے آئی۔ کھانے میں شریف الدین اس کے ساتھ شامل نہیں تھا۔ حویلی پہنچنے کے لیے وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔

تسلیم کھانا لے کر آئی تو اس کے ساتھ وہ عورت بھی تھی جو ابھی کچھ دیر پہلے ان لوگوں کو باہر ملی تھی۔ تسلیم اور اس عورت میں ایک اجنبی زبان میں باتیں شروع ہو گئیں۔ وہ عورت ایک بار پھر بڑے غور سے ماجدہ کو دیکھ رہی تھی اور شاید ماجدہ کے بارے میں ہی تسلیم سے سوالات کر رہی تھی لیکن ماجدہ ان لوگوں کی گفتگو سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ اس زبان پر غور کر رہی تھی اور اسے یہ کچھ اس زبان کی طرح معلوم ہوتی تھی جو نجمہ اور اس کی بہن منظوراں آپس میں بولتی تھیں۔

''اس کا نام اللہ رکھی ہے۔'' تسلیم نے ماجدہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''یہ اس حویلی میں کام کرنے والی عورتوں میں سے ایک ہے۔ اگر تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو اور میں موجود نہ ہوں تو اس کو بتا دینا، یہ تمہارا خیال رکھے گی۔''

ماجدہ نے آہستہ سے سر ہلایا اور پوچھا۔ ''ابھی تم لوگ کون سی زبان میں باتیں کر رہی تھیں؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''یہ سرائیکی ہے۔'' تسلیم نے فوراً جواب دیا۔

''مگر..... مجھے تو سرائیکی نہیں آتی۔'' ماجدہ نے پریشانی کے ساتھ کہا۔

''اس کی فکر مت کرو۔'' اللہ رکھی نے پہلی بار اس سے مخاطب ہو کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اگر سرائیکی نہیں آتی تو کیا ہوا؟ ہمیں تو اردو آتی ہے۔ تھوڑی بہت اردو تو یہاں ہر کوئی سمجھ لیتا ہے۔ تمہیں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔''

ماجدہ نے اللہ رکھی کو اردو بولتے سنا تو اس کی پریشانی کسی قدر کم ہوئی۔

ماجدہ نے اکیلے ہی کھانا کھایا۔ شریف الدین نہیں آیا تھا۔ ماجدہ نے اس کے بارے میں تسلیم سے پوچھا بھی نہیں۔ اسے اس کے آنے کی کوئی خوشی ہو سکتی تھی اور نہ ہی اس کے نہ آنے کا کوئی غم تھا۔ ہاں، البتہ تجسس ضرور تھا کہ اب یہاں اس حویلی میں لا کر شریف الدین اس کو کس طرح رکھے گا اور اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔

''کل صبح ناشتے کے بعد شاہ بی بی کے سامنے تمہاری پیشی ہوگی۔'' تسلیم نے کہا۔ ماجدہ اس وقت تک کھانا کھا چکی تھی اور اللہ رکھی برتن اٹھا رہی تھی۔ ''وہ تو تم سے ابھی ملنا چاہتی تھی لیکن پھر اس نے خود ہی کہا کہ کل صبح ملے گی، کیونکہ ابھی تو رات زیادہ ہوگئی ہے۔''

''شاہ بی بی؟'' ماجدہ نے متجسسانہ انداز میں پوچھا۔ ''وہ کون ہے؟''

''شاہ بی بی مالکن ہے اس گھر کی۔'' تسلیم نے گہری متانت کے ساتھ جواب دیا۔ ''وہ سائیں کی سب سے بڑی بیوی ہے۔ اسے سب لوگ شاہ بی بی کہتے ہیں، کیونکہ وہ سب سے بڑی ہے۔''

''بیوی؟'' ماجدہ ایک دم چونک پڑی۔ اس کے دل میں یہ خیال تو ضرور موجود تھا کہ بڑھاپے کی طرف پیش قدمی کرتا ہوا شریف الدین غیر شادی شدہ تو نہیں ہوگا اور اس کی کوئی نہ کوئی بیوی یقیناً پہلے سے موجود ہوگی، لیکن واقعات اس قدر تیز رفتاری کے ساتھ اور ایسے غیر متوقع طور پر آگے بڑھے تھے کہ وہ تسلیم یا خود شریف الدین سے اس کی پہلی بیوی کے بارے میں کوئی سوال نہیں کر پائی تھی۔

''ہاں ماجدہ۔'' تسلیم نے کہا۔ ''سائیں نے اب تک تین شادیاں کی ہیں اور تم چوتھی ہو۔ سب سے بڑی بیوی شاہ بی بی ہیں اور اس حویلی میں انہی کا حکم چلتا ہے۔ وہ یہاں کی اصل مالکن ہیں۔ دوسری بیوی رضیہ بیگم ہیں، وہ زیادہ تر مظفر گڑھ میں اپنی بیٹی اور داماد کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کا داماد ان کی بہن کا اکلوتا بیٹا ہے۔ تیسری بیوی دلنواز ہیں۔ وہ اسی شہر میں

ایک الگ گھر میں رہتی ہیں۔''

''وہ اس حویلی میں کیوں نہیں رہتیں؟'' ماجدہ نے پوچھا۔

''وہ بھی بڑی خاندانی عورت ہے۔'' تسلیم نے کہا۔ ''اس کے گھر والوں نے اس کی شادی سائیں شریف الدین کے ساتھ اسی شرط پر کی تھی کہ سائیں اسے دوسری بیویوں کے ساتھ نہیں رکھیں گے، بلکہ الگ مکان میں رکھیں گے۔ تو وہ الگ مکان میں رہتی ہے۔ سائیں وہاں اکثر جا کر رہتے ہیں۔''

''اور..... سائیں کے بچے؟'' ماجدہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''شاہ بی بی کے دو بیٹے ہیں؟'' تسلیم نے بتایا۔ ''دونوں جوان ہیں۔ وہ کالج میں پڑھتے ہیں اور ملتان میں رہتے ہیں۔ چھٹیوں میں گھر آتے ہیں۔ رضیہ بیگم کی صرف ایک بیٹی ہے جس کی پچھلے سال شادی ہو چکی ہے اور وہ اپنے میاں کے ساتھ مظفر گڑھ میں رہتی ہے۔ دلنواز کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ وہ سب اپنی ماں کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔''

ماجدہ کا دماغ چکر کھا رہا تھا۔ شریف الدین کی تین بیویاں پہلے سے تھیں..... اور اب وہ اس کی چوتھی بیوی تھی..... یا اللہ..... اس حویلی کے لوگوں کے ساتھ اس کی کیسے بنے گی؟ وہ اس کے ساتھ کس قسم کا سلوک کریں گے؟ وہ تو ایک بالکل ہی اجنبی پردیسی لڑکی تھی۔

''ایک بات تم کو پہلے سے سمجھا دیتی ہوں۔'' تسلیم نے قدرے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''شاہ بی بی کو کبھی ناراض نہ کرنا اور ان کا ہر حکم ماننا۔ وہ غصے کی ذرا تیز ہیں۔''

ماجدہ کا دل دہل گیا لیکن ساتھ ہی اسے وہ میٹھی میٹھی باتیں بھی یاد آئیں جو شریف الدین نے اب تک اس کے ساتھ کی تھیں۔ اس نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ اسے بہت آرام سے رکھے گا اور وہ اپنے سارے دکھ بھول جائے گی۔ اس نے کہا تھا۔ ''میں نے تم سے شادی کی ہے۔ نکاح ہوا ہے میرا اور تمہارا..... اور تم میری بیوی ہو۔'' اس کے کہے ہوئے یہ الفاظ ماجدہ کے لیے اب کسی قدر ڈھارس کا وسیلہ بن رہے تھے۔

اس رات کو شریف الدین ماجدہ کے پاس نہیں آیا۔ ماجدہ اس کا انتظار کر رہی تھی، صرف اس غرض سے کہ وہ اس سے اس کی بڑی بیوی شاہ بی بی کے بارے میں پوچھے، اور یہ پوچھے کہ شاہ بی بی اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔ شریف الدین نے اسے اپنی پہلے سے موجود بیویوں اور اولادوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ شریف الدین آج رات آیا ہی نہیں۔ شاید اس طویل سفر اور دن بھر کی تھکن کے بعد اسے ماجدہ کی ضرورت نہیں تھی اور وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آرام کرنا چاہتا تھا۔

ماجدہ اپنے کمرے میں اکیلی تھی۔ تسلیم اور اللہ رکھی اس کو کھانا کھلانے کے بعد وہاں سے رخصت ہوگئی تھیں۔ حویلی کے کسی گوشے سے کسی بھینس یا گائے کے ڈکرانے کی بھاری آواز سنائی دیتی تھی۔

علی الصباح حویلی میں کاروبارِ زندگی شروع ہوگیا۔ چاروں طرف سے طرح طرح کی آوازیں آنے لگیں اور ماجدہ کی آنکھ کھل گئی۔ بہت ساری مرغیوں کے کڑکڑانے کا شور سنائی دے رہا تھا۔ باہر کسی طرف کچھ لوگ زور زور سے بول رہے تھے۔ کوئی گھوڑا بڑے زور سے ہنہنایا۔ ماجدہ کی آنکھ تو کھل گئی تھی لیکن وہ اٹھی نہیں۔ وہ کافی دیر تک بستر پر ہی پڑی رہی۔

کچھ دیر کے بعد تسلیم اس کے پاس آئی۔

''ہاتھ منہ دھو کر ناشتہ کرلو۔'' اس نے کہا۔ ''پھر تمہیں شاہ بی بی کے سامنے پیش ہونا ہے۔ وہ تمہارے انتظار میں ہیں۔''

ماجدہ پر ایک نئی گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ وہ شاہ بی بی کی سوت تھی، شریف الدین کی چوتھی بیوی..... مگر اسے شاہ بی بی کے سامنے نہ جانے کس طرح سے پیش کیا جانا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد تسلیم اسے اپنے ساتھ لے کر چلی۔ دن کی روشنی میں ماجدہ حویلی کے طویل برآمدوں سے گزرتی ہوئی ایک کمرے کے دروازے پر پہنچی۔ تسلیم اسے لے کر کمرے کے اندر گئی۔

اندر کمرے میں ایک بڑی سی مسہری پر ایک عورت گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے، دونوں ٹانگیں سمیٹے ہوئے بیٹھی تھی۔ وہ بھاری بھرکم بدن کی ایک موٹی تازی عورت تھی۔ اس کا جسم جگہ جگہ سے ڈھیلا پڑ چکا تھا۔

جس چیز نے ماجدہ کی توجہ سب سے پہلے اپنی جانب مبذول کروائی وہ اس عورت کے جسم پر لدے ہوئے سونے کے زیورات تھے۔ اس کی موٹی موٹی کلائیوں میں سونے کی درجنوں چوڑیاں بھری ہوئی تھیں۔ کانوں میں سونے کے بھاری بھاری بُندے جھول رہے تھے اور گردن میں سونے کی ایک موٹی سی زنجیر لٹک رہی تھی۔ ماجدہ نے کراچی میں کسی بھی عورت کو گھر میں اس قدر زیورات پہنے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے شاہ بی بی کو سلام کیا، لیکن شاہ بی بی نے اس کے سلام کا جواب دینے کے بجائے صرف ایک لمبی سی ''ہوں'' کہنے پر اکتفا کیا۔ وہ ماجدہ کا سر سے پاؤں تک بغور جائزہ لے رہی تھی۔

''کیا نام ہے تیرا؟'' شاہ بی بی نے ماتھے پر بل ڈال کر تیکھے لہجے میں اس سے پوچھا۔

ماجدہ کے لیے یہ طرزِ مخاطب بالکل نیا تھا۔ وہ اس کی عادی نہیں تھی۔ کراچی میں سب لوگ اس سے ''تم'' کر کے بات کرتے تھے۔ اس نے اپنا نام بتایا۔

''بنگالن ہو؟'' شاہ بی بی نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' ماجدہ نے آنکھیں جھکا کر کہا۔

''ماں باپ کہاں ہیں تیرے؟'' شاہ بی بی نے اسی طرح تحقیر آمیز لہجے میں پوچھا۔

''وہ..... وہ بنگلہ دیش میں ہیں۔'' ماجدہ نے کہا۔

''یہاں کراچی میں کس کے ساتھ رہتی تھی؟'' اس نے پوچھا۔

''چاچا چاچی کے ساتھ۔'' ماجدہ نے آہستہ سے کہا۔

''اور انہوں نے تجھے پچیس ہزار روپے میں میرے میاں کے ہاتھوں بیچ دیا؟'' شاہ بی بی نے اسے کڑی اور برہم نظروں سے گھورا۔

''میرا..... میرا..... نکاح ہوا ہے۔'' ماجدہ نے دل ہی دل میں لرزتے ہوئے کہا۔

''میں سائیں کی بیوی ہوں۔''

''اس ہوا میں نہ رہنا چھوکری۔'' شاہ بی بی نے تند لہجے میں کہا۔ ''جو تیری اوقات ہے، اسی میں رہنا۔ گھروں میں جھاڑو برتن کرنے والی آوارہ چھوکریاں حویلیوں میں بیویاں نہیں بنتیں۔ میرا میاں اپنے شوق کے لیے تجھے خرید کر لے آیا ہے۔ بیوی نہیں خریدی جاتی، باندی خریدی جاتی ہے۔''

ماجدہ کا دماغ جیسے سن ہوا جا رہا تھا، اس کے ہاتھ پیروں میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔

''دیکھ..... ایک بات اچھی طرح سمجھ لے۔'' شاہ بی بی نے کہا۔ ''تُو باندی ہے اور باندی بن کر ہی رہنا، کبھی بیوی بننے کی کوشش نہ کرنا، ورنہ دھکے مار کر گھر سے باہر نکال دوں گی۔''

ماجدہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ شاہ بی بی کی تذلیل آمیز اور کڑوی کسیلی باتوں کا کیا جواب دے۔ شریف الدین نے تو اس سے بڑی میٹھی میٹھی، محبت بھری باتیں کی تھیں، اسے یقین دلایا تھا کہ وہ اس کو بیوی کی طرح رکھے گا..... شادی دھوکے سے ہی سہی لیکن اس نے اسے بیوی تو مان لیا تھا مگر..... مگر..... یہ عورت..... یہ خوفناک عورت اپنی قہر آلود باتوں سے ماجدہ کو قتل کیے ڈال رہی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''تجھے یہاں رہنے سہنے اور کھانے پینے کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔'' شاہ بی بی نے کہا۔

''میرے سائیں کو اللہ نے بہت دیا ہے۔ وہ تیری جیسی اور بھی کئی باندیاں خرید سکتا ہے۔''

ماجدہ سر جھکائے سب کچھ سن رہی تھی۔ اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہ صرف سن سکتی تھی، بول نہیں سکتی تھی۔

جس وقت شاہ بی بی یہ سب کچھ کہہ رہی تھی، اس وقت کمرے میں تسلیم کے علاوہ اللہ رکھی بھی موجود تھی، ایک اور عورت بھی اس دوران اندر آ گئی تھی۔ وہ شاہ بی بی کے لیے لسی کا ایک گلاس لے کر آئی تھی۔ پھر وہ بھی وہیں رک گئی۔

''چل اب جا بنگالن۔'' شاہ بی بی نے لسی کا گلاس منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''کچھ دن آرام کر لے۔ پھر کام دھندا سنبھالنا.....''

ماجدہ اس تمام عرصے میں کھڑی رہی تھی۔ شاہ بی بی نے ایک بار بھی اس سے بیٹھنے کو نہیں کہا تھا۔ شاہ بی بی کا حکم سنتے ہی وہ جلدی سے دروازے کی طرف پلٹی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے اور دل ڈوبا جا رہا تھا۔ تسلیم بھی اس کے ساتھ ہی کمرے سے نکل آئی۔

شاہ بی بی نے بار بار لفظ ''باندی'' استعمال کیا تھا۔ ماجدہ نے یہ لفظ اس سے پہلے نہیں سنا تھا اور وہ اس کا مطلب نہیں سمجھتی تھی۔

''باندی..... باندی کیا چیز ہوتی ہے؟'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں تسلیم سے پوچھا۔

''باندی..... باندی کا مطلب ہے نوکرانی.....'' تسلیم نے ذرا رک رک کر کہا۔ ''لیکن صرف نوکرانی نہیں.....''

''پھر؟'' ماجدہ نے پوچھا۔ ''اور کیا؟''

''وہ نوکرانی جسے گھر کا مالک جب چاہے اپنے کمرے میں بلا لے۔'' تسلیم نے آہستہ سے کہا۔

ماجدہ چند لمحوں تک بالکل خاموش رہی۔

''مگر..... مگر..... سائیں نے تو میرے ساتھ نکاح کیا ہے۔'' ماجدہ نے بہت کمزور آواز میں کہا۔

''اب یہ تو سائیں کی مرضی ہے کہ وہ تمہیں یہاں کیا حیثیت دیتے ہیں۔'' تسلیم نے پہلو بچاتے ہوئے کہا۔ ''مگر حویلی کے اندر تو شاہ بی بی کا ہی حکم چلتا ہے۔''

وہ سارا دن ماجدہ نے ایک نئی اذیت کے ساتھ گزارا۔ اس حویلی میں اس کا نہ جانے کیا

حشر ہونے والا تھا۔ شام کو شریف الدین اس کے پاس آیا۔ وہ اس کے لیے پھولوں کے گجرے لے کر آیا تھا۔ ماجدہ نے روتے ہوئے اسے شاہ بی بی کے ساتھ ہونے والی بات چیت کے بارے میں بتایا۔

''ہر بڈھی عورت جوان عورت سے جلتی ہے۔'' شریف الدین نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''اس کی باتوں کا بُرا مت مانو۔ کچھ دنوں میں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

شریف الدین آج تھکا ہوا نہیں تھا۔ اس نے ماجدہ کو ساتھ لے کر اسے حویلی کے مختلف حصوں کی سیر کرائی۔ وہ رات شریف الدین نے ماجدہ کے کمرے میں ہی گزاری۔

ماجدہ کو یہاں رہتے ہوئے ایک ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ شریف الدین ہر دوسرے تیسرے دن اس کے کمرے میں رات گزارتا تھا، شاہ بی بی نے ماجدہ کو اس دن کے بعد سے اپنے پاس نہیں بلایا لیکن کئی بار ان دونوں کا آمنا سامنا ضرور ہوا۔ شاہ بی بی نے ہر بار اس کا نام لینے کے بجائے اسے ''بنگالن'' کہہ کر مخاطب کیا۔

ماجدہ کے چاروں طرف سرائیکی بولی جاتی تھی۔ اس حویلی میں وہ واحد فرد تھی جو اردو بولتی تھی، بنگالی لہجے میں..... لیکن وہ سب لوگ اس کی بات سمجھ لیتے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نئی تبدیلیاں نمودار ہونی شروع ہو گئیں۔ شریف الدین کا ماجدہ کے پاس آنا جانا کم ہوتا گیا اور اب وہ ایک ایک ہفتہ اس کو شکل نہیں دکھاتا تھا۔

''چل، بس بہت ہو چکا بنگالن۔'' ایک دن شاہ بی بی نے اس سے کہا۔ ''اب دوسری نوکرانیوں کی طرح گھر کا کام کاج شروع کر دے.....'' اور اس نے کئی کام ماجدہ کے سپرد کر دیئے۔ اس وقت اسے وہاں رہتے ہوئے چھ ماہ سے کچھ زیادہ کا عرصہ گزرا تھا۔

اس تمام عرصے کے دوران ماجدہ کبھی اپنے اندر اس احساس کو بیدار نہیں کر سکی کہ وہ شریف الدین کی بیوی ہے۔ شریف الدین کے کہنے کے مطابق وہ اس کی بیوی تھی اور شریف الدین نے اس سے نکاح کیا تھا، لیکن اس حویلی میں اس کو کبھی بیوی نہیں سمجھا گیا۔

حویلی کی دوسری ملازمائیں اور ملازم اسے معنی خیز نظروں سے دیکھتے تھے اور ان کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ ہوتی تھی وہ ماجدہ کے دل کے ٹکڑے اڑا دیتی تھی اور پھر بالآخر شاہ بی بی نے اسے باندی کا حتمی درجہ دے دیا۔ اسے اب دوسری نوکرانیوں کی طرح حویلی میں کام کاج پر مامور کر دیا گیا۔ بہت بڑی حویلی تھی۔ کاموں کی تو کوئی کمی نہیں تھی اور اب ماجدہ بھی یہاں کام کرنے والی نوکرانیوں میں شامل ہو گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شاہ بی بی ماجدہ کو ہمیشہ ''او بنگالن'' کہہ کر آواز دیتی تھی۔ وہ کبھی اس کو اس کے نام سے مخاطب نہیں کرتی تھی۔ چنانچہ جب حویلی میں ماجدہ کی بے توقیری کے عمل کا آغاز ہوا، تو دوسری نوکرانیوں نے بھی اسے ''بنگالن'' کہنا شروع کر دیا۔ اب حویلی میں کوئی اس کا نام نہیں لیتا تھا۔

شریف الدین اب ماجدہ سے بہت کم ملتا تھا۔ کبھی کبھی تو ہفتوں گزر جاتے تھے وہ ماجدہ کے پاس نہیں آتا تھا۔ ماجدہ خود کو دوسری نوکرانیوں کے ساتھ مصروف رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ وہ اب جس سطح پر آ چکی تھی، وہ نوکرانیوں کی ہی سطح تھی اور اس نے اس سطح کو قبول بھی کر لیا تھا، کیونکہ پہلے بھی اس کی یہی سطح تھی۔ منکوحہ بننے کا تماشا صرف کچھ دنوں کا تھا اور اب وہ ختم ہو چکا تھا۔

گزرتے وقت کے ساتھ نئی داستانیں جنم لے رہی تھیں اور پرانے نقوش دھندلاتے جا رہے تھے۔ ایک بار بہاولنگر آ جانے کے بعد، ماجدہ یہاں سے کہیں نہیں گئی تھی۔ کراچی اب محض ایک بھولا ہوا خواب تھا۔ اسے کچھ نہیں معلوم تھا کہ شوکت اور سکندر اس کو فروخت کرنے کے بعد کس حال میں تھے۔ اس نے دو ایک بار شریف الدین سے ان لوگوں کے بارے میں پوچھا بھی، لیکن شریف الدین نے بتایا کہ اسے ان لوگوں کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہے، وہ دوبارہ ان سے کبھی نہیں ملا۔

ماجدہ اب کافی حد تک سرائیکی بولنا سیکھ گئی تھی۔ اس کی زبان بہت عجیب سی ہو گئی تھی۔ یہ بنگالی، اردو اور سرائیکی کا ایک ملغوبہ تھی تاہم وہ زیادہ سے زیادہ سرائیکی بولنے کی کوشش کرتی تھی۔

اسے چند بار حویلی سے باہر جانے کا موقع بھی ملا تھا۔ شاہ بی بی جب کسی تقریب میں یا خریداری وغیرہ کے لیے حویلی سے باہر جاتی تھی تو دو ایک نوکرانیاں ضرور اس کے ساتھ ہوتی تھیں اور کئی بار وہ ماجدہ کو بھی اپنے ساتھ لے گئی۔ اس طرح ماجدہ کو باہر کی دنیا دیکھنے کا موقع ملا، ورنہ اس کا سارا وقت تو حویلی میں ہی گزرتا تھا۔

چار سال کا عرصہ دیکھتے ہی دیکھتے پر لگا کر اڑ گیا۔ ماجدہ کی عمر اب پندرہ سال کی ہو گئی تھی اور اسے اپنا وطن چھوڑے ہوئے چھ سال گزر چکے تھے۔ اس چھ سال کی مدت میں اس کی زندگی نے جتنی کروٹیں بدلی تھیں، ان کے بارے میں جب وہ سوچتی تھی تو اسے خود یقین نہیں آتا تھا۔

دن بھر کی بیگار اور محنت مشقت کے بعد جب وہ بستر پر لیٹتی تو اس کا ذہن سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے ایک لمحے سے بھی کم کے عرصے میں مادھو پور پہنچ جاتا۔ ''ہاشم اب کتنا بڑا ہو گیا ہو گا؟ وہ اب کیسا لگتا ہو گا؟ اگر میں اسے دیکھوں گی تو پہچان لوں گی؟ اور کیا وہ اگر مجھے دیکھے گا تو پہچان لے گا؟ بابا اور اماں کتنے بوڑھے ہو چکے ہوں گے؟ خدا جانے وہ سب کس حال میں ہوں گے۔ دونوں بھائی کیسے ہوں گے؟'' اس کی آنکھوں سے پھر لہو ٹپکنے لگتا۔

اس مدت کے دوران ماجدہ کو شریف الدین کی دوسری دونوں بیویوں سے بھی واقف ہونے کا موقع ملا۔ پہلی بار اس نے ان دونوں کو اس وقت دیکھا تھا جب وہ ایک تقریب میں شرکت کے لیے حویلی میں آئی ہوئی تھیں۔ شاہ بی بی کے بڑے بیٹے کمال نے کوئی امتحان پاس کیا تھا اور اس خوشی میں حویلی میں تقریب تھی۔ کمال اور اس کا چھوٹا بھائی جمال بھی موجود تھے۔ دوسری بیوی رضیہ بیگم اور دلنواز بھی اپنے اپنے بچوں کے ساتھ آئی ہوئی تھیں۔ شاہ بی بی اپنی دونوں سوتوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اچانک اسے کسی کام کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس نے سامنے سے گزرتی ہوئی ماجدہ کو آواز دی۔ ''اری او بنگالن..... ذرا ادھر تو آ.....''

''بنگالن؟'' رضیہ نے چونک کر کہا اور ماجدہ کی طرف دیکھا جو تیزی سے اِدھر آ رہی تھی۔ ''یہاں کوئی بنگالن بھی ہے؟''

''ہاں..... یہ بنگالن ہے۔'' شاہ بی بی نے قریب آ جانے والی ماجدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''سائیں نے اسے باندی بنا کر گھر میں ڈال لیا ہے۔ کراچی سے خرید کر لائے تھے اسے.....''

''سنا ہے کراچی میں بنگالی باندیاں بڑی آسانی سے مل جاتی ہیں۔'' رضیہ نے ماجدہ کو سر سے پاؤں تک بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

ماجدہ الفاظ کی تلواروں سے قتل ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گرتی رہی۔ شاہ بی بی نے اسے کام بتایا اور وہ جلدی سے وہاں سے آگے بڑھ گئی۔

شریف الدین اور شاہ بی بی کے دونوں بیٹے کمال اور جمال ملتان میں رہتے اور وہیں پڑھتے تھے۔ وہ برابر اپنے گھر آتے جاتے رہتے تھے۔ ماجدہ کے بارے میں انہیں تسلیم نے بتا دیا تھا کہ سائیں اسے کراچی سے نکاح کر کے لائے ہیں اور حویلی میں رکھ لیا ہے۔ پچھلے سال دونوں بیٹے اپنی تعلیم ختم کر کے ملتان سے بہاولنگر آ گئے تھے اور زمین و جائیداد کے کاموں میں باپ کا ہاتھ بٹانے لگے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گزرتے ماہ وسال کے ساتھ ماجدہ کی ذات میں شریف الدین کی دلچسپی برابر گھٹتی چلی گئی تھی اور اب وہ بہت کم اس سے ملاقات کرتا تھا۔ ماجدہ کو اس بات کا کوئی غم تھا، نہ خوشی..... وہ تو شریف الدین کے قبضے میں آنے کے بعد سے آج تک محض ایک معمول کا کردار نبھاتی رہی تھی، جس میں اس کے اپنے ارادے اور خواہش کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ بیوی اور باندی..... باندی اور بیوی..... دونوں ہی طرح کے عذاب جھیلتے ہوئے زندگی گزر رہی تھی۔ جب تک وہ کراچی میں تھی، تب تک امید کی ایک موہوم سی کرن اس کے وجود میں مدھم مدھم روشن رہتی تھی۔ شاید کبھی کوئی واپسی کی صورت نکل آئے..... لیکن بہاول نگر آجانے کے بعد تو یہ کرن بھی جل بجھ کر راکھ ہوگئی تھی اور خاص طور سے ''شادی'' ہوجانے کے بعد تو سب کچھ مکمل طور پر نیست و نابود ہوکر رہ گیا۔ اس کے اور ہاشم کے بیچ میں اب ایک ایسی دوری حائل ہوچکی تھی جسے کوئی نہیں مٹا سکتا تھا۔

شریف الدین اور اس کی بیوی کی الگ الگ طریقوں سے چاکری کرتے ہوئے ماجدہ نے حویلی میں چار سال کا عرصہ گزار دیا..... اور تب ایک دن اس پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔

حویلی میں اس کے لیے سب سے زیادہ مہربان اور قابلِ اعتماد شخصیت تسلیم کی تھی۔ وہ اس کو اکثر شاہ بی بی کے قہر و غضب سے بھی بچاتی رہتی تھی اور ماجدہ اس پر پورا بھروسہ کرتی تھی۔ ماجدہ نے اپنے شبہے کا اظہار سب سے پہلے تسلیم سے ہی کیا۔ تسلیم نے ایک دائی سے جو اس کی رشتے کی بہن تھی، ماجدہ کا معائنہ کرایا اور دائی نے تصدیق کردی کہ ماجدہ ماں بننے والی ہے۔

''اب ایسا کرو، فی الحال اپنی زبان بند رکھو۔'' تسلیم نے رازدارانہ انداز میں اس سے کہا۔

''وہ کیوں؟'' ماجدہ نے سادگی سے پوچھا۔

''وہ اس لیے کہ یہ مالکنیں اس بات کو بالکل پسند نہیں کرتیں کہ باندیوں کے یہاں وارث پیدا ہوں۔'' تسلیم نے آہستہ سے کہا۔ اس کے لہجے میں دکھ کا عنصر شامل تھا۔ ''چاہے وہ باندی منکوحہ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ اپنے میاں کی اولاد پر صرف اپنا اختیار چاہتی ہیں۔''

''لیکن سائیں کی دو اور بیویاں بھی تو ہیں۔'' ماجدہ نے کہا۔ ''اور ان سے بچے بھی ہیں۔''

''وہ بیویاں ہیں، پاگل۔'' تسلیم نے کہا۔ ''وہ خاندانی عورتیں ہیں، خریدی ہوئی باندیاں نہیں ہیں۔ شاہ بی بی ان کو کسی بات سے نہیں روک سکتی، مگر تمہیں روک سکتی ہے.....''

''روک سکتی ہے؟ مگر..... کس چیز سے؟'' ماجدہ کی سمجھ میں بات پوری طرح سے نہیں آ رہی تھی۔

''وارث پیدا کرنے سے۔'' تسلیم نے صاف صاف کہا۔ ''اگر اس کو پتہ چل گیا کہ تم ماں بننے والی ہو تو وہ تمہارے بچے کو ضائع کروا دے گی، خواہ تم اس کے لیے تیار ہو یا نہ ہو..... میں جانتی ہوں کہ وہ ایسا ضرور کرے گی، کیونکہ وہ پہلے بھی ایسا کر چکی ہے۔''

''اچھا؟'' ماجدہ نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ ''پہلے؟ کب..... کیسے؟''

''آج سے کوئی دس سال پہلے۔'' تسلیم نے کہا۔ ''وہ ایک باندی تھی، مشتری نام تھا اس کا، سائیں اسے کسی قریبی گاؤں سے خرید کر لائے تھے۔ وہ بہت ہی غریب لوگ تھے، لیکن پھر بھی مشتری کے باپ نے یہ شرط رکھی تھی کہ سائیں مشتری کے ساتھ نکاح کریں اور رقم دے کر اسے لے جائیں۔ چنانچہ مشتری کا سائیں کے ساتھ نکاح ہوگیا اور سائیں اسے یہاں لے آئے۔ چھ مہینے کے بعد ہی مشتری کا پاؤں بھاری ہوگیا۔ شاہ بی بی کو پتہ چلا تو انہوں نے زبردستی مشتری کا بچہ ضائع کروا دیا۔ مشتری بہت روئی۔ وہ اپنے بچے کو کھونا نہیں چاہتی تھی لیکن شاہ بی بی اس بات کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی کہ باندی کے یہاں اولاد ہو۔''

''اور سائیں نے انہیں روکا نہیں۔'' ماجدہ نے پوچھا۔

''سائیں کو اس بچے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔'' تسلیم نے کہا۔ ''خاندانی بیویوں سے ان کی اولادیں موجود تھیں۔ پھر وہ باندی کے بچے کو لے کر کیا کرتے؟ انہوں نے مشتری سے کہہ دیا کہ شاہ بی بی جیسا کہہ رہی ہے، ویسا ہی کرو..... اور مشتری نے ایسا ہی کیا لیکن اس نے اس کے علاوہ بھی اور کچھ کیا.....''

''اور کیا کیا؟'' ماجدہ نے پوچھا۔

''وہ اصطبل میں کام کرنے والے ایک نوجوان کے ساتھ بھاگ گئی۔'' تسلیم نے آہستہ سے کہا۔ ''لیکن ایک مہینے کے بعد مشتری کے گاؤں کے قریب جنگل سے دونوں کی لاشیں ملیں۔''

خوف کی ایک سرد لہر ماجدہ کے وجود میں سرسرانے لگی۔

''اس بچے کو دنیا میں آنا چاہیے۔'' تسلیم نے کہا۔ ''تم دنیا میں بالکل اکیلی ہو۔ تمہارا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بچہ آگے چل کر تمہارا سہارا بنے گا، ابھی تم کسی کو کچھ نہ بتانا اور جب بتانے کا وقت آئے تو سب سے پہلے سائیں کو بتانا..... شاہ بی بی کو مت بتانا۔ سائیں کا جی چاہے گا تو شاہ بی بی کو خود ہی بتا دیں گے اور ویسے بھی کچھ دنوں کے بعد تو سب کو خود ہی معلوم ہو جائے گا۔''

ماجدہ اپنے اندر ایک نئی زندگی کی لہریں ابھرتی ہوئی محسوس کر رہی تھی۔ وہ ایک اور نئے تجربے سے گزرنے والی تھی اور اس تجربے سے گزرنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے بچے کو جنم دینا اور اسے زندہ رکھنا چاہتی تھی۔ تسلیم نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ بچہ آئندہ چل کر اس کا سہارا بن سکے گا۔ وہ واقعی اکیلی تھی اور خدا جانے اسے کب تک اکیلا ہی رہنا تھا۔

ماجدہ کو جب اس کا یقین ہو گیا کہ اب اس راز کو مزید چھپانا ممکن نہیں ہو گا، تو اس نے ایک دن موقع پا کر شریف الدین کو اس کے بارے میں بتا دیا۔ شریف الدین نے کسی خاص دلچسپی یا حیرت کا مظاہرہ نہیں کیا۔

''اچھا؟'' اس نے سرسری انداز میں کہا۔ ''تسلیم کو بتا دینا، وہ تمہارا خیال رکھے گی۔''

شاہ بی بی کو جب بچے کے بارے میں معلوم ہوا تو اس وقت تک کافی دیر ہو چکی تھی۔ ماجدہ نے یہ احتیاط برتی تھی کہ وہ شاہ بی بی کے سامنے آنے سے گریز کرتی تھی۔ تا ہم ایک نہ ایک دن تو شاہ بی بی کو پتہ چلنا ہی تھا۔

''کیوں ری بنگالن؟ تُو نے مجھ کو بتایا نہیں کہ تُو.....'' شاہ بی بی نے آنکھیں نکال کر کہا۔

''مجھے..... مجھے..... خود بہت دیر سے پتہ چلا شاہ بی بی۔'' ماجدہ نے بڑی سادگی اور معصومیت کے ساتھ تسلیم کا سکھایا ہوا سبق اسے سنا دیا۔

''ایسی ننھی تو نہیں ہے تُو۔'' شاہ بی بی نے چیخ کر کہا۔ ''جانے کب سے مردوں کے ساتھ رہتی آ رہی ہے..... اور بچے کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔''

ماجدہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے وہاں سے چلی آئی۔

شاہ بی بی نے دائی سے ماجدہ کا معائنہ کروایا۔ دائی نے شاہ بی بی کو بتایا کہ اب کافی دیر ہو چکی تھی۔

شریف الدین کو جب سے اس بات کا علم ہوا تھا کہ ماجدہ ماں بننے والی ہے، تب سے وہ ماجدہ سے اور بھی دور دور رہنے لگا تھا۔ ماجدہ نے خود اس کے قرب کی کبھی خواہش نہیں کی تھی، لیکن اب صورتِ حال بدل رہی تھی۔ وہ شریف الدین کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔

شریف الدین نے اس کے ساتھ نکاح کیا تھا اور اس کا کہنا تھا کہ وہ اس کی منکوحہ ہے۔

''شاید..... شاید..... ہونے والا بچہ میرے لیے زندگی کی کوئی بہتر راہ کھولنے کا وسیلہ بن جائے۔'' وہ اکثر سوچتی۔

ویسے تو دائی اس کی دیکھ بھال کرتی تھی، لیکن زیادہ تر تسلیم اس کا خیال رکھتی تھی اور مختلف قسم کی گھریلو دوائیں اس کو دیتی رہتی تھی۔ ان دنوں ماجدہ کو اپنی ماں اس قدر شدت کے ساتھ یاد آتی تھی کہ اس کا کلیجہ پھٹنے لگتا تھا۔

ماجدہ نے ایک بیٹی کو جنم دیا۔ بچی بالکل ٹھیک ٹھاک حالت میں پیدا ہوئی تھی۔

شریف الدین اپنی بچی کو دیکھنے تک نہیں آیا، حالانکہ اس کو بچی کی پیدائش کی اطلاع اسی دن دے دی گئی تھی۔ اس نے کافی دنوں سے ماجدہ کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ البتہ شاہ بی بی ضرور ماجدہ کے کمرے میں بچی کو دیکھنے کے لیے آئی۔ وہ اپنے میاں کی اس اولاد کی شکل دیکھنا چاہتی تھی جس نے ایک باندی کے ہاں جنم لیا تھا۔

''بالکل ماں پر گئی ہے۔'' شاہ بی بی نے بچی کو دیکھ کر اپنے شوہر کو بچاتے ہوئے کہا۔ ''بنگالیوں جیسی ہی شکل وصورت ہے اس کی۔'' لہجے میں تحقیر کا عنصر تھا۔

بچی کی پیدائش کے بعد ماجدہ کے کاموں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اب حویلی میں نوکرانی کی طرح کام کرتے ہوئے اسے اپنی بچی کی بھی دیکھ بھال کرنی پڑتی تھی۔ حویلی کی کئی نوکرانیوں کا رویہ اس کے ساتھ ہمدردانہ تھا اور وہ اس کو کام میں رعایتیں فراہم کر دیتی تھیں۔

ماجدہ نے اپنی بیٹی کا نام ثمینہ رکھا تھا۔ اسے یہ نام ہمیشہ سے بہت اچھا لگتا تھا۔

ماجدہ نے اس حویلی میں آنے کے بعد تسلیم کو ایک بہت مہربان اور مشفق عورت پایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی تسلیم شریف الدین کی معتمد بھی تھی۔ بہاولنگر آنے کے بعد ماجدہ نے تسلیم کو ہی اپنے سب سے زیادہ قریب پایا تھا۔ تسلیم نے اسے اس حویلی میں رہنے کے طور طریقے سکھائے تھے۔ مالکوں کے ساتھ پیش آنے اور ان کے عتاب سے بچنے کے راستے دکھائے تھے اور اسے اس خاندان کے لوگوں کے بارے میں تفصیلات بتائی تھیں۔ ماجدہ تسلیم کو ہی اپنا سچا اور قابلِ اعتماد دوست اور راز داں سمجھتی تھی اور تسلیم خود بھی ماجدہ کو اندر اور باہر کی ساری خبروں سے آگاہ کرتی رہتی تھی۔ تینوں بیویاں اگرچہ ایک دوسرے سے الگ رہتی تھیں لیکن ان کے درمیان بڑی کھینچا تانی چلتی رہتی تھی۔

ثمینہ تقریباً ایک سال کی ہو گئی تھی۔ شریف الدین نے اب ماجدہ سے جیسے قطع تعلق کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیا تھا۔ وہ مہینوں ماجدہ کی شکل نہیں دیکھتا تھا اور اپنی بچی کی تو شاید اسے شکل بھی یاد نہیں تھی۔ اس نے اس میں کبھی کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا۔

اس روز تسلیم نے ماجدہ کو یہ بتا کر حیران کر دیا کہ اگلے روز وہ سائیں کے ساتھ پشاور جا رہی ہے۔

''سائیں کہہ رہے تھے کہ کوئی چار پانچ دن کا کام ہے، پھر واپس آ جائیں گے۔'' تسلیم نے بتایا۔

تسلیم، شریف الدین کے ساتھ پشاور چلی گئی اور اس دن شاہ بی بی کا مزاج غیر معمولی طور پر برہم تھا۔ وہ بات بات پر جھلا رہی تھی، غصہ کر رہی تھی اور اس دن اس نے ماجدہ کو بہت بُرا بھلا کہا۔

''اندھی ہے کتیا۔'' شاہ بی بی غضبناک ہو کر چیخی۔ ''کسی کام کا ڈھنگ نہیں ہے تجھ کو، جا دور ہو یہاں سے.....''

شاہ بی بی کی آنکھوں سے جیسے شعلے نکل رہے تھے۔ ذلت کی ماری ہوئی ماجدہ کے لیے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ آخر وہ صبح سے اس قدر چراغ پا کیوں ہو رہی ہے۔

تسلیم حویلی میں موجود نہیں تھی۔ وہ شریف الدین کے ساتھ پشاور گئی ہوئی تھی۔ ماجدہ شاہ بی بی کی غیر معمولی برہمی کا سبب کسی اور سے نہیں پوچھ سکتی تھی۔ کیا معلوم، کون اس کی بات کو کیا رنگ دے دے۔ ماجدہ اس قدر خوفزدہ ہو گئی تھی کہ وہ شاہ بی بی کے سامنے جانے سے ڈرتی تھی۔ اسے ایسا لگتا تھا جیسے اسے دیکھتے ہی شاہ بی بی کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔

کئی دن گزر گئے تھے۔ تسلیم اور شریف الدین ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ ماجدہ بے چینی سے تسلیم کا انتظار کر رہی تھی۔ تسلیم ہی تو اس کے لیے تسلی کا سب سے بڑا ذریعہ تھی۔

ماجدہ اپنی بچی کو گود میں لیے ہوئے حویلی کے صحن میں کھڑی کبوتروں کو دانہ ڈال رہی تھی۔ ایک سالہ بچی بڑے غور سے دانہ چگتے ہوئے کبوتروں کو دیکھ رہی تھی کہ ڈیوڑھی کا اندرونی دروازہ کھلا اور شریف الدین کی بڑی گاڑی اندر داخل ہوئی۔ گاڑی میں ڈرائیور کے علاوہ ایک مسلح گارڈ بھی تھا اور پچھلی سیٹ پر شریف الدین اور تسلیم کے درمیان سیاہ برقعے میں ملبوس ایک عورت بیٹھی تھی۔

ڈرائیور نے جلدی سے اتر کر گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور شریف الدین نیچے اترا۔ دوسری طرف کا پچھلا دروازہ مسلح گارڈ نے کھول دیا۔ تسلیم نیچے اتری۔ اس نے برقع پوش

عورت کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھی نیچے اتار لیا۔ ''اسے اپنے کمرے میں لے جاؤ۔'' شریف الدین نے سامنے کھڑی ہوئی ماجدہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''اسے کچھ دنوں تک اپنے ساتھ رکھو۔''

''جی سائیں۔'' ماجدہ نے تابع داری کے ساتھ کہا اور جلدی سے آگے بڑھ آئی۔ تسلیم اس عورت کے ساتھ ساتھ آگے چلنے لگی۔

جلد ہی وہ تینوں ماجدہ کے کمرے میں پہنچ گئیں۔ ماجدہ کا کمرہ وہی تھا جو اسے پہلے دن سے ملا ہوا تھا۔ حویلی میں کمروں کی کمی نہیں تھی لیکن ماجدہ کا کمرہ اب ویسا نہیں تھا جیسا وہ شروع میں تھا۔ اس میں جو چیز بھی خراب یا پرانی ہو گئی تھی، اس کی درستگی یا تبدیلی کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

وہ تینوں ماجدہ کے کمرے میں پہنچیں اور وہاں جا کر تسلیم نے اس عورت کا برقع اتروایا۔

ماجدہ اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

ایک نوجوان لڑکی تھی کوئی سولہ سترہ سال کی، رنگت جیسے سرخ و سفید انار، بھرا بھرا خوبصورت بدن، مضبوط ہاتھ پیر، انگ انگ سے توانائی اور چستی کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ اپنی بڑی بڑی سیاہ حیران حیران آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے سے سخت گھبراہٹ اور پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا۔

''یہ کون ہے تسلیم چاچی؟'' ماجدہ نے اس مجسمہ حُسن کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''باندی ہے۔'' تسلیم نے جواب دیا۔ ''سائیں پشاور سے خرید کر لائے ہیں تیس ہزار روپے میں۔''

''اوہ.....ایک اور باندی۔'' ماجدہ نے گہری افسردگی کے ساتھ کہا۔

اسی وقت اللہ رکھی کمرے میں داخل ہوئی۔ ''تم تینوں کو شاہ بی بی بلا رہی ہیں۔''

''اوہ.....تو انہیں فوراً ہی خبر مل گئی۔'' تسلیم نے آہستہ سے کہا۔ ''اچھا، چلتے ہیں۔''

لڑکی کا برقع اتر چکا تھا۔ وہ نہایت معمولی درجے کے میلے ہوئے میلے کپڑوں میں ملبوس تھی۔ تسلیم نے اسے کھڑے ہو کر ساتھ چلنے کا اشارہ کیا اور وہ اٹھ کر چل پڑی۔

شاہ بی بی برآمدے میں ایک تخت پر گاؤ تکیے سے لگی بیٹھی تھی۔ وہ تینوں اس کے سامنے پہنچ گئیں۔ ماجدہ نے تازہ رسیلے سیب کی طرح مہکتی ہوئی اس نوجوان لڑکی کو دیکھا۔ پھر پلپلے، ڈھیلے ڈھالے گوشت کے اس بھدی بھرکم وجود پر نظر ڈالی جو تخت پر بچھا ہوا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس لڑکی کو دیکھتے ہی شاہ بی بی کے ماتھے پر پہلے سے موجود لکیریں کچھ اور گہری ہو گئیں۔ اس نے خوب نظر بھر کے اس لڑکی کو دیکھا جس کے انگ انگ سے جوانی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ پھر وہ اس سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''کیا نام ہے تیرا؟''

''اس کا نام گل پری ہے شاہ بی بی۔'' لڑکی کے بجائے تسلیم نے جواب دیا۔

''تجھ سے پوچھا ہے میں نے؟'' شاہ بی بی نے گرج کر کہا۔ ''اس کی جگہ تُو بولے گی؟''

تسلیم سہم کر خاموش ہو گئی۔

''کون ہے تُو؟'' شاہ بی بی نے لڑکی سے اگلا سوال پوچھا۔

''نہیں جانتا۔'' لڑکی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''ارے کیا نہیں جانتی نامراد۔'' شاہ بی بی جیسے پھٹ پڑی۔ ''تُو ہے کون کتے کی اولاد؟ کہاں سے آئی ہے؟''

لڑکی نے دوبارہ اسی طرح کہا۔ ''نہیں جانتا۔''

''شاہ بی بی۔'' تسلیم نے ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''اسے اردو بالکل نہیں آتی۔ اس کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ آپ کی بات بالکل نہیں سمجھ رہی ہے۔''

''کون سی زبان بولتی ہے یہ منحوس؟'' شاہ بی بی نے قہر بھری نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''یہ صرف پٹھانی بولی بول سکتی ہے۔'' تسلیم نے کہا۔ ''یہ افغان لڑکی ہے۔ سائیں اسے ایک کیمپ سے خرید کر لائے ہیں۔''

''کتنے میں خریدا ہے اسے سائیں نے؟'' شاہ بی بی نے پوچھا۔

''تیس ہزار روپے میں۔'' تسلیم نے کہا۔ ''اس کے ماں باپ افغانستان کی لڑائی میں مارے جا چکے ہیں۔ کچھ رشتے داروں کے ساتھ کیمپ میں رہتی تھی۔ انہوں نے اس کو بیچ دیا ہے۔''

''کوئی نکاح وکاح تو نہیں ہوا ہے؟'' شاہ بی بی نے محتاط انداز میں پوچھا۔

''نہیں۔'' تسلیم نے کہا۔ ''ان لوگوں نے نکاح کے لیے نہیں کہا تھا۔''

''مگر اس کم بخت کو جب کوئی زبان ہی نہیں آتی تو پھر یہ یہاں رہے گی کیسے؟ یہاں کے لوگوں سے کیسے بات کرے گی؟''

''سیکھ لے گی۔'' تسلیم نے کہا۔ ''جب رات دن یہیں رہے گی تو ہماری زبان سیکھ لے

گی۔''

''لے جاؤ اسے یہاں سے۔'' اچانک شاہ بی بی نے سخت بے زاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''بدبو آ رہی ہے اس کے پاس سے۔ کس قدر گندے کپڑے ہیں اس کے۔ ذرا دیکھ لینا اچھی طرح سے، اس کے بالوں میں جوئیں نہ ہوں۔ ساری حویلی میں جوئیں پھیلائے گی۔ جانے کون سی گندی جگہ سے آ رہی ہے۔''

''اس کو اچھی طرح نہلا دھلا کر کپڑے بدلوا دوں گی، صاف ستھرا کر دوں گی۔'' تسلیم نے جلدی جلدی کہا۔

''ہمارے سائیں بھی نہ جانے کہاں کہاں کے جناور پکڑ کر طویلے میں لے آتے ہیں۔ کوئی بنگالن ہے، تو کوئی افغانی ہے اور دیکھو.....'' وہ اچانک تسلیم سے مخاطب ہو کر گرج کر بولی۔ ''پورا خیال رکھنا۔ ذرا بھی شبہ ہو تو مجھے بتانا۔ میں بنگالن سے تو دھوکا کھا گئی، اس سے دھوکا نہیں کھاؤں گی۔ میں یہاں بچوں کی فیکٹری نہیں کھولنے دوں گی۔''

''میں سمجھ گئی شاہ بی بی۔'' تسلیم نے کہا۔ ''میں اس پر نظر رکھوں گی۔''

ماجدہ کی سمجھ میں اب یہ بات پورے طور پر آ گئی تھی کہ شاہ بی بی کا مزاج کئی دن سے برہم کیوں تھا۔

تسلیم وہاں سے نکلی تو اس کی جان میں جان آئی۔ ماجدہ نے بھی قدرے سکون کی سانس لی، لیکن گل پری کا چہرہ بالکل خالی خالی تھا۔ اس نے شاہ بی بی کو کوئی بات سمجھی ہی نہیں تھی، لیکن اس کے بگڑے ہوئے تیور اور قہر بھری صورت سے اس نے بہت کچھ سمجھ لیا تھا۔

وہ دونوں اسے ماجدہ کے کمرے میں لے آئیں۔ تسلیم نے اسے غسل خانہ دکھایا اور اشاروں اشاروں میں سمجھایا کہ وہ نہا دھو لے۔ اس نے اسے ایک صاف ستھرا جوڑا بھی پہننے کو دیا۔ گل پری اس کی ساری باتیں سمجھ رہی تھی۔ وہ غسل خانے میں چلی گئی۔

''وہاں تو جیسے افغان لڑکیوں کا بازار لگا ہوا ہے۔'' تسلیم نے ماجدہ سے کہا۔ ''افغانستان میں کئی برس سے لڑائی چل رہی ہے اور افغان لوگ بھاگ بھاگ کر پاکستان آ رہے ہیں۔ پشاور میں افغان مہاجرین کے کئی کیمپ ہیں۔ ان کیمپوں میں افغان لڑکیاں بکتی ہیں۔ بہت سی لاوارث لڑکیاں ہیں اور ان کے رشتے دار ان کو بیچ دیتے ہیں اور بہت سی لڑکیوں کو خود ان کے والدین بیچ دیتے ہیں۔ بہت بُری حالت ہے ماجدہ..... بہت بُری حالت ہے.....'' تسلیم کے لب و لہجے میں گہرا دکھ شامل تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''بنگلہ دیش سے افغانستان کتنی دور ہوگا؟'' ماجدہ نے تسلیم سے پوچھا۔

''معلوم نہیں۔'' تسلیم نے کہا۔ ''لیکن شاید بہت دور ہے۔ پاکستان اور بنگلہ دیش کے بیچ میں تو ہندوستان ہے..... تو پھر بنگلہ دیش اور افغانستان کے بیچ میں ہندوستان اور پاکستان ہوئے..... یہ تو بہت زیادہ دوری ہوگئی۔''

''لیکن مجھ میں اور گل پری میں کوئی دوری نہیں ہے تسلیم چاچی۔'' ماجدہ نے آہستہ سے کہا۔ ''میں بھی پاکستان آ کر بک گئی اور گل پری بھی پاکستان آ کر بک گئی اور قسمت کا کھیل دیکھو، ہم دونوں کا خریدار بھی ایک ہے۔''

گل پری نے نہانے میں بہت دیر لگائی۔ شاید اسے بہت عرصے کے بعد اتنی اچھی طرح نہانے دھونے کی سہولت حاصل ہوئی تھی۔

گل پری نہا دھو کر اور اچھے صاف ستھرے کپڑے پہن کر باہر نکلی تو وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین نظر آ رہی تھی۔ ماجدہ کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ وہ شاید اب پرانی ہوگئی تھی اور شریف الدین نے اسے مسترد کر دیا تھا، کیونکہ اب اسے کسی نئی چیز کی ضرورت تھی۔

لیکن ایسا نہیں تھا کہ ماجدہ کوئی پرانی شے ہوگئی تھی۔ ماجدہ کی نوجوانی کا زمانہ تھا اور یہ وہ عمر ہوتی ہے جب ہر لڑکی حسین معلوم ہوتی ہے۔ ماجدہ کے حُسن کا اپنا ایک انداز تھا۔ وہ ہلکی گندمی رنگت والی سبک اور کھڑے ناک نقشے کی لڑکی تھی۔ عام بنگالی لڑکیوں کے مقابلے میں اس کا قد بھی دراز تھا اور جسم بہت متناسب تھا۔ اس کی طرف دیکھنے والا کوئی بھی مرد اپنے دل میں اس کے لیے پسندیدگی کے جذبے کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ماجدہ کے حُسن و جوانی پر نکھار کا زمانہ تو اب شروع ہوا تھا۔ اس کی عمر تقریباً سترہ سال کی تھی اور وہ ایک بچی کی ماں بن چکی تھی۔

شریف الدین کے دونوں بیٹے کمال اور جمال تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد گھر آ گئے تھے اور اب وہ یہیں رہتے تھے۔

انہی دنوں شاہ بی بی کا چھوٹا بھائی شہباز جو ایک قتل کی واردات میں ملوث تھا، اپنے علاقے سے فرار ہو کر بہن کے پاس آ گیا تھا اور حویلی میں رہ رہا تھا۔

ماجدہ نے یہ بات محسوس کی تھی کہ شہباز اکثر اس کی طرف چوری چوری دیکھتا ہے۔ ماجدہ نے اس کی بات کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔

گل پری نے وہ رات ماجدہ کے کمرے میں گزاری۔ تسلیم بھی بہت دیر تک ان دونوں

کے ساتھ رہی تھی، لیکن گل پری کے ساتھ باتیں نہیں ہو سکی تھیں۔ گل پری کو پشتو کے علاوہ اور کوئی زبان نہیں آتی تھی اور اس پوری حویلی میں پشتو بولنے والا کوئی نہیں تھا۔

☆======☆======☆

''ہم اس کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے جو اس کے رشتہ داروں نے بتایا ہے۔'' تسلیم نے ماجدہ سے کہا۔ ''مگر ہمیں اس کے بارے میں کچھ زیادہ جاننا چاہیے۔ میں کل کسی وقت رحیم چاچا کو بلا کر لاؤں گی اور ان کے ذریعے اس سے بات کروں گی۔''

ماجدہ رحیم چاچا کو تھوڑا بہت جانتی تھی۔ وہ تسلیم کے کوئی قریبی رشتے دار تھے۔ وہ ایک بوڑھے آدمی تھے اور عرصے تک کسی کمپنی میں ڈرائیور اور مکینک کا کام کر چکے تھے۔ اب وہ کہیں نوکری نہیں کرتے تھے۔ شریف الدین اپنی گاڑیوں اور ٹریکٹروں وغیرہ کی مرمت اور دیکھ بھال کے لیے انہیں اکثر حویلی میں بلوا لیتا تھا۔ ماجدہ کو یہ نہیں معلوم تھا کہ رحیم چاچا کو پشتو آتی ہے۔

''وہ کئی برس تک مردان اور پشاور میں رہ چکے ہیں۔'' تسلیم نے بتایا۔ ''وہ پشتو بہت اچھی طرح بول سکتے ہیں۔ میں ان سے کہوں گی کہ گل پری سے بات کریں۔''

''اگر سائیں کو پتہ چلے گا تو وہ ناراض نہیں ہوں گے؟'' ماجدہ نے پوچھا۔

''نہیں۔'' تسلیم نے اعتماد کے ساتھ کہا۔ ''میں انہیں خود ہی بتا دوں گی کہ میں نے رحیم چاچا کے ذریعے گل پری سے بات کی ہے۔ کتنے ہی بڑے بڑے زمیندار اور رئیس باندیاں خرید کر گھر میں رکھتے ہیں۔ اس میں چھپانے والی کوئی بات نہیں ہے۔''

اگلے دن تسلیم نے رحیم چاچا کو بلوا لیا اور ان کو گل پری کے پاس لے جا کر کہا کہ وہ اس لڑکی سے اس کی زبان میں باتیں کریں۔ تسلیم اور ماجدہ نے رحیم چاچا کے ذریعے گل پری سے بات کی۔ گل پری کو اپنی زبان بولنے والا ایک شخص ملا تو وہ بہت خوش ہوگئی۔ یہاں آ کر تو وہ بالکل بے زبان ہوگئی تھی۔

گل پری نے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ افغانستان کے شہر جلال آباد کے قریب ایک گاؤں کی رہنے والی تھی اور تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ جنگ کے دوران ان لوگوں کا گھر تباہ ہوگیا اور گل پری کے والدین اور بھائی ہلاک ہو گئے۔ گل پری کچھ رشتے داروں کے ساتھ ایک قافلے میں شامل ہو کر پاکستان آ گئی اور پشاور کے قریب ایک مہاجر کیمپ میں مقیم ہوگئی۔ یہاں اس کے رشتے داروں نے اس سے نجات حاصل کرنے کی غرض سے اسے بیچ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دینے کا فیصلہ کیا۔ گل پری تو لڑکی تھی اور اسے اپنے بڑوں کے فیصلے کے خلاف احتجاج کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں تھا۔

گل پری افغان مہاجر کیمپ کے حالات بیان کرتے ہوئے زار زار روتی رہی۔ اس نے بتایا کہ اس کیمپ میں ایجنٹوں کے ذریعے لڑکیوں اور عورتوں کی خرید و فروخت کا کام زور شور سے جاری تھا۔ اس نے بتایا کہ بہت سی افغان لڑکیوں کو پاکستان کے شہروں کے علاوہ عرب ملکوں اور سمندر پار کے ملکوں تک بھیجا جا رہا تھا۔ آدمیوں کے علاوہ طرح طرح کی عورتیں کیمپ میں چکر لگاتی پھرتی تھیں اور اپنی مرضی کی لڑکیوں کا انتخاب کر کے ان کے سرپرستوں سے سودے بازی کرتی تھیں۔ کیمپ سے لڑکیوں کو عارضی طور پر افسروں، بڑے بڑے لوگوں اور سیٹھوں کے گھروں پر بھیجنے کا کاروبار بھی ہوتا تھا۔ جن لڑکیوں کو اس کام کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، ان کے خاندانوں کو کیمپ میں اضافی سہولتیں فراہم کی جاتی تھیں۔

گل پری نے یہ بھی بتایا کہ کیمپ کے لوگ کھلم کھلا یہ بات کہتے تھے کہ افغان مہاجرین کے لیے باہر سے جو بھاری امداد آ رہی ہے، افسران وہ ساری امداد کھا جاتے ہیں اور مہاجرین کو کچھ نہیں دیتے۔ امداد میں آنے والی قیمتی اشیاء پشاور اور دوسرے شہروں کے بازاروں میں بکتی ہیں۔

''تمہارے رشتے داروں نے تمہیں فروخت کرتے وقت یہ نہیں سوچا کہ اس کے بعد تمہیں کس قسم کی زندگی گزارنی ہوگی اور وہ تم سے کبھی نہیں مل سکیں گے؟'' ماجدہ نے اس سے سوال کیا۔

''انہیں مجھ سے ملنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' گل پری نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''انہیں کافی رقم مل گئی ہے اور ساتھ ہی وہ میری کفالت کے بوجھ سے بھی آزاد ہو گئے ہیں۔''

وہ دونوں رحیم چاچا کے توسط سے بہت دیر تک گل پری سے باتیں کرتی رہیں۔ ماجدہ کی آنکھوں میں بار بار آنسو آ جاتے تھے۔ وہ کھلنا سے لے کر پشاور تک اپنی اور گل پری جیسی کتنی ہی لڑکیوں کے ماتم میں ڈوبی جا رہی تھی۔

اگلی رات کو گل پری کو سجا بنا کر شریف الدین کے پاس بھیج دیا گیا اور اس کے بعد یہ سلسلہ کئی راتوں تک جاری رہا۔

شاہ بی بی نے گل پری کو زیادہ آرام کرنے کا موقع نہیں دیا۔ چند ہی روز کے بعد اس

نے گل پری کو کام سے لگا دیا۔ وہ اس بار بہت محتاط تھی اور گل پری کو اپنی نظروں کے سامنے رکھنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے اس کو اپنی ذاتی خادمہ بنا لیا۔ گل پری اس کے سارے کام کرتی، اس کے سر میں تیل ڈالتی، اس کا بدن دباتی، اس کے کھانے پینے کا خیال رکھتی اور اس کے کمرے کی صفائی بھی کرتی۔ اس طرح شاہ بی بی اسے زیادہ تر وقت اپنی نظروں کے سامنے رکھتی تھی اور اپنی عقابی نظروں سے اس کے بدن کو ٹٹولتی رہتی تھی۔

گل پری سے سب لوگوں کی بات اشاروں کی زبان میں ہوتی تھی لیکن وہ تیزی کے ساتھ اس نئی زبان کو سیکھ رہی تھی اور اسے بولنے کی کوشش کرتی تھی۔

گل پری کو آئے ہوئے کئی ماہ کا عرصہ گزر گیا اور اس عرصے کے دوران شریف الدین نے ماجدہ کو ایک بار بھی اپنے پاس نہیں بلایا۔ وہ اب صرف گل پری کو بلواتا تھا۔ ماجدہ ایک گئی گزری کہانی بن گئی تھی۔

لیکن شاہ بی بی کے بھائی شہباز کے لیے ماجدہ ایک گئی گزری کہانی نہیں تھی۔

ماجدہ نے یہ بات پہلے بھی محسوس کی تھی کہ شہباز اکثر اسے چوری چوری دیکھتا رہتا ہے لیکن جب سے اس کے بہنوئی نے اپنے لیے ایک نئی باندی خرید لی تھی اور ماجدہ کو بالکل ہی بھلا دیا تھا، تب سے شہباز کی نظریں ماجدہ کے گرد کچھ زیادہ ہی طواف کرنے لگی تھیں جس کی دلکشی میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ماجدہ ایک عورت تھی اور مرد کی نظروں کا مطلب خوب سمجھتی تھی۔ اسے شہباز سے خوف سا آنے لگا تھا اور وہ اس کے سامنے آنے سے گریز کرنے لگی تھی۔

لیکن اس روز حویلی کے ایک دور افتادہ کونے میں شام کے جھٹپٹے میں ماجدہ کی داستانِ حیات کا ایک اور نیا المیہ باب لکھا جانے والا تھا۔ حویلی کے اس حصے میں ایک کوٹھری میں جست کے کئی بڑے بڑے صندوق رکھے ہوئے تھے۔ ان صندوقوں میں لحاف، گدے، کمبل، رضائیاں وغیرہ رکھی جاتی تھیں۔ یہ ساری چیزیں سردیوں میں استعمال ہوتی تھیں اور سردیاں ختم ہوتے ہی ان کو ان بڑے بڑے صندوقوں میں بند کر کے رکھ دیا جاتا تھا۔

اگرچہ ابھی سردیوں کا موسم شروع نہیں ہوا تھا، لیکن رات کو ہلکی سی خنکی ہو جاتی تھی۔ شاہ بی بی کو ایک ہلکے سے کمبل کی ضرورت تھی۔ اس نے ''بنگالن'' کو حکم دیا کہ وہ اس کوٹھری میں جا کر صندوق سے نیلے رنگ والا کمبل نکال کر لے آئے۔ ماجدہ کی بچی اس وقت سو رہی تھی۔ وہ فوراً ہی شاہ بی بی کے حکم کی تعمیل کے لیے حویلی کے اس حصے کی طرف روانہ ہو گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسے نہیں معلوم تھا کہ دور کھڑا ہوا شہباز اسے حویلی کے اس دور افتادہ حصے کی طرف جاتا ہوا دیکھ رہا ہے جہاں اس وقت اور کوئی نہیں تھا۔

ماجدہ کو شہباز کی خطرناک موجودگی کا احساس اس وقت ہوا جب وہ مطلوبہ صندوق کے قریب کھڑی ہوئی اس کا ڈھکنا اٹھا رہی تھی۔ عین اسی وقت کسی نے پیچھے سے اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر اسے جکڑ لیا۔ وہ جلدی سے صندوق کے ڈھکن کو چھوڑتے ہوئے اپنے آپ کو اس شخص کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگی اور جب اس نے مڑ کر اس شخص کی شکل دیکھی تو اس کی جان نکل گئی۔ وہ شہباز تھا۔ اس کے ''شوہر'' کا برادر نسبتی!

''چھوڑو مجھے..... چھوڑو سائیں..... یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟''

''اس وقت یہاں کوئی نہیں ہے۔'' شہباز نے اسے زبردستی اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا۔ ''تم..... تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔''

''نہیں سائیں نہیں۔'' ماجدہ نے مزاحمت کرتے ہوئے کہا۔

''کیا ہو رہا ہے یہاں؟'' اچانک شاہ بی بی کی تیز اور قہر آلود آواز نیم روشن کوٹھری کی فضا میں گونجی اور شہباز نے جلدی سے ماجدہ کو چھوڑ دیا اور کوٹھری سے باہر جانے لگا۔

دراصل شاہ بی بی نے کمبل کے بارے میں اپنا فیصلہ بدل دیا تھا۔ اس نے نیلے کمبل کے بجائے ایک دوسرا سرخ رنگ کا کمبل نکلوانے کا فیصلہ کیا تھا، جو زیادہ ہلکا تھا۔ نیلا کمبل اس کے مقابلے میں بھاری تھا اور ابھی اتنے بھاری کمبل کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے اپنے آس پاس کوئی دوسری ملازمہ نظر نہیں آئی تھی تو وہ خود ہی ماجدہ کو یہ بتانے کے لیے چلی آئی کہ وہ نیلے کے بجائے سرخ رنگ کمبل نکالے۔ مگر جب وہ کوٹھری میں آئی تو اس نے یہاں یہ منظر دیکھا۔ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس کو یہ جاننے کی قطعی ضرورت نہیں تھی کہ قصوروار اس کا بھائی ہے یا ''بنگالن.....''

''کمینی..... کتیا..... سور کی اولاد۔'' شاہ بی بی اپنے حلق کی پوری طاقت سے چیخنے لگی۔

''میں نے کچھ نہیں کیا شاہ بی بی۔'' حیران و پریشان، خوف سے تھر تھر کانپتی ہوئی ماجدہ نے بلک بلک کر روتے ہوئے کہا۔ ''چھوٹے سائیں میرے ساتھ زبردستی کر رہے تھے۔''

''ارے کتیا..... بکواس نہ کر۔''

''میں..... میں بے قصور ہوں شاہ بی بی۔'' ماجدہ تڑپ کر روئی۔ ''میں تو یہاں کمبل لینے آئی تھی..... شہباز سائیں نے آ کر.....''

''چپ..... چپ..... سور کی اولاد۔'' شاہ بی بی نے اس کے منہ پر ایک زور کا تھپڑ رسید کیا اور ساتھ ہی جوتی اتار کر اس کو بُری طرح مارنے لگی۔ ماجدہ زور زور سے رو رہی تھی اور اپنی بے گناہی کا یقین دلا رہی تھی۔

شام کے سناٹے میں شور و غل کی آواز حویلی کے دوسرے حصوں تک پہنچنے لگی اور فوراً ہی کئی ملازمائیں اور دوسرے لوگ بھاگتے ہوئے وہاں آن پہنچے۔ آنے والوں نے یہ عجیب و غریب منظر دیکھا کہ شاہ بی بی ماجدہ کو جوتی سے مار رہی تھی اور ماجدہ کسی بے بس جانور کی طرح پٹ رہی تھی اور رو رہی تھی..... رو رہی تھی اور پٹ رہی تھی۔

''سائیں کو بلاؤ.....'' شاہ بی بی نے دھاڑ کر تسلیم سے کہا۔ جو آنے والوں میں شامل تھی۔ ''سائیں کو بلاؤ..... انہیں بتاؤ کہ ان کی پالی ہوئی یہ عورت میرے بھائی پر ڈورے ڈال رہی ہے۔''

شہباز وہاں کہیں نہیں موجود تھا۔ شاہ بی بی کی بات سنتے ہی سارے لوگوں کے دل دہل گئے۔ تسلیم کے پاؤں جیسے زمین میں جم کر رہ گئے تھے۔

''ارے تُو جاتی کیوں نہیں مرن جوگی۔'' شاہ بی بی تسلیم پر دھاڑی۔ ''کیا پیر ٹوٹ گئے ہیں تیرے؟ جلدی جا، سائیں کو بلا کر لا۔ میرے کمرے میں لانا ان کو..... چل دفع ہو.....''

تسلیم گالیاں کھا کر وہاں سے بھاگی۔

شاہ بی بی کی پیشانی پر اتنے بل پڑے ہوئے تھے کہ اس کی اصل پیشانی ہی جیسے کہیں غائب ہو گئی تھی۔ غیظ و غضب کے عالم میں اس کا منہ ٹیڑھا ہو رہا تھا اور چہرے کے خدوخال بُری طرح مسخ ہو رہے تھے۔ اس کا رنگ سیاہ پڑ گیا تھا اور آنکھوں سے جیسے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ وہ اس وقت قہر اور نفرت کا ایک سلگتا ہوا پیکر لگ رہی تھی۔

''چل..... چل اِدھر سے کتیا، خنزیر کی اولاد.....'' وہ ماجدہ کو جوتی سے مارتی ہوئی ایک ننگے پیر کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف چلی۔

''شاہ بی بی، آپ جوتی پہن لیجیے۔'' اللہ رکھی نے ذرا ہمت سے کام لیتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ''ادھر کچا فرش ہے اور مٹی بہت ہے۔ آپ کے پیر میں مٹی بھر جائے گی۔''

''ارے میرا تو جینا حرام کر دیا ہے ان حرام خوروں نے.....'' شاہ بی بی غصے میں چیخی۔ ''کوئی بنگال سے آ رہی ہے، کوئی کہاں سے آ رہی ہے۔ ان کے ماں باپ ان کو جنم دینے سے پہلے ہی مر کیوں نہیں جاتے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اگر ان کے ماں باپ ان کو جنم دینے سے پہلے مر جائیں تو تمہارے بدمعاش مردوں کا کیا بنے گا؟'' اللہ رکھی یہ الفاظ صرف اپنے دل میں ہی کہہ سکتی تھی۔

شاہ بی بی نے اپنا ہاتھ روک لیا اور ذرا سا رک کر جوتی پہن لی، لیکن اس نے ماجدہ کو مارنا بند نہیں کیا۔ وہ اسے گھونسوں اور تھپڑوں سے برابر مارے جا رہی تھی اور اس کی سات پشتوں کو ننگی گالیاں دے رہی تھی۔ اس ساری بدکلامی کے دوران اس نے اپنے بھائی کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ گویا جو کچھ ہوا، وہ محض یک طرفہ تھا اور اس میں کوئی دوسرا فریق شامل نہیں تھا۔

ماجدہ پٹتی جاتی تھی، گالیاں کھاتی جاتی تھی اور اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی حتی المقدور کوشش کرتی جاتی تھی، لیکن شاہ بی بی تو اس کی کوئی بات سننے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔

''میں تو تیری جان نکال لوں گی کتیا۔'' شاہ بی بی نے ماجدہ کی پشت پر زور سے ایک دوہتڑ مارتے ہوئے کہا۔ ''میرے گھر کو آگ لگانا چاہتی ہے۔''

شاہ بی بی ابھی اپنے کمرے میں داخل ہوئی ہی تھی کہ سامنے سے شریف الدین آتا ہوا نظر آیا۔ تسلیم اس کے ساتھ تھی۔ وہی اس کو بلا کر لائی تھی۔

''دیکھیے اپنی اس چہیتی کے کرتوت۔'' شاہ بی بی نے شریف الدین کی طرف دیکھ کر غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا۔ ''یہ شہباز کے ساتھ گل چھرّے اڑانا چاہتی تھی۔ اگر میں وقت پر نہ پہنچ جاتی تو یہ کتیا نہ جانے کیا کر ڈالتی۔''

''میں نے کچھ نہیں کیا سائیں۔'' ماجدہ ایک دم شریف الدین کے پیروں میں گر پڑی۔ ''میں بالکل بے قصور ہوں۔ شہباز سائیں میرے ساتھ زیادتی کرنا چاہتے تھے انہوں نے کوٹھری میں مجھے بے بس کر دیا تھا۔''

''میرے بھائی کو بدنام کرتی ہے کرموں جلی۔'' شاہ بی بی نے اس کی پیٹھ پر ایک اور دوہتڑ مارا۔ ''نکل جا یہاں سے..... ابھی اور اسی وقت نکل جا اس حویلی سے..... میں یہاں تیری منحوس صورت ایک منٹ کے لیے بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ دفع ہو جا یہاں سے۔''

''صبر سے کام لو۔'' شریف الدین نے تحکمانہ انداز میں شاہ بی بی سے کہا۔ ''دنیا بھر میں تماشا مت بنواؤ۔ میں فیصلہ کروں گا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔''

شاہ بی بی ایک دم سے ٹھنڈی پڑ گئی۔ شریف الدین اپنا مردانہ حق استعمال کر رہا تھا جس کے آگے شاہ بی بی جیسی تند خو عورت بھی دم نہیں مار سکتی تھی۔

''اسے لے جاؤ۔'' شریف الدین نے تسلیم سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''اور تم سب لوگ بھی یہاں سے جاؤ.....'' اس نے باقی ملازماؤں سے کہا۔

تسلیم روتی بلکتی، ذلتوں کی ماری، خراب و خوار ماجدہ کو وہاں سے ساتھ لے کر چلی۔ ماجدہ کسی شدید خوفزدہ پرندے کی طرح کانپ رہی تھی۔ اس کا جسم اس کے قابو میں نہیں تھا۔ تسلیم اسے اس کے کمرے میں لے آئی۔

''میں نے کچھ نہیں کیا تسلیم چاچی۔'' ماجدہ نے ایک بار پھر روتے ہوئے اپنی بے گناہی کا اظہار کیا۔ ''شہباز سائیں خود ہی.....''

''کچھ مت کہو ماجدہ۔'' تسلیم نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''میں جانتی ہوں، میں سب کچھ اچھی طرح جانتی ہوں۔''

ماجدہ اور تسلیم، ماجدہ کے کمرے میں آ گئیں۔ کچھ دیر میں گل پری بھی وہاں آ گئی۔ وہ اب سرائیکی کسی قدر سمجھنے لگی تھی۔ صورتِ حال کو انتہائی کشیدہ پا کر گل پری خاصی پریشان ہو گئی۔ ماجدہ نے اسے کچھ الفاظ کے ذریعے، کچھ اشاروں کے ذریعے سمجھایا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔

ماجدہ کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے ساتھ اب کیا سلوک کیا جائے گا۔ اس کے پاس رہنے کی کوئی اور جگہ بھی نہیں تھی اور نہ اس کا کوئی ذریعہ آمدنی تھا۔ شریف الدین اسے کبھی کبھار تھوڑے بہت پیسے دے دیتا تھا جنہیں وہ سنبھال کر اپنے پاس رکھ لیتی تھی۔ بس یہی اس کی کل جمع پونجی تھی۔

''میرا اب کیا ہو گا تسلیم چاچی؟'' اس نے تنہائی میں سہم کر تسلیم سے پوچھا۔ ''شاہ بی بی تو اب مجھے یہاں سے نکال دیں گی..... میں کہاں جاؤں گی؟''

''فیصلہ شاہ بی بی نہیں کریں گی۔'' تسلیم نے آہستہ سے کہا۔ ''فیصلہ سائیں کریں گے۔ شاہ بی بی حویلی کے اندر کی شیرنی ہیں، لیکن سارے بڑے فیصلے صرف سائیں کرتے ہیں۔ شاہ بی بی کسی فیصلے کے لیے ان کو مجبور نہیں کر سکتیں۔''

''تسلیم چاچی، کیا شہباز سے کوئی کچھ نہیں پوچھے گا؟'' ماجدہ نے مایوس لہجے میں پوچھا۔

''کسی کو اس سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' تسلیم نے گہری افسردگی کے ساتھ کہا۔ ''سب لوگ تم کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں اور شہباز کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ سب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو معلوم ہے کہ حقیقت کیا ہے۔ شاہ بی بی بھی اچھی طرح جانتی ہیں لیکن وہ اپنے بھائی کو معصوم ہی ظاہر کریں گی۔''

وہ رات ماجدہ نے کانٹوں پر گزاری۔ قسمت نے اسے ایک اور نئے عذاب سے دوچار کر دیا تھا۔ ڈیڑھ سال کی ثمینہ اس کی گود میں تھی۔ وہ اس کو لے کر کہاں جائے گی؟ کس کے دروازے پر دستک دے گی؟ اس کے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا۔ آنے والا کل اپنے دامن میں اس کے لیے کیا لا رہا تھا؟

ثمینہ صرف اسی کی اولاد نہیں تھی۔ وہ شریف الدین کی اولاد بھی تھی، جو بہت بڑی جائیداد اور زمینوں وغیرہ کا مالک تھا لیکن جب سے ثمینہ پیدا ہوئی تھی، شریف الدین نے ایک بار گود میں لینا اور پیار کرنا تو درکنار اسے کبھی نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

''میرا نکاح ہوا ہے شریف الدین کے ساتھ.....'' وہ دل میں سوچ رہی تھی۔ ''میں اس کی شرعی بیوی ہوں۔ اس نے خود مجھ سے بار بار یہ بات کہی تھی کہ میرا اور اس کا نکاح ہوا ہے، میں نے نکاح نامے پر دستخط کیے ہیں اور میں اس کی شرعی بیوی ہوں، تو کیا وہ اپنی اس بچی کے لیے کچھ نہیں کرے گا؟'' اس کے ذہن میں یہ سوال بار بار اٹھ رہا تھا لیکن اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

اگلے دو دن کچھ نہیں ہوا۔ کسی نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ شاہ بی بی اور اس کا آمنا سامنا نہیں ہوا، تاہم تسلیم نے اسے بتایا کہ شاہ بی بی نے کسی سے بھی اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔

''شاید ابھی میرے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ خدا جانے، کیا ہونے والا ہے.....'' تیسرے دن ماجدہ نے تسلیم سے کہا۔

''مجھے..... مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تمہارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔'' تسلیم نے آہستہ سے کہا۔

''کیا؟ کیا؟'' ماجدہ نے ایک دم چونک کر کہا۔ ''تمہیں..... تمہیں کیا معلوم ہو چکا ہے؟''

''سائیں تمہیں کسی اور کے ہاتھوں فروخت کر رہے ہیں۔'' تسلیم نے نیم مردہ آواز میں کہا۔

''مجھے فروخت کر رہے ہیں؟ مجھے؟'' ماجدہ کی آواز اس کے حلق میں پھنسنے لگی۔

''مگر..... تم کو کس نے بتایا؟ کیسے معلوم ہوا تمہیں؟''

''ایک دوسرا زمیندار تمہیں خرید رہا ہے۔ اس کا نام اللہ بخش ہے۔'' تسلیم نے کہا۔

''میں اس کو اچھی طرح پہچانتی ہوں۔ میری ایک خالہ زاد بہن اس کی حویلی میں کام کرتی ہے۔ اللہ بخش کو سائیں نے آج بلایا تھا۔ میں نے ان کی باتیں سن لی ہیں۔ سائیں نے اللہ بخش کے ساتھ تمہارا سودا کر لیا ہے، تیس ہزار روپے میں.....''

''تیس ہزار روپے میں میرا سودا کر لیا؟'' حیرت، بے یقینی اور غم و غصے کے عالم میں ماجدہ کی آواز بھرانے لگی۔ ''مگر سائیں میرا سودا کس طرح کر سکتے ہیں؟ میں تو ان کی بیوی ہوں۔ کیا کوئی اپنی بیوی کا سودا کر سکتا ہے؟ کیا سائیں شاہ بی بی کا سودا کر سکتے ہیں؟''

''شاہ بی بی کو تو کوئی مفت میں بھی نہیں لے گا۔'' تسلیم نے جل کر کہا۔ ''یہ مرد..... یہ سائیں لوگ..... یہ ہم تم جیسی غریب عورتوں کے ساتھ نکاح کا کھیل صرف اس لیے کرتے ہیں کہ انہیں اپنے ساتھ رہنے پر راضی کر سکیں۔ یہ ایسے نہ جانے کتنے نکاح کرتے ہیں اور پھر بھول جاتے ہیں۔''

''یہ..... یہ اللہ بخش کون ہے؟'' ماجدہ نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

''وہ بھی ایک زمیندار ہے، اچھا خاصا بڑا زمیندار..... اس کی پہلی بیوی نے آج سے کوئی تیرہ سال پہلے خودکشی کر لی تھی، کنویں میں گر کر..... وہ کسی اور کو چاہتی تھی مگر اس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف اللہ بخش سے کر دی گئی تھی۔ وہ دو سال تک تو اللہ بخش کی بیوی بنی رہی لیکن پھر اس نے کنویں میں کود کر جان دے دی۔ وہ اپنے چاہنے والے کے بغیر رہ نہیں سکتی تھی۔ مگر بہت سے لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ اللہ بخش نے خود ہی اپنی بیوی کو مروا کر اس کی لاش کنویں میں پھنکوا دی تھی، کیونکہ وہ اسے آوارہ اور بدچلن سمجھتا تھا۔ اس نے مشہور کر دیا کہ وہ کنویں میں کود کر مر گئی۔''

''پھر..... اللہ بخش نے دوسری شادی کی ہوگی؟''

''ہاں.....'' تسلیم نے کہا۔ ''اس نے دوسری شادی کی تھی۔ اس سے اس کا آٹھ سال کا ایک بیٹا ہے، لیکن پچھلے ایک سال سے اس کی بیوی میکے میں بیٹھی ہوئی ہے۔ سسرال والوں کے ساتھ کوئی جائیداد کا جھگڑا چل رہا ہے۔''

''تو، تو اب میرا یہ شوہر مجھے تیس ہزار روپے کے بدلے اللہ بخش کے ہاتھ بیچ رہا ہے اور یہ روپے؟ میرا شوہر خود رکھے گا یا اس میں سے اپنی بیوی اور بیٹی کو بھی کچھ حصہ دے گا؟'' ماجدہ

کا لہجہ بڑا زہرناک تھا۔

''یہ اس سے کون پوچھ سکتا ہے؟'' تسلیم نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''شاید..... وہ تمہیں کچھ دے دے..... یا کچھ بھی نہ دے..... مرضی ہے اس کی..... وہ کہہ سکتا ہے کہ اب سے تم اللہ بخش کی ذمہ داری ہو.....''

گل پری اس رات ماجدہ کے کمرے میں نہیں تھی۔ اسے سائیں نے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ تسلیم اور ماجدہ رات گئے تک آپس میں باتیں کرتی رہیں۔ ماجدہ زار زار روررہی تھی۔ اس وجہ سے نہیں کہ یہ گھر اس سے چھوٹنے والا تھا۔ یہ گھر تو کبھی بھی اس کا نہیں تھا۔ اس کا تو کوئی بھی گھر نہیں تھا۔ ایک بار جو اس کا گھر چھوٹ گیا تھا تو پھر اسے کوئی گھر نہیں مل سکا تھا۔ بس، گزر بسر کرنے کے ٹھکانے تھے جو بدلتے رہتے تھے اور ایک بار پھر اس کا ٹھکانہ بدل رہا تھا۔ وہ آنے والے وقت کے خوف سے رو رہی تھی۔

اگلے روز دن چڑھے صبح کو اچانک بالکل غیر متوقع طور پر شاہ بی بی خود اس کے کمرے میں آ گئی۔ ''اپنا سامان سمیٹ اور یہاں سے دفان ہونے کے لیے تیار ہو جا.....'' شاہ بی بی نے رعونت اور نفرت کے ساتھ کہا۔ ''ابھی تھوڑی دیر میں کوئی تجھے لینے کے لیے آئے گا۔ اس کے ساتھ جانا ہے تجھے.....''

اچانک ماجدہ کے اندر ایک نئی قوت نے انگڑائی لی، جواب تک پوری طرح سوئی ہوئی تھی..... اور اب یک بیک بیدار ہو گئی تھی۔ ''سائیں کہاں ہیں؟'' اس نے شاہ بی بی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''میں ان سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''سائیں شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔'' شاہ بی بی نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔ ''تو ان سے کیا بات کرنا چاہتی ہے؟ مجھ سے بات کر۔''

''میں سائیں کی بیوی ہوں اور یہ سائیں کی بیٹی ہے۔'' ماجدہ نے ثمینہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں سائیں سے اپنا اور اپنی بیٹی کا حق مانگتی ہوں.....''

''کیا؟'' شاہ بی بی نے دھاڑ کر کہا۔ ''تجھے اپنا اور اپنی بیٹی کا حق چاہیے؟ ارے دو دو ٹکے میں بکنے والی عورت تُو اپنے اور اپنی بیٹی کے حق کی بات کرتی ہے؟ ارے ایسی اولادوں کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ باندیوں اور رکھیلوں کی اولادیں تو نالی کا کیڑا ہوتی ہیں۔ سنبھال اپنے اس نالی کے کیڑے کو اور چلتی پھرتی نظر آ یہاں سے۔ ابھی ذرا دیر میں اللہ بخش آ کر تجھے لے جائے گا۔ سائیں نے تجھے اللہ بخش کے حوالے کر دیا ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے ساتھ ہی شاہ بی بی غصے میں دھم دھم کرتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ اس نے خود ہی ماجدہ کو بتا دیا تھا کہ اسے اللہ بخش کے حوالے کیا جا رہا ہے۔

شاہ بی بی کے جانے کے کچھ دیر بعد تسلیم ماجدہ کے کمرے میں آ گئی اور اس کا سامان سمیٹنے میں اس کی مدد کرنے لگی۔ وہ دونوں رو رہی تھیں۔

''یہ سارے سائیں لوگ ایک جیسے ہوتے ہیں ماجدہ۔'' تسلیم نے روتے ہوئے کہا۔ ''یہ چاہے شریف الدین ہوں یا اللہ بخش ہوں..... باندیوں اور غریب عورتوں کے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم اپنے دل پر بوجھ نہ لینا۔ تمہارے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''میں جانتی ہوں۔'' ماجدہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ''میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ شریف الدین ہو یا اللہ بخش.....''

تھوڑی دیر میں اللہ بخش کی گاڑی آ گئی۔ تسلیم ماجدہ کو ساتھ لے کر گاڑی تک گئی اور ماجدہ نے پہلی بار اللہ بخش کو دیکھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا ایک آدمی تھا اور اس کے تقریباً آدھے بال سفید تھے۔ اس کے ساتھ گاڑی میں ایک عمر رسیدہ عورت تھی اور ایک گن مین تھا۔ ماجدہ کو پچھلی سیٹ پر عمر رسیدہ عورت کے ساتھ بٹھا دیا گیا۔ وہ عورت ماجدہ کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ گاڑی وہاں سے فوراً ہی روانہ ہو گئی اور کچھ دیر کے سفر کے بعد ایک حویلی کے پھاٹک میں داخل ہو گئی۔

اس عورت نے راستے میں ہی ماجدہ سے اپنا تعارف کروا دیا تھا۔ ''میرا نام مہرالنساء ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ویسے لوگ مجھے مہرن کہتے ہیں۔ تم بھی مجھے مہرن کہہ سکتی ہو۔''

ماجدہ کو اس نئی جگہ آ کر معلوم ہوا کہ اس کی رہائش کا بندوبست پہلے ہی سے کر دیا گیا تھا۔ حویلی کے ایک چھوٹے سے کمرے میں اس کا سامان رکھ دیا گیا جہاں پلنگ اور بستر وغیرہ موجود تھے۔ ایک الماری بھی رکھی ہوئی تھی۔

''ہمارے سائیں کا نام اللہ بخش ہے۔'' مہرن نے اس سے کہا۔ ''ہم سب لوگ ان کے نوکر ہیں اور ان کا حکم مانتے ہیں۔ اب تم کو بھی ان کا حکم ماننا ہوگا۔ وہ تمہیں یہاں لے آئے ہیں اور اب تمہیں یہیں رہنا ہوگا۔''

''اس گھر کی مالکن کون ہیں؟'' ماجدہ نے مہرن سے سوال کیا۔ اس نے اس پر یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ اس بارے میں کچھ جانتی ہے۔

''مالکن ان دنوں اپنے میکے میں ہیں۔'' مہرن نے محتاط انداز میں جواب دیا۔ ''آ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جائیں گی کچھ روز کے بعد..... جب ان کی مرضی ہوگی۔"

ماجدہ نے اس سے اور کوئی سوال نہیں کیا۔ خاصی باتیں تسلیم اسے پہلے ہی بتا چکی تھی۔

یہاں مہرن کے علاوہ دو تین ملازمائیں اور بھی تھیں اور انہی میں تسلیم کی خالہ زاد بہن طاہرہ بھی شامل تھی۔

"میں تم کو پہلے بھی دیکھ چکی ہوں۔" طاہرہ نے ماجدہ کو بتایا۔ "میں ایک بار تسلیم سے ملنے سائیں شریف الدین کی حویلی میں آئی تھی۔ میں نے تم کو وہاں دیکھا تھا۔ تم بنگالن ہو نا؟"

"ہاں..... میں بنگالن ہوں۔" ماجدہ نے کہا۔

"مگر تم تو ہماری زبان کافی اچھی طرح بول لیتی ہو۔" طاہرہ نے کہا۔ "اور سمجھ بھی لیتی ہو۔"

"چھ سال سے زیادہ ہو گئے مجھے یہاں۔" ماجدہ نے مختصر سا جواب دیا۔

مہرن نے اسے حویلی کے مختلف حصے دکھائے۔ وہ ایک نرم خو عورت معلوم ہوتی تھی۔ یہ حویلی شریف الدین کی حویلی کے مقابلے میں چھوٹی تھی، لیکن یہاں ماجدہ قدرے سکون محسوس کر رہی تھی کیونکہ یہاں خوں خوار قسم کی مالکن موجود نہیں تھی۔ یہاں مالکن تھی ہی نہیں جو ماجدہ کو اس کی طبیعت اور مزاج کا اندازہ ہو پاتا۔

دوپہر کا کھانا ماجدہ نے اللہ بخش کے ساتھ کھایا۔ اللہ بخش نے اسے خاص طور سے بلایا تھا۔ اللہ بخش اپنے بارے میں بہت سی باتیں کرتا رہا، لیکن ماجدہ زیادہ تر خاموش رہی۔

"میری بیوی بہت سخت مزاج عورت ہے۔" اللہ بخش نے کہا۔ "وہ میری پھوپھی کی بیٹی ہے اور ہمارے درمیان کچھ خاندانی جھگڑے چل رہے ہیں۔ ان جھگڑوں کے باعث وہ پچھلے ایک سال سے اپنے میکے میں بیٹھی ہوئی ہے اور میں بیوی کے بغیر ہوں۔" اس نے نظریں اٹھا کر غور سے ماجدہ کی طرف دیکھا۔ "تم اب اس گھر میں اطمینان سے رہو۔ یہاں کی ملازمائیں تمہارا خیال رکھیں گی۔ تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو مہرن کو بتا دینا۔"

ماجدہ کو وہ وقت یاد آ رہا تھا جب شریف الدین نے اسے کراچی میں اپنے مکان میں رکھا تھا اور اس کے بعد وہ اسے اپنے ساتھ بہاول نگر لے آیا تھا۔ تب شریف الدین بھی ایسی ہی باتیں کرتا تھا، جو اگرچہ بڑی میٹھی میٹھی تھیں لیکن ماجدہ کو ان میں گہری کڑواہٹ کے علاوہ اور کچھ نہیں محسوس ہوا تھا۔ اب ایک بار پھر وہی کڑواہٹ اس کے کانوں کے راستے سے گزر کر اس کے دل و دماغ میں اتر رہی تھی۔

رات کو مہرن نے اسے سجا بنا کر اللہ بخش کے کمرے میں بھیج دیا۔ "ثمینہ کو میں سنبھال لوں گی۔" مہرن نے کہا۔ "ابھی تو وہ سو رہی ہے۔ اگر جاگ گئی تو میں دیکھ لوں گی۔"

ماجدہ جب اللہ بخش کے کمرے میں پہنچی تو اللہ بخش کئی دن کے بھوکے کی طرح نعمتوں سے بھرے ہوئے دسترخوان پر ٹوٹ پڑا۔ ماجدہ کے لیے یہ سارا معاملہ صرف اس لحاظ سے مختلف تھا کہ شریف الدین نے اسے اپنی بیوی کہا تھا اور اس کے ساتھ اپنے نکاح کا دعویٰ کیا تھا جبکہ اللہ بخش نے ایسا کوئی تکلف روا نہیں رکھا تھا۔ اس نے اسے ایک باندی کے طور پر خریدا تھا اور وہ اسے باندی ہی کی طرح برت رہا تھا۔

آنے والے دنوں میں ماجدہ نے یہ فرق محسوس کیا کہ اللہ بخش کے گھر میں وہ نسبتاً زیادہ آزاد زندگی گزار رہی تھی، کیونکہ یہاں شاہ بی بی جیسی کوئی تند خو اور فتنہ پرور عورت موجود نہیں تھی۔ یہاں تو سرے سے کوئی بیگم تھی ہی نہیں۔ گھر کے اندر کے تمام معاملات کی دیکھ بھال مہرن کرتی تھی۔

شریف الدین کم گو جبکہ اللہ بخش اس کے مقابلے میں بہت زیادہ باتونی آدمی تھا۔ شریف الدین نے ماجدہ سے اس کے ذاتی حالات کے بارے میں کبھی کچھ نہیں پوچھا تھا اور نہ اس سلسلے میں کسی دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس نے ماجدہ کو اس کے چاچا سے خریدا تھا اور اسے جو کچھ بھی پوچھنا تھا وہ اسی سے پوچھ چکا ہوگا۔ ماجدہ خود تو شریف الدین سے زیادہ بات کرنے کی جسارت نہیں کر سکتی تھی۔

لیکن اللہ بخش نے ماجدہ سے اس کے "بنگالی" ماضی کے بارے میں پوچھنے کے علاوہ شریف الدین کی حویلی میں گزارے ہوئے اس کے شب و روز کے بارے میں بھی تفصیلات جاننی چاہیں اور جب ماجدہ نے اس کو یہ بتایا کہ وہ شریف الدین کی بیاہتا بیوی ہے تو اللہ بخش کو سخت تعجب ہوا۔

"تم اس کی بیوی ہو؟" اس نے حیرت سے کہا۔ "کیا تمہارا اس کے ساتھ باقاعدہ نکاح ہوا تھا؟"

"نکاح اس طرح سے ہوا تھا کہ مجھ سے نکاح نامے پر دھوکے سے دستخط لیے گئے تھے۔" ماجدہ نے اس واقعے کی ساری تفصیلات اللہ بخش کو بتائیں۔ "شاید شوکت اور سکندر اس کے بغیر مجھ کو شریف الدین کے حوالے کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ انہیں اپنی مضبوطی چاہیے تھی۔ بالفرض اگر پولیس انہیں تنگ کرتی کہ انہوں نے مجھے بیچا ہے تو وہ یہ کہہ سکتے تھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور ثابت بھی کر سکتے تھے کہ انہوں نے شریف الدین کے ساتھ میرا نکاح کیا ہے اور مجھے شریف الدین کی بیوی کی حیثیت سے اپنے گھر سے رخصت کیا ہے۔''

''ہاں، ان لوگوں کی مجبوری اور خوف کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے۔'' اللہ بخش نے کہا۔ ''وہ نکاح کے بغیر تمہیں شریف الدین کے حوالے نہیں کرنا چاہتے ہوں گے..... لیکن اس طرح تو تم واقعی شریف الدین کی بیوی بن چکی ہو اور تمہاری بچی ثمینہ.....''

''وہ شریف الدین کی ہی اولاد ہے۔'' ماجدہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا۔ ''مگر جب میں نے اپنے اور اپنی بیٹی کے حق کی بات کی تو شاہ بی بی نے مجھے گالیاں دیں اور بہت بُرا بھلا کہا۔''

''شریف الدین نے میرے ساتھ تمہارا سودا کرتے ہوئے مجھے یہ بات نہیں بتائی تھی کہ وہ تم سے نکاح کر چکا ہے۔'' اللہ بخش نے کسی گہرے خیال میں ڈوب کر کہا۔ ''اس نے صرف یہ بتایا تھا کہ تم ایک بنگالی باندی ہو اور اب اسے تمہاری ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ پشاور کے کسی کیمپ سے ایک اور باندی خرید کر لے آیا ہے اور اب تم کو نہیں رکھنا چاہتا۔''

''وہ مجھے اس وجہ سے نہیں رکھنا چاہتا تھا کیونکہ اس کے سالے کی نیت مجھ پر خراب ہو گئی تھی۔'' ماجدہ نے کہا اور اللہ بخش کو اس واقعے کی تفصیلات بتائیں۔

ان لوگوں کی اس گفتگو کے کچھ دنوں کے بعد ایک رات کو اللہ بخش نے ماجدہ سے پھر اس ذکر کو چھیڑا۔

''شریف الدین کی دولت اور جائیداد بہت ہے۔'' اس نے ماجدہ سے کہا۔ ''ثمینہ اس دولت اور جائیداد میں حقدار ہے، کیونکہ وہ اس کی بیٹی ہے، اور تم بھی حقدار ہو، کیونکہ اس کی بیوی ہو۔''

''لیکن شریف الدین تو مجھے کوئی حق دینے کے لیے تیار ہی نہیں ہے۔'' ماجدہ نے آہستہ سے کہا۔ ''اس نے تو مجھے فروخت کر دیا ہے۔''

''اس سے تمہارا حق ختم نہیں ہو جاتا۔'' اللہ بخش نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ثمینہ تو ہر حال میں اس کی بیٹی ہے اور اس کے وارثوں میں شامل ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اور ثمینہ کو تمہارا حق مل جائے۔''

ماجدہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اسے اللہ بخش کی بات کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ گزشتہ تقریباً چھ سال کی مدت کے دوران کبھی کسی نے اس سے اس کے حق کی بات نہیں کی تھی۔

''کیا واقعی؟'' اس نے اللہ بخش سے کہا۔ ''کیا آپ واقعی مجھے اور میری بیٹی کو ہمارا حق دلوانا چاہتے ہیں؟''

''میری کوشش ہوگی کہ ایسا ہو جائے۔'' اللہ بخش نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اچھا، یہ بتاؤ کہ کیا تمہارے پاس اس نکاح نامے کی کوئی نقل موجود ہے؟''

''نہیں سائیں۔'' ماجدہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''شریف الدین نے وہ کاغذ مجھ کو دکھایا تھا جس پر میرے دستخط تھے۔ ایسے چار کاغذوں پر مجھ سے دستخط کروائے گئے تھے۔ شریف الدین نے مجھے بتایا تھا کہ یہ نکاح نامہ ہے لیکن اس نے وہ کاغذ مجھ کو دیا نہیں تھا۔''

''اگر اس نکاح نامے کی کوئی نقل مل جائے تو پھر شریف الدین بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا۔'' اللہ بخش نے کہا۔ ''اسے اپنی دولت اور جائیداد میں سے تمہارا اور تمہاری بیٹی کا حصہ دینا ہوگا۔ میں نے اپنے ایک وکیل دوست سے اس سلسلے میں تفصیلی بات کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر کسی طرح سے وہ نکاح نامہ مل جائے تو وہ عدالت کے ذریعے تمہیں اور تمہاری بیٹی کو ان کا حق دلوا سکتا ہے۔''

ماجدہ کے کانوں میں گھنٹیاں سی بج رہی تھیں۔ یہ کیسی آوازیں تھیں؟ یہ کیسے الفاظ تھے؟ یہ کس قدر ناقابلِ یقین صورتِ حال تھی۔

''مگر..... وہ نکاح نامہ ملے گا کہاں سے؟'' ماجدہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس تو نہیں ہے۔''

''شوکت اور سکندر نے اس نکاح نامے کی ایک نقل اپنے پاس ضرور محفوظ رکھی ہوگی۔'' اللہ بخش نے کہا۔

''ہاں..... ہو سکتا ہے۔'' ماجدہ نے اس سے فوراً اتفاق کیا۔ ''شوکت اور سکندر کے پاس اس کی ایک نقل ضرور موجود ہوگی۔'' اس کے لہجے میں امید کی پُرمسرت جھلک موجود تھی۔

''وکیل کا کہنا ہے کہ اگر نکاح نامہ صرف دیکھنے کو بھی مل جائے تو اس کی باقی تمام تفصیلات معلوم کی جا سکتی ہیں اور پھر وہ شریف الدین کو بھاگنے نہیں دے گا۔ مگر بس شرط یہی ہے کہ نکاح نامہ موجود ہو اور دیکھنے کو مل جائے۔''

''ہو سکتا ہے کہ شوکت اور سکندر کے پاس نکاح نامہ موجود ہو۔'' ماجدہ نے کہا۔ ''مگر وہ لوگ کراچی میں ہیں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''تو کیا ہوا؟'' اللہ بخش نے کہا۔ ''کراچی کسی دوسرے ملک میں تھوڑی ہے؟ ہم لوگ کراچی چلیں گے اور ان سے ملیں گے۔ اگر ان کے پاس نکاح نامہ موجود ہے، تو میں اسے حاصل کرنے کے لیے انہیں بڑی رقم بھی دے سکتا ہوں۔''

''آپ..... آپ ایسا کریں گے سائیں؟'' ماجدہ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اللہ بخش اس کے لیے، ایک باندی کے لیے، اتنا کچھ کرنے کو تیار تھا، وہ رقم بھی خرچ کرنے کے لیے تیار تھا۔

''ہاں..... میں ایسا کروں گا..... ضرور کروں گا۔'' اللہ بخش نے جوشیلے لہجے میں کہا۔ ''تم مجھے بہت پسند ہو ماجدہ..... بہت اچھی لگتی ہو تم مجھے..... پہلے میں شریف الدین سے تمہیں تمہارا اور تمہاری بیٹی کا حق دلواؤں گا، پھر تم عدالتی کارروائی کے ذریعے شریف الدین سے خلع حاصل کر لینا..... اور پھر..... پھر میں تم سے شادی کر لوں گا..... تمہیں باقاعدہ اپنی بیوی بنا کر رکھوں گا۔''

ناقابلِ بیان خوشی کی ایک سرسراتی ہوئی لہر تھی جو ماجدہ کے سارے وجود میں دوڑتی چلی گئی۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔

''تمہیں اور تمہاری بیٹی کو شریف الدین کی جائیداد سے جو حصہ ملے گا، اس کو سنبھالنے اور اس کی دیکھ بھال کرنے کے لیے تمہیں ایک مرد کے سہارے کی ضرورت ہوگی۔'' اللہ بخش نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اور ایک شوہر سے زیادہ اچھا اور مضبوط سہارا بھلا اور کون ہو سکتا ہے؟''

اس رات ماجدہ بڑی لطیف اور نرم ہواؤں کے دوش پر پرواز کرتے ہوئے نہ جانے کون کون سی دنیاؤں کی سیر کرتی رہی۔

شادی تو اس کے ساتھ شریف الدین نے بھی کی تھی اور شروع شروع میں بڑی اچھی اچھی اور محبت بھری باتیں کی تھیں، لیکن اس کی حویلی میں آتے ہی جب ماجدہ کا سابقہ شاہ بی بی سے پڑا تھا، تو اسی وقت اس کو یقین آ گیا تھا کہ اس نکاح کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور یہاں اس کی اوقات محض ایک باندی کی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ شریف الدین نے اس پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ حویلی کے اندر صرف شاہ بی بی کا حکم چلے گا۔

لیکن اللہ بخش کے ساتھ اسے معاملہ بالکل مختلف لگ رہا تھا۔ اللہ بخش کے ساتھ کسی دھوکے سے اس کی شادی نہیں ہوئی تھی اور وہ شادی کی پیشکش کر رہا تھا، جس میں سب کچھ ظاہر تھا۔ وہ اس کو اس کی بچی کے ساتھ اپنانے کے لیے تیار تھا۔ اس کی اس جائیداد کی دیکھ

بھال کرنے کے لیے تیار تھا جو اسے شریف الدین سے ملنے والی تھی۔ اللہ بخش کو تو اس سے اتنی زیادہ دلچسپی تھی کہ اس نے اس معاملے کے بارے میں وکیل سے بات کی تھی۔

''سائیں!'' اگلے دن صبح کو ناشتہ کرتے ہوئے ماجدہ نے اللہ بخش سے کہا۔ ''سائیں، کیوں نہ ہم ابھی شادی کر لیں؟ میرا مطلب ہے، اگر شادی کرنا ہی ہے تو پھر ہم انتظار کیوں کریں؟''

''تم بہت بھولی اور نادان ہو ماجدہ۔'' اللہ بخش نے پیار سے اس کے گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''ابھی ہماری شادی کیسے ہو سکتی ہے؟ ابھی ہمیں عدالت میں یہ ثابت کرنا ہے کہ تم شریف الدین کی قانونی بیوی اور اس کی بیٹی کی ماں ہو۔ پہلے تمہیں شریف الدین سے اپنا حق لینا ہے، پھر اس سے خلع لے کر خود کو آزاد کرانا ہے۔ اس کے بعد ہی تمہاری اور میری شادی ہو سکتی ہے۔ ابھی اس میں کتنی بہت سی قانونی رکاوٹیں ہیں۔''

''ٹھیک ہے سائیں۔'' ماجدہ نے کہا۔ ''ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔''

''لیکن ایک بات اچھی طرح سمجھ لو ماجدہ.....'' اللہ بخش نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ''کبھی بھولے سے بھی اس بات کا ذکر کسی اور سے مت کرنا۔ گھر کی کسی ملازمہ یا کسی بھی شخص سے..... ہرگز کچھ نہ کہنا۔ اگر شریف الدین کے کانوں میں بھنک بھی پڑ گئی تو وہ ہمیں کامیاب نہیں ہونے دے گا۔ وہ اب تم کو اپنی بیوی اور ثمینہ کو اپنی بیٹی ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہے۔''

''ہاں سائیں!'' ماجدہ نے کہا۔ ''اگر وہ مجھے اپنی بیوی مانتا تو بھلا وہ مجھے کسی کے ہاتھ بیچ سکتا تھا؟''

''اور یہ اس نے بہت غلط کیا۔'' اللہ بخش نے بڑے معنی خیز انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔ ''اگر تم اس حویلی میں یوں ہی باندیوں کی طرح پڑی رہتیں تو کوئی بھی تمہاری مدد کے لیے نہیں آتا۔ تم خوش قسمت تھیں کہ تم میرے گھر آ گئیں۔ اب تمہاری قسمت بدل جائے گی، میں تمہیں تمہارا حق دلواؤں گا اور تم سے شادی کروں گا۔ ساری دنیا کی آنکھوں کے سامنے تم سے شادی کروں گا۔''

وہ سارا دن ماجدہ نے ایک بے خودی و سرشاری کی کیفیت میں گزارا۔ زندگی اس پر شاید کچھ مہربان ہونے جا رہی تھی، لیکن شام ہوتے ہوتے جب سرشاری کی اس کیفیت میں قدرے اعتدال آیا تو اس کے دماغ میں کچھ نئے پریشان کن سوالات سر اٹھانے لگے۔ اسے ان کا جواب چاہیے تھا۔ وہ بے چینی کے ساتھ اللہ بخش کا انتظار کرنے لگی، جبکہ اس نے کبھی اللہ بخش کا انتظار نہیں کیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شام کو جب اللہ بخش گھر آیا تو وہ گھر میں مختلف کاموں میں کافی مصروف رہا۔ ماجدہ سے اس کی ملاقات رات کو اس کے کمرے میں ہی ہو سکی۔

''سائیں، میرے دماغ میں ایک بات آئی ہے۔ میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں.....'' اس نے کہا۔

''ہاں ضرور پوچھو۔'' اللہ بخش نے کہا۔

''فرض کیجیے وہ نکاح نامہ نہیں ملا اور مجھے اور ثمینہ کو شریف الدین کی جائیداد میں سے حصہ نہیں مل سکا تو پھر..... پھر کیا ہوگا؟'' ماجدہ جو کچھ پوچھنا چاہتی تھی، وہ اس کے کہے بغیر ہی اللہ بخش نے پورے طور پر سمجھ لیا۔

''میں نے تم سے شادی کا وعدہ کیا ہے ماجدہ۔'' اللہ بخش نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''اس کا بھلا دولت اور جائیداد سے کیا تعلق ہے؟ تمہیں اور ثمینہ کو شریف الدین سے جو کچھ بھی ملے گا، وہ تمہارا ہی ہوگا۔ میں تو بس تمہاری طرف سے اس کی دیکھ بھال کروں گا اور اگر کچھ بھی نہ ملے تو بھی کوئی پروا نہیں..... شادی تو میں تم سے ضرور کروں گا۔ اگر شریف الدین تمہیں اپنی بیوی تسلیم نہیں کرتا تو پھر خلع یا طلاق کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے ماجدہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''میں تم کو دل سے اپنی بیوی مان چکا ہوں۔''

ماجدہ کو ایسا لگا جیسے اس کے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔ اس کے دل میں جو شبہات پیدا ہو رہے تھے انہیں اللہ بخش نے سمجھ لیا اور انہیں فوراً ہی دور بھی کر دیا۔

یہ طے پایا کہ اللہ بخش ماجدہ کو ساتھ لے کر کراچی جائے گا اور ماجدہ وہاں شوکت اور سکندر سے ملاقات کر کے ان سے اپنا نکاح نامہ حاصل کرنے کی کوشش کرے گی۔ اللہ بخش اس کے ساتھ ہوگا اور ان دونوں کو نکاح نامے کے عوض رقم کی پیشکش کی جائے گی۔

اگلے ہفتے اللہ بخش ماجدہ کو لے کر کراچی روانہ ہو گیا۔ ثمینہ ماجدہ کے ساتھ تھی۔ حویلی کی ملازماؤں کو یہ بتایا گیا تھا کہ اللہ بخش ماجدہ کو سیر و تفریح کی غرض سے کراچی لے جا رہا ہے۔ ماجدہ نے اللہ بخش کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اپنی زبان کو سختی کے ساتھ بند رکھا تھا اور کسی کو ان معاملات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

☆======☆======☆

ماجدہ اللہ بخش کے ساتھ کراچی پہنچی۔ اللہ بخش نے ماجدہ اور اس کی بچی کے ساتھ ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ اللہ بخش کا وکیل دوست عبدالحفیظ پہلے سے کراچی میں موجود تھا۔ وہ ہوٹل میں ان لوگوں سے ملنے کے لیے آیا۔ اللہ بخش کی ہدایت پر ماجدہ نے عبدالحفیظ کو اپنے نکاح کے بارے میں وہ ساری تفصیلات بتائیں جو اللہ بخش عبدالحفیظ کو پہلے بھی بتا چکا تھا۔

''اگر نکاح نامہ مل جاتا ہے اور اس میں سارے اندراجات موجود ہوتے ہیں تو پھر ہم شریف الدین کو گھیر سکتے ہیں۔'' عبدالحفیظ نے کہا۔ ''اس کا انحصار نکاح نامے کے ملنے پر ہے۔''

اگلے دن ماجدہ، اللہ بخش اور عبدالحفیظ موسیٰ کالونی کے لیے روانہ ہوئے۔ اس چھوٹے سے قافلے کی رہنما ماجدہ تھی۔

ماجدہ جب ان لوگوں کو لے کر شوکت اور سکندر کے گھر پہنچی تو اس کے دروازے پر تالا لگا ہوا پایا۔ یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ دونوں کہیں اِدھر اُدھر گئے ہوئے ہوں گے۔ لیکن غیر معمولی بات یہ تھی کہ وہ تالا خاصا زنگ آلود تھا اور اس پر مکڑی نے جالا بھی بنا رکھا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ گھر بہت دنوں سے بند ہے۔

ماجدہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ کسی پڑوسی سے ان لوگوں کے بارے میں معلوم کرے، کہ اچانک کوثر سامنے سے آتی ہوئی نظر آئی۔ ماجدہ نے کوثر کو فوراً پہچان لیا۔ یہ وہ عورت تھی جس نے کئی شادیاں کی تھیں اور جب ماجدہ یہاں سے گئی تھی، اس وقت کوثر نے ایک پولیس والے سے شادی کر رکھی تھی۔

کوثر نے ماجدہ کو دیکھا تو رک گئی۔ ماجدہ اب کافی بڑی ہو گئی تھی اور اس میں بہت تبدیلیاں واقع ہو چکی تھیں۔ کوثر چند لمحوں تک ٹھٹک کر ماجدہ کو دیکھتی رہی اور پھر خود ہی بنگالی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں اس سے مخاطب ہوئی۔ ''تم ماجدہ ہو؟''

برسوں بعد کسی نے ماجدہ سے بنگالی میں بات کی تھی، کوثر اسے کبھی نہیں پسند تھی اور وہ اس سے بات کرنے سے گریزاں رہتی تھی، لیکن اس وقت تو کوثر اسے بہت اچھی لگی۔ کیونکہ وہ اس سے اس کی زبان میں بات کر رہی تھی۔

''ہاں ہاں..... میں ماجدہ ہوں۔'' ماجدہ نے فوراً ہی بنگالی میں جواب دیا۔ ''یہ دونوں.....''

''کہاں رہ رہی ہو آج کل؟'' کوثر نے اس کا سوال پورا ہونے سے پہلے ہی اپنا سوال پیش کر دیا۔ وہ ان دونوں آدمیوں کو غور سے دیکھ رہی تھی جو ماجدہ کے ساتھ وہاں آئے تھے۔

''شاید کراچی سے باہر ہو؟''

''ہاں..... میں کراچی سے باہر ہوں۔'' ماجدہ نے جلدی سے کہا اور بلا کسی توقف کے تیزی سے کہا۔ ''یہ دونوں کہاں ہیں؟..... شوکت چاچی اور سکندر چاچا.....؟''

''دونوں جیل میں ہیں۔'' کوثر نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''سکندر مردوں کی جیل میں ہے اور شوکت عورتوں کی جیل میں ہے۔ پولیس والوں سے مال کی تقسیم پر کچھ جھگڑا ہو گیا تھا۔'' کوثر تیزی سے بولے جا رہی تھی۔ ''پولیس والوں نے اندر کروا دیا۔ دونوں کو دو دو سال کی سزا ہوئی ہے۔ ابھی تو ایک سال بھی نہیں گزرا۔''

''اوہ.....'' ماجدہ کے چہرے پر مایوسی کی دھند پھیل گئی۔ اللہ بخش اور اس کا وکیل دوست عبدالحفیظ دونوں عورتوں کی گفتگو بڑے غور سے سن رہے تھے لیکن وہ اس کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھ پا رہے تھے۔ ان دونوں نے ماجدہ کے چہرے کے اچانک دھواں دھواں ہو جانے سے یہ اندازہ لگا لیا کہ اس بنگالی عورت نے ماجدہ سے جو کچھ بھی کہا ہے، وہ دل خوش کن نہیں ہے۔''

''یہاں سے تو کوئی بھی ان سے ملنے کے لیے جیل نہیں جاتا۔'' کوثر نے بتایا۔ ''تم اگر ان سے ملنا چاہتی ہو تو جیل میں جا کر ملاقات کر لو..... اور یہ بچی.....''

''ہاں میری ہے۔'' ماجدہ نے بات کاٹ کر تیزی سے کہا۔ ''اچھا، میں چلتی ہوں۔''

قبل اس کے کوثر کے سوالوں کا سلسلہ زیادہ دراز ہوتا، ماجدہ ان دونوں مردوں کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو گئی۔

کچھ دور جانے کے بعد ماجدہ نے اللہ بخش اور عبدالحفیظ کو وہ سب کچھ بتا دیا جو کوثر نے

اس سے کہا تھا۔

''اوہ..... تو وہ دونوں جیل میں ہیں۔'' اللہ بخش نے عبدالحفیظ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب ان سے ملاقات کی کیا صورت ہو گی؟''

''ہم جیل چل کر ان سے ملاقات کر لیں گے۔'' عبدالحفیظ نے کہا۔ ''میں اس کا بندوبست کر لوں گا۔ ان دونوں سے الگ الگ ملاقات کرنی ہو گی، شوکت سے عورتوں کی جیل میں اور سکندر سے مردوں کی جیل میں.....''

''بس تو پھر آپ اس کا جلدی سے بندوبست کر لیں۔'' اللہ بخش نے کہا۔ ''ماجدہ ہمارے ساتھ ہو گی۔ وہی ان دونوں کو پہچانے گی۔''

عبدالحفیظ نے دونوں قیدیوں سے ملاقات کا بندوبست کر لیا۔ سکندر سے ملاقات پہلے ہوئی، شوکت سے اس کے دو دن کے بعد.....

ماجدہ نے جب سکندر کو دیکھا تو اسے بہت بدلا ہوا پایا۔ وہ ایک دم سے بہت بوڑھا اور کمزور نظر آنے لگا تھا۔ سر کے زیادہ تر بال سفید ہو گئے تھے۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں اور جبڑے کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔

''تم.....؟'' اس نے ماجدہ کو دیکھتے ہی پہچان لیا اور اس کی آواز بھرا گئی۔ ''تم یہاں تک کیسے پہنچ گئیں؟'' سکندر جلدی جلدی بنگالی زبان میں بات کر رہا تھا۔ ''تم ماجدہ ہی ہو نا؟''

''ہاں..... میں ماجدہ ہوں۔'' ماجدہ نے سرد اور خشک لہجے میں کہا اور سکندر سے مزید کوئی بات کیے بغیر سیدھی سیدھی مطلب کی بات پر آ گئی۔ ''مجھے اپنا نکاح نامہ چاہیے۔ میں اسے لینے کے لیے تمہارے پاس آئی ہوں۔ اگر تمہیں اس کے بدلے میں کچھ رقم چاہیے تو وہ میں دینے کے لیے تیار ہوں لیکن مہربانی کر کے میرا نکاح نامہ مجھے دے دو۔''

''تمہارا نکاح نامہ میرے پاس نہیں ہے۔'' سکندر نے گہری اداسی کے ساتھ کہا۔ ''شریف الدین نے ساری کاپیاں اپنے پاس رکھ لی تھیں اور مجھے کوئی کاپی نہیں دی تھی، حالانکہ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایک کاپی مجھے ضرور دے گا۔''

ماجدہ نے اللہ بخش اور عبدالحفیظ کو اردو میں یہ بات بتائی اور پھر ان سب کے درمیان اردو میں گفتگو ہونے لگی۔

''ہم تمہیں اچھی خاصی رقم دے سکتے ہیں۔'' اللہ بخش نے کہا۔ ''وہ نکاح نامہ ماجدہ کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حوالے کر دو۔ ماجدہ کو اس کی ضرورت ہے۔''

''اگر وہ میرے پاس ہوتا تو میں ضرور دے دیتا۔'' سکندر نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ ''لیکن وہ میرے پاس نہیں ہے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ میرے پاس نہیں ہے۔''

''اچھا، یہ بتاؤ کہ یہ نکاح کس مولوی نے پڑھایا تھا؟'' عبدالحفیظ نے پوچھا۔ ''تمہیں اس کا نام تو معلوم ہوگا..... کچھ تو معلوم ہوگا اس کے بارے میں؟''

''میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔'' سکندر نے کہا۔ ''شریف الدین نے مجھے چار کاغذ دیئے تھے اور کہا تھا کہ ان پر ماجدہ کے دستخط کروالو۔ اس نے جگہ بتا دی تھی، وہ اردو میں چھپے ہوئے ایک جیسے کاغذات تھے اور ان پر کچھ لکھا ہوا نہیں تھا۔ میں نے ماجدہ سے ان پر دستخط کروا لیے اور وہ چاروں کاغذ شریف الدین نے مجھ سے لے لیے۔ پھر مجھے نہیں معلوم کہ اس نے ان کا کیا کیا.....''

''تم کسی ایسے شخص کو جانتے ہو جو اس نکاح کا گواہ ہو؟'' عبدالحفیظ نے پوچھا۔ ''جس نے اس نکاح نامے پر وکیل یا گواہ کے طور پر دستخط کیے ہوں؟''

''میں نے آپ کو بتایا صاحب، وہ کاغذ بالکل سادے تھے اور ان پر ماجدہ کے دستخطوں کے علاوہ اور کچھ لکھا ہوا نہیں تھا۔ میں نے ان میں سے کسی بھی کاغذ کو دوبارہ پھر کبھی نہیں دیکھا۔''

ان تینوں نے سکندر سے بہت کرید کی، لیکن سکندر اس نکاح نامے کے بارے میں اور کچھ نہیں بتا سکا، البتہ اس نے اس بات کا اعتراف ضرور کیا کہ شریف الدین نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ نکاح نامے کی تکمیل کے بعد اس کی ایک کاپی اسے ضرور دے دے گا، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔

''اور اس کے بعد میری اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔''

''چلو، اب چلتے ہیں۔'' اللہ بخش نے ماجدہ سے کہا۔ ''اس شخص کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔''

''جب سے مجھے سزا ہوئی ہے، تم پہلی عورت ہو جو جیل میں مجھ سے ملنے کے لیے آئی ہو۔'' سکندر نے درد بھری آواز میں ماجدہ سے اردو میں کہا۔ ''مجھ سے ملنے کوئی نہیں آتا۔ تمہیں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی ماجدہ..... یقین کرو..... میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ اگر مجھے اس نکاح نامے کے بارے میں کچھ بھی معلوم ہوتا تو میں تمہیں ضرور بتا دیتا۔''

ماجدہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور وہ لوگ وہاں سے چلے گئے۔

''معلوم ہوتا ہے کہ شریف الدین نے اپنے تحفظ کا پورا بندوبست کر رکھا ہے۔'' عبدالحفیظ نے کہا۔ ''اس نے اس نکاح نامے کو یا تو مکمل ہی نہیں کروایا ہوگا یا پھر اسے تلف کر دیا ہوگا تاکہ اسے کبھی بھی اس کے خلاف استعمال نہ کیا جا سکے۔ پھر بھی، ہمیں سکندر کی بیوی سے بھی ملاقات کر لینی چاہیے۔ دیکھیں وہ کیا کہتی ہے۔''

وہ تینوں عورتوں کی جیل میں شوکت سے ملنے کے لیے گئے۔ شوکت ماجدہ کو دو آدمیوں اور ایک بچی کے ساتھ دیکھ کر حیران رہ گئی اور رونے لگی۔ اس نے ذرا سی کوشش سے ماجدہ کو پہچان لیا تھا۔

''میرا نکاح نامہ کہاں ہے؟'' ماجدہ نے اس کے رونے دھونے کی پروا کیے بغیر اس سے براہِ راست سوال کیا۔ ''قیمت بتاؤ، میں ادا کروں گی۔ میرا نکاح نامہ میرے حوالے کر دو۔''

جواب میں شوکت نے زار و قطار روتے ہوئے وہی کچھ کہا جو اس سے پہلے سکندر کہہ چکا تھا۔ اسے اس نکاح نامے کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ وہ ایسے کسی مولوی، گواہ یا وکیل کو بھی نہیں جانتی تھی جسے اس نکاح نامے کے بارے میں کچھ علم ہو۔ اس نے رو رو کر ماجدہ کو اپنی سچائی کا یقین دلایا۔

وہ لوگ وہاں سے بھی بے نیل و مرام واپس آ گئے۔ سب سے زیادہ پریشان اللہ بخش لگ رہا تھا۔

عبدالحفیظ نے کہا کہ وہ چند دن کراچی میں رک کر اپنے طور پر تفتیش کرنے کی کوشش کرے گا، شاید کوئی سراغ مل جائے۔

''اگر نکاح نامے کی باقاعدہ تکمیل کی گئی ہے تو دلہن کے گھر کا پتہ تو موسیٰ کالونی کا ہی لکھا گیا ہوگا۔'' عبدالحفیظ نے کہا۔ ''میں ان دنوں کے دوران اس علاقے میں ہونے والے نکاحوں کا ریکارڈ چیک کرنے کی کوشش کروں گا، شاید کوئی سراغ مل جائے۔''

''آپ خرچے کی فکر نہ کریں عبدالحفیظ صاحب۔'' اللہ بخش نے کہا۔ ''بس ایک بار نکاح نامے کا سراغ مل جائے پھر تو بیڑا پار ہے۔''

''میری پوری کوشش ہوگی۔'' عبدالحفیظ نے کہا۔

اللہ بخش اور ماجدہ تین دن کراچی میں مزید رکے۔ عبدالحفیظ اپنی کارروائیوں میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مصروف رہا۔ تین دن کے بعد اللہ بخش اور ماجدہ واپس روانہ ہو گئے۔ عبدالحفیظ ابھی کراچی میں ہی رہا۔

ماجدہ کو اگرچہ اس بات کا بہت افسوس تھا کہ اس کا نکاح نامہ نہیں مل سکا، لیکن اس کا یہ یقین و اعتماد اپنی جگہ پر قائم تھا کہ اگر اسے شریف الدین کی جائیداد میں سے کچھ بھی نہ ملا تو بھی اللہ بخش اس کے ساتھ شادی ضرور کرے گا، کیونکہ اللہ بخش نے اس کو بار بار یقین دلایا تھا کہ وہ اس سے بہت محبت کرتا ہے اور اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ گھر واپس آنے کے بعد ماجدہ نے اللہ بخش سے اس بارے میں نئے سرے سے کوئی بات نہیں کی۔ اسے عبدالحفیظ کی واپسی کا انتظار تھا۔ شاید وہ کوئی اچھی خبر لے کر آ جائے۔

عبدالحفیظ تقریباً ایک ہفتے کے بعد واپس آیا اور اس نے بتایا کہ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود وہ اس نکاح کا کوئی سراغ نہیں لگا سکا۔ اس علاقے میں ان دنوں رجسٹر کیے جانے والے نکاحوں میں موسیٰ کالونی کی ماجدہ بنت سراج الدین کے کسی شریف الدین کے ساتھ نکاح کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں تھا۔

''اب اس سلسلے میں مزید کوئی کوشش کرنا فضول ہے۔'' عبدالحفیظ نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ''شریف الدین یقیناً اتنا احمق نہیں ہے کہ اس نکاح نامے کو، اگر واقعی اس کا کوئی وجود ہے، ماجدہ کے ہاتھوں میں پہنچنے دے گا۔''

''میرا بھی اب یہی خیال ہے۔'' اللہ بخش نے کہا۔ ''خیر، ایک کوشش تھی سو ہم نے کر کے دیکھ لی۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ثمینہ شریف الدین کی ہی بیٹی ہے لیکن اسے شریف الدین کی جائز اولاد ثابت نہیں کیا جا سکتا۔''

ماجدہ کو بھی یہ بات بتا دی گئی کہ نکاح نامے کا کوئی وجود نہیں ہے اور شریف الدین کے ساتھ اس کی شادی کی کوئی قانونی اور شرعی شہادت موجود نہیں ہے، لہٰذا جائیداد میں سے حصہ ملنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

''تو یہ قصہ تو ختم ہو گیا سائیں۔'' ماجدہ نے متانت کے ساتھ اللہ بخش سے کہا۔ ''اب ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے اور شادی کر لینی چاہیے۔''

''ابھی میرا اپنے سسرال والوں کے ساتھ کچھ جھگڑا چل رہا ہے۔'' اللہ بخش نے جواب دیا۔ ''میں ایک اور شادی کر کے اس کو مزید الجھانا نہیں چاہتا۔ تھوڑے دنوں تک انتظار کرو۔''

اور پھر ان ''تھوڑے دنوں'' کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ اللہ بخش اب شادی، نکاح

وغیرہ کے بارے میں بھولے سے بھی کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ ماجدہ خود ہی جب اس ذکر کو چھیڑتی تو وہ صاف ٹال جاتا تھا۔

رفتہ رفتہ ماجدہ پر یہ تلخ اور اذیت ناک حقیقت واضح ہو گئی کہ اللہ بخش اس کو دھوکا دے رہا تھا۔ اگر اسے شریف الدین کی جائیداد میں سے اپنا اور ثمینہ کا حصہ مل جاتا تو اللہ بخش شاید اس سے شادی کر کے ساری دولت پر قبضہ کر لیتا۔ لیکن اب تو یہ قصہ ختم ہو چکا تھا۔

ماجدہ کو اللہ بخش کی حویلی میں رہتے ہوئے ایک سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور اب اسے اس بات کی ذرا سی بھی امید باقی نہیں تھی کہ اللہ بخش اس سے شادی کرے گا۔ سب کچھ واضح ہو چکا تھا۔ دھوکا..... صرف دھوکا.....

اسی دوران اللہ بخش کا اپنے سسرال والوں کے ساتھ تنازع طے ہو گیا اور اس کی بیوی رخسانہ اپنے نو سالہ بیٹے کے ساتھ گھر واپس آ گئی۔ رخسانہ کو یہ بات پہلے سے معلوم تھی کہ اس کے شوہر نے گھر میں ایک بنگالی باندی رکھی ہوئی ہے۔ گھر واپس آتے ہی رخسانہ نے گھر کا سارا نظام سنبھال لیا اور مہرن کی عملداری ختم ہو گئی۔

رخسانہ اگرچہ اتنی سخت گیر نہیں تھی جتنی کہ شاہ بی بی تھی، تاہم قدرتی طور پر وہ اس بات کو پسند نہیں کرتی تھی کہ اس کا شوہر گھر میں کسی دوسری عورت کو بھی رکھے۔ وہ ماجدہ کو ہر وقت مصروف رکھتی تھی۔ اس نے اس پر کام کا اتنا بوجھ ڈال دیا تھا کہ وہ پھرکی طرح گھومتی رہتی تھی۔

رخسانہ کے آ جانے کے بعد سے خود اللہ بخش کی توجہ بھی ماجدہ پر بہت کم ہو گئی تھی۔ ہفتوں گزر جاتے تھے اور ماجدہ کو اس سے بات تک کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ شادی کی باتیں تو اب محض خواب و خیال ہو کر رہ گئی تھیں۔

اللہ بخش کی زمینوں سے ملحق عبدالستار نامی ایک اور زمیندار کی زمینیں تھیں جن کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ ان دونوں کے درمیان ہمیشہ کشیدگی قائم رہتی تھی اور یہ کشیدگی موروثی تھی۔ نہ جانے کب سے چلی آ رہی تھی۔ کشیدگی کا اصل سبب پانی کا تنازع تھا۔ پانی محدود تھا اور دونوں زمینداروں کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ وہ دوسرے کی زمینوں کا پانی روک کر اپنی زمینوں کو سیراب کر لیں۔ چنانچہ وہ ایک دوسرے کا پانی کاٹ دیا کرتے تھے، پانی کی چوری کرتے تھے۔ اس معاملے پر آئے دن ان کے درمیان فسادات ہوا کرتے تھے، باقاعدہ مسلح تصادم ہوتے تھے اور دونوں طرف آدمی زخمی ہوتے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ زمینوں کو پانی دینے کا زمانہ تھا۔ دونوں فریقوں کو پانی کی ضرورت تھی اور دونوں زیادہ سے زیادہ پانی لینے کی کوشش میں ایک دوسرے کا پانی کاٹنے کی تگ ودو میں لگے رہتے تھے۔ دونوں کے آدمی چوکس رہتے تھے۔

اس رات اللہ بخش کے آدمیوں نے چوری سے عبدالستار کی زمینوں کا پانی کاٹ دیا۔ ان کا خیال تھا کہ عبدالستار کے آدمیوں کو اس کا پتہ نہیں چلے گا اور وہ راتوں رات اپنی کارروائی مکمل کرلیں گے لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا۔

عبدالستار کے آدمیوں نے انہیں دیکھ لیا اور ان پر فائرنگ شروع کردی۔ دونوں طرف سے فائرنگ کا تبادلہ ہوا اور پانی کی اس جنگ میں عبدالستار کا ایک آدمی ہلاک اور دو زخمی ہو گئے۔ اللہ بخش کا کوئی آدمی ہلاک نہیں ہوا، البتہ تین آدمی زخمی ضرور ہوئے لیکن کوئی بھی شدید طور پر زخمی نہیں ہوا تھا۔ زخمیوں کو ہسپتال پہنچا دیا گیا اور دونوں فریقوں نے ایک دوسرے کے خلاف پولیس میں ایف آئی آر درج کرادی۔

اگلے چند روز میں علاقے کے عمائدین کا جرگہ طلب کیا گیا جس میں اس تنازعے کا فیصلہ کیا جانا تھا، زیادہ نقصان عبدالستار کا ہوا تھا۔ اس کا ایک آدمی مارا گیا تھا جبکہ اشتعال انگیزی کا آغاز اللہ بخش کے آدمیوں کی جانب سے کیا گیا تھا، جنہوں نے عبدالستار کی زمینوں کا پانی کاٹ دیا تھا۔

جرگے نے یہ فیصلہ دیا کہ اللہ بخش مرنے والے شخص کا خون بہا زرِ نقد کی شکل میں ادا کرے، نیز دو بھینسیں اور ایک عورت عبدالستار کو دے۔ زرِ نقد اور بھینسوں کا بندوبست کرنا اللہ بخش کے لیے کوئی مشکل نہیں تھا، البتہ اس کے پاس دینے کے لیے عورت نہیں تھی۔ طویل گفت وشنید کے بعد دونوں فریقوں میں یہ بات طے پا گئی کہ اللہ بخش اپنی کسی رشتے دار عورت کے بجائے اپنی کوئی باندی عبدالستار کے حوالے کردے گا اور اس کے ساتھ ہی کچھ اضافی رقم بھی۔

ایک نوجوان، طرح دار، پُرکشش اور حسین باندی ماجدہ، اللہ بخش کے پاس گزشتہ ایک سال سے زیادہ عرصے سے موجود تھی جسے اس نے اچھی خاصی قیمت ادا کر کے علاقے کے ایک دوسرے زمیندار شریف الدین سے خریدا تھا۔

عبدالستار نے یہ شرط رکھی کہ پہلے وہ اور اس کے لوگ باندی کو دیکھیں گے، اس کے بعد وہ یہ فیصلہ کریں گے کہ آیا یہ عورت ان کے لیے قابلِ قبول ہے یا نہیں۔

ماجدہ کو مہرن کے ذریعے ان ساری باتوں کا پتہ چل چکا تھا۔ اسے اللہ بخش کا گھر چھوٹ جانے کا کوئی غم نہیں تھا، کیونکہ یہ اس کا گھر نہیں تھا۔ اب تو کوئی بھی گھر اس کا گھر نہیں تھا۔ شریف الدین ہو یا اللہ بخش، دونوں ہی اس کے لیے لعنت کے مارے انسان تھے۔ اسے اب اگر فکر تھی تو اس بات کی کہ اس کا ٹھکانہ ایک بار پھر بدل رہا تھا۔ یہاں اللہ بخش کے گھر میں مہرن اور طاہرہ اس کا خیال رکھتی تھیں۔ اگرچہ رخسانہ اس پر دباؤ قائم رکھنے کی غرض سے اس سے بہت کام لیتی تھی، لیکن ماجدہ جفاکش اور نوجوان تھی، وہ کام سے نہیں گھبراتی تھی۔ تاہم، اسے اپنی بچی کے لیے بھی وقت نکالنا پڑتا تھا۔ یہاں مہرن اور طاہرہ دونوں ہی کا سہارا تھا جو بوقتِ ضرورت ثمینہ کو سنبھال لیتی تھیں، اب نئی جگہ جا کر جانے کیسے حالات پیش آئیں۔

اللہ بخش کی ہدایت کے مطابق مہرن اور طاہرہ نے ماجدہ کو سجا بنا کر تیار کیا۔ اسے اب عبدالستار اور اس کے لوگوں کے سامنے پیش کیا جانا تھا۔ ماجدہ اس وقت خود کو بالکل بے مایہ اور بے توقیر محسوس کر رہی تھی۔ اسے ایسا نظر آ رہا تھا کہ اس کی قسمت میں اب صرف بکنا ہی لکھا ہے۔ وہ ایک مالک سے دوسرے مالک کے ہاتھوں میں پہنچتی رہے گی اور اس کے اس منحوس سفر کا اختتام نہ جانے کہاں ہوگا۔ شاید کہیں نہیں ہوگا اور ساری زندگی اسی طرح گزر جائے گی۔

رخسانہ تو دل سے چاہتی تھی کہ ماجدہ اس گھر سے چلی جائے۔ اس نے اپنے شوہر سے کہا کہ اگر وہ لوگ کچھ زیادہ پیسے بھی مانگتے ہیں تو ان کو دے دو، یہ قصہ تو ختم ہو کسی طرح..... اگر صلح نہیں ہوگی تو ہمارے لیے خطرہ ہمیشہ موجود رہے گا۔

عبدالستار نے بنگال کے اس نمکین جادو کو دیکھا اور اسے فوراً ہی پسند کرلیا۔ وہ ماجدہ کو قبول کرنے کے لیے بہ خوشی تیار ہوگیا۔ تقریباً چھ سال کا عرصہ شریف الدین کی حویلی میں اور ڈیڑھ سال کا عرصہ اللہ بخش کی حویلی میں گزارنے کے بعد اب اسے ایک بار پھر ایک نئی جگہ بھیجا جا رہا تھا، لین دین کے جملہ معاملات طے ہو چکے تھے اور اگلے چند روز میں ماجدہ کو دو بھینسوں کے ساتھ عبدالستار کے حوالے کیا جانے والا تھا۔

اگلے چند روز کے بعد ماجدہ کو دو بھینسوں کے ساتھ عبدالستار کی حویلی میں پہنچا دیا گیا۔ دونوں فریقوں کے درمیان رقم، مویشیوں اور عورت کے لین دین کے بعد تنازع وقتی طور پر ختم ہوگیا تھا۔ دونوں فریقوں نے اپنی اپنی ایف آئی آر واپس لے لی تھیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عبدالستار کی حویلی میں ماجدہ کو رہنے کے لیے جو جگہ دی گئی وہ مویشیوں کے باڑے کے قریب واقع ایک کوٹھری تھی۔ اس کوٹھری میں ایک ملازمہ پہلے سے رہتی تھی، جس کا نام صالحہ تھا۔ صالحہ نے اسے بتایا کہ یہاں کچھ دن پہلے تک اس کے ساتھ احمدی نامی ایک عمر رسیدہ عورت رہتی تھی جس کا پچھلے دنوں انتقال ہوگیا تھا اور اس کے بعد سے صالحہ اس کوٹھری میں اکیلی رہتی تھی۔ صالحہ کا باپ عبدالستار کی حویلی میں سائیس کا کام کرتا تھا اور وہ حویلی کے مردانہ حصے میں رہتا تھا، لیکن وہ حویلی کے اس حصے میں جہاں اس کی بیٹی رہتی تھی، اس کے پاس آتا جاتا رہتا تھا۔ اس کوٹھری میں آتے ہی ماجدہ سے اس کی ملاقات ہوگئی تھی۔ وہ ایک بوڑھا آدمی تھا۔ اس کا نام نذیر تھا۔ اس کی بیوی برسوں پہلے انتقال کر چکی تھی اور اس نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ صالحہ اس کی واحد اولاد تھی اور وہ اسے بہت چاہتا تھا۔

ماجدہ کو جب اس حویلی میں لایا گیا تو عبدالستار بہت بیمار ہوگیا۔ وہ ویسے بھی کافی عمر رسیدہ آدمی تھا اور آئے دن بیمار رہتا تھا۔ فی الحال ماجدہ کو بیمار عبدالستار کی تیمارداری اور گھر کے دوسرے کاموں پر مامور کر دیا گیا۔

☆======☆======☆

ماجدہ کو معلوم تھا کہ اسے اس حویلی میں خاص طور سے اس خاندان کے سربراہ عبدالستار کی ''خدمت'' کے لیے لایا گیا ہے، لیکن عبدالستار فی الحال اس سے ''خدمت'' لینے سے قاصر تھا کیونکہ وہ بہت بیمار ہوگیا تھا۔ ماجدہ اس صورتِ حال سے قدرے مطمئن تھی اور اس کی دلی خواہش تھی کہ عبدالستار کی بیماری زیادہ سے زیادہ طول کھینچتی جائے اور وہ اس کی ''خدمت'' کے شر سے زیادہ سے زیادہ عرصے تک محفوظ رہے۔ ماجدہ کو دوسری ملازماؤں اور خادماؤں کی طرح گھریلو کام کاج میں لگا رہنا پڑتا تھا اور اس کے ساتھ ہی نیم جاں عبدالستار کی تیمارداری کا فریضہ بھی اسی کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اگر کوئی شخص عبدالستار کی تیمارداری میں ہاتھ بٹاتا تھا تو وہ عبدالستار کی بیوی فاضلہ خاتون تھی، جو اپنے شوہر کے پاس خاصا وقت گزارتی تھی اور ماجدہ اسی کی نگرانی میں اور اسی کی ہدایات کے مطابق بیمار بڈھے کی تیمارداری کرتی تھی۔ فاضلہ خاتون ماجدہ کی کارکردگی سے خاصی مطمئن تھی اور اس کے ساتھ سخت یا ذلت آمیز رویہ نہیں اختیار کرتی تھی۔

ماجدہ کی خود بھی یہ کوشش ہوتی تھی کہ وہ فاضلہ خاتون کو شکایت کا موقع نہ دے اور وہ نہایت فرمانبرداری اور تابع داری کے ساتھ اس کی ہدایات کے مطابق کام کرتی تھی۔ بیمار

بڈھا عبدالستار بھی ماجدہ سے خوش تھا۔ اس نے کبھی ماجدہ پر کوئی سختی نہیں کی تھی۔ عبدالستار کے تین بیٹے تھے مناف، بصیر اور ندیم..... اور تین بہوئیں تھیں مسرت، بتول اور ناعمہ..... بیٹے دن میں کم از کم ایک بار بیمار باپ کی مزاج پُرسی کے لیے آجاتے تھے لیکن بہوئیں اس فریضے کی ادائیگی کو اپنے لیے کوئی خاص ضروری نہیں سمجھتی تھیں۔ وہ اپنے بچوں اور دوسرے کاموں میں مصروف رہتی تھیں اور اگر کسی وقت ذرا سا موقع مل جاتا تو بیمار سسر کے کمرے میں جھانک لیتیں۔

ماجدہ کے ساتھ کوٹھری میں رہنے والی لڑکی صالحہ، ماجدہ سے عمر میں چھوٹی تھی اور ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ جلد ہی ماجدہ سے کافی بے تکلف ہوگئی۔

ایک روز رات کو جب ماجدہ اور صالحہ اپنے دن بھر کے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد اپنی کوٹھری میں اکیلی تھیں تو صالحہ نے دوران گفتگو ماجدہ سے پوچھا۔ ''تم بنگالن ہو نا؟''

''ہاں میں بنگالن ہوں۔'' ماجدہ نے جواب دیا۔

''تو پھر تمہیں جادو بھی آتا ہوگا؟'' صالحہ نے اس کی طرف متجسس نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جادو؟ کیسا جادو؟'' ماجدہ نے سخت حیران ہو کر صالحہ کی طرف دیکھا۔

''ارے بھئی..... وہی جادو جس کے زور سے لوگ بڑے بڑے کام کر لیتے ہیں، تمہیں بھی ضرور آتا ہوگا۔''

''کیوں بھلا؟'' ماجدہ اس کی بات سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ ''مجھے کیوں جادو آتا ہوگا؟''

''تم بنگالن ہو نا؟'' صالحہ نے کہا۔ ''لوگ کہتے ہیں کہ بنگالی بہت بڑے جادوگر ہوتے ہیں، خاص طور سے بنگال کی عورتیں تو بڑی جادوگرنیاں ہوتی ہیں۔''

''ہوتی ہوں گی۔'' ماجدہ نے قدرے بے زاری کے ساتھ کہا۔ ''میں جادو کے بارے میں کچھ نہیں جانتی اور نہ مجھے جادو وادو آتا ہے۔''

''اگر تمہیں جادو آتا ہوتا تو تم میری مدد کر سکتی تھیں۔'' صالحہ نے قدرے افسردہ لہجے میں کہا۔

''جادو..... جادو سے تمہاری مدد؟'' ماجدہ نے مزید حیران ہو کر پوچھا۔

''ہاں..... صرف جادو ہی میری مدد کر سکتا ہے۔'' صالحہ تقریباً روہانسی ہوگئی۔ ''اور کوئی طریقہ میری مدد کرنے کا نہیں ہے۔ پیر سائیں کسی کے کہنے سننے یا رونے پیٹنے سے اپنا ارادہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں بدلیں گے۔ ہاں اگر کوئی ان پر جادو کر دے تو شاید ان کا ارادہ بدلا جا سکے۔"

"یہ پیر سائیں کون ہیں؟" ماجدہ نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ "اور تم ان سے کیا چاہتی ہو؟ ان کے کس ارادے کو بدلنا چاہتی ہو؟"

"پیر سائیں سے میں کچھ نہیں چاہتی، سوائے اس کے کہ وہ میری جان چھوڑ دیں۔" صالحہ نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "مگر وہ اس کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کا پکا فیصلہ ہے کہ وہ مجھ سے شادی کریں گے..... اور بھلا کس کی مجال ہے، کس میں ہمت ہے جو پیر سائیں کو ان کے ارادے پر عمل کرنے سے روک سکے؟ پیر سائیں کے مرید کہتے ہیں کہ پیر سائیں کے حکم کو نہ ماننے والا شخص سیدھا جہنم میں جائے گا، جہاں فرشتے اسے رات دن آگ کی چھڑیوں سے مارا کریں گے۔ میں چاہتی ہوں کہ پیر سائیں کے دل سے میرا خیال ہمیشہ کے لیے نکل جائے۔ وہ مجھے بھول جائیں اور پھر میری اور طفیل کی شادی ہو سکے۔"

"طفیل؟ کون طفیل؟" ماجدہ نے چونک کر پوچھا۔ "وہ لڑکا جو ریاض گاڑی بان کا بیٹا ہے؟"

"ہاں..... وہی۔" صالحہ نے بہت ہلکی سرگوشی میں جواب دیا۔ اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا تھا۔

ماجدہ طفیل کو جانتی تھی۔ طفیل کا باپ ریاض بیل گاڑیاں ہانکتا تھا اور اکثر دوسرے ملازموں کے ساتھ اناج کی بوریاں لے کر حویلی کے اندر والے گودام میں آتا تھا۔ طفیل خود بھی حویلی میں کام کرتا تھا۔ وہ زنان خانے اور مردان خانے دونوں جگہوں پر آتا جاتا تھا۔ عبدالستار کے کمرے میں بھی اس کا مختلف کاموں کے سلسلے میں آنا جانا لگا رہتا تھا، لیکن ماجدہ نے کبھی اس کو اور صالحہ کو ایک ساتھ اس طرح نہیں دیکھا تھا کہ اسے ان دونوں کے درمیان کسی خصوصی لگاؤ کا اندازہ ہو سکے۔ ویسے بھی ماجدہ اتنی مصروف رہتی تھی کہ اسے اپنے اردگرد کے تمام معاملات پر توجہ دینے اور ان سے واقف ہونے کی فرصت کم ہی ملتی تھی۔ اس کا زیادہ تر وقت عبدالستار کی تیمارداری میں گزر جاتا تھا۔ وہ فاضلہ خاتون کی قائم مقام کے طور پر بڈھے کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ پھر اس خدمت سے جو وقت بچتا تھا، وہ گھر کے دوسرے کاموں میں صرف ہوتا تھا۔ گھر کی سب سے بڑی بہو مسرت کو مچھلی بہت پسند تھی اور وہ آئے دن ماجدہ کو باورچی خانے میں مچھلی پکانے کے کام میں لگا دیتی تھی۔ سب لوگوں کو یقین تھا کہ چونکہ بنگالن ہے، اس لیے اسے بہت اچھی مچھلی پکانی آتی ہوگی۔ ماجدہ نے ان لوگوں کو

مایوس نہیں کیا، بلکہ ان کو بنگالیوں کے انداز میں چاولوں کے ساتھ مچھلی کھانا سکھایا۔

طفیل کا نام صالحہ کی زبان پر آتے ہی ماجدہ کو اس سارے معاملے سے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ یہ پیر سائیں کون تھا؟ صالحہ نے ماجدہ کو اس سارے معاملے کی تفصیلات بتائیں۔

پیر سائیں کا اصلی نام حق نواز تھا۔ وہ ایک آستانے کا گدی نشین تھا اور ایک بڑا زمیندار تھا۔ یہ گدی نشینی اسے اپنے باپ سے ورثے میں ملی تھی۔ جاگیرداری اور پیری، دونوں چیزوں نے مل کر اس کی قوت اور اثر و رسوخ میں بہت اضافہ کر دیا تھا۔ وہ سارے علاقے میں پیر سائیں کہلاتا تھا۔ لوگ اس کا نام نہیں لیتے تھے۔

پیر سائیں پینسٹھ سال کی عمر کا بوڑھا آدمی تھا۔ اس نے اب تک چار شادیاں کی تھیں اور ان چاروں بیویوں سے اس کے درجنوں پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں تھے۔ اس کی سب سے پہلی بیوی کا گزشتہ دنوں انتقال ہو گیا تھا اور فی الحال پیر سائیں کی تین بیویاں تھیں، لیکن وہ ان کی سابقہ تعداد کو بحال کرنا چاہتا تھا۔ اس کی نگاہِ انتخاب صالحہ پر پڑی تھی، جو ایک غریب سائیس کی بیٹی تھی اور خوبصورت تھی۔

طفیل نذیر کا دور کا رشتے دار ہوتا تھا۔ وہ عبدالستار کی حویلی میں کام کرتا تھا اور یہیں رہتا تھا۔ اس کے والدین مر چکے تھے۔ ایک بھائی تھا۔ وہ برسوں پہلے کراچی چلا گیا تھا۔ اس نے وہیں شادی کر لی تھی اور وہیں آباد ہو گیا تھا۔ اس نے یہاں سے سارے رشتے ناتے ختم کر لیے تھے۔ یہاں اب کسی کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ طفیل کا سرپرست نذیر ہی تھا جو طفیل کو اپنے بیٹے کی طرح چاہتا تھا لیکن اس چاہت کی تہہ میں ایک خاص مقصد پوشیدہ تھا۔ نذیر کو اس بات کا علم تھا کہ طفیل اس کی بیٹی صالحہ کو پسند کرتا ہے اور صالحہ بھی اس کو پسند کرتی ہے۔ نذیر کے لیے یہ ایک اچھی بات تھی۔ طفیل اس کی برادری کا ہی لڑکا تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ اس کی بیٹی کو خوش رکھے گا۔

چنانچہ جب پیر سائیں نے ایک روز نذیر کو اپنی خلوت میں طلب کر کے اسے اپنے اس فیصلے سے آگاہ کیا کہ وہ اس کی بیٹی صالحہ سے شادی کرنا چاہتا ہے، تو نذیر پر جیسے بجلی گر پڑی۔

پیر سائیں کی اس وقت تین بیویاں اور درجنوں اولادیں اور اولادوں کی اولادیں موجود تھیں۔ اس لشکر میں بھلا صالحہ جیسی غریب لڑکی کی کیا اوقات ہوتی؟

صالحہ ایک نوجوان لڑکی تھی۔ جبکہ پیر سائیں قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔ چار دن کے بعد وہ صالحہ کو بیوہ چھوڑ کر سدھار جاتا تو اس کی دوسری بیویاں اور اولادیں صالحہ کو دھکے دے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر گھر سے نکال دیتیں۔

نذیر نے بڑی جرأت سے کام لے کر معذرت کرنے کی کوشش کی کہ وہ اپنی بیٹی کا رشتہ اپنے بھتیجے طفیل کے ساتھ طے کر چکا ہے لیکن پیر سائیں نے اس کی معذرت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس کو حکم دیا کہ وہ شادی کی تیاریاں کرے۔

صالحہ کی ماں نہیں تھی۔ اس کا کوئی اور بہن یا بھائی بھی نہیں تھا۔ چنانچہ وہ دونوں باپ بیٹی تمام معاملات کے بارے میں ایک دوسرے سے براہِ راست بات کرنے پر مجبور تھے۔ نذیر نے اپنی بیٹی کو سب کچھ بتا دیا تھا اور صالحہ سخت پریشان اور بدحواس ہو گئی تھی۔ اس نے طفیل کو بھی سب کچھ بتا دیا تھا اور طفیل بھی صدمے سے نڈھال تھا، لیکن ان سب لوگوں میں سے کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس اندھیر کو کس طرح روکا جائے۔

''مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی تھی کہ تم بنگالن ہو۔'' صالحہ نے اپنی داستان ختم کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے امید تھی کہ شاید تمہیں جادو آتا ہو اور تم جادو کے زور سے پیر سائیں کا دل بدل ڈالو۔''

''یہ سب پاگل پن کی باتیں ہیں صالحہ۔'' ماجدہ نے گہری افسردگی کے ساتھ کہا۔ ''مجھے کوئی جادو وادو نہیں آتا اور میں تو یہ جانتی ہوں کہ عورتیں چاہے بنگال کی ہوں یا سرحد کی یا پنجاب کی، سب ایک ہی جیسی قسمتیں لے کر پیدا ہوتی ہیں، چاہے وہ کھلنا کی ماجدہ ہو یا جلال آباد کی گل پری، یا بہاولنگر کی صالحہ..... ہم سب کی تقدیریں ایک ہی جیسی ہیں۔ میں بھلا کسی پر کیا جادو کروں گی؟ مجھے تو خود طرح طرح کے عیاش جادوگروں نے تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔''

اس رات ماجدہ نے صالحہ کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ اس نے صالحہ کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ ہاشم کے حوالے سے بھی سب کچھ بتا دیا۔ صالحہ وہ پہلی لڑکی تھی جس سے ماجدہ نے ہاشم کے بارے میں کھل کر گفتگو کی تھی اور اس گفتگو میں وہ سارا درد سمٹ آیا تھا جو برسوں سے اس کی آنکھوں سے جوئے خوں کی شکل میں بہتا رہا تھا۔ ہاشم کا خیال کبھی اس کے دل سے جدا نہیں ہوا تھا۔ راتوں کی تنہائیوں میں ہاشم کی مغموم تصویر اس کی نمناک آنکھوں میں لہراتی اور چند ساعتوں کے لیے زندگی بالکل بدل جاتی۔ آج صالحہ کی زبانی اس کی اور طفیل کی محبت کی کہانی سن کر ماجدہ کو اپنی محرومی اور دکھ کا اور بھی شدید اور گہرا احساس ہوا اور ہاشم کی یاد کا درد اس کے سارے وجود کو بے تاب کرنے لگا۔ اس نے صالحہ کو بھی اپنے اس درد میں شامل کر لیا۔ دونوں بہت رات گئے تک باتیں کرتی رہیں۔

''تم ایک کام کرو۔'' ماجدہ نے اسے مشورہ دیا۔ ''تم اور طفیل خود جا کر پیر سائیں سے ملو اور ان سے کہو کہ تمہیں ان کی دعاؤں کی ضرورت ہے اور تم ان کی دعائیں لینے کے لیے ان کے پاس آئے ہو۔''

''تمہارے خیال میں کیا پیر سائیں مان جائیں گے؟'' صالحہ نے تذبذب کے ساتھ پوچھا۔

''شاید مان جائیں۔'' ماجدہ نے کہا۔ ''کسی اور کے کہنے سننے کا تو ان پر کوئی اثر نہیں ہو گا۔ تم دونوں کی بات سن کر شاید انہیں یہ خیال آ جائے کہ تمہیں زبردستی اپنی بیوی بنانا اچھا نہیں ہو گا اور یہ کہ تم انہیں شوہر کی حیثیت سے کبھی قبول نہیں کرو گی، کیونکہ تمہارے دل میں تو کوئی اور ہی بسا ہوا ہو گا۔''

''میں..... طفیل سے بات کروں گی۔'' صالحہ نے آہستہ سے کہا۔ ''لیکن بابا سے بات نہیں کروں گی۔ وہ کبھی اس بات کو نہ پسند کریں گے اور نہ اس کی اجازت دیں گے کہ میں طفیل کو ساتھ لے کر پیر سائیں کے گھر جاؤں اور اپنی شادی کے بارے میں کوئی بات کروں۔''

اگلے دن صالحہ نے ماجدہ کو بتایا کہ اس نے طفیل سے بات کی تھی اور طفیل کو یہ خیال بہت پسند آیا تھا۔ طفیل نے کہا تھا۔ ''میں پیر سائیں کے قدموں میں اپنا سر رکھ دوں گا اور گڑگڑا کر ان سے کہوں گا کہ وہ صالحہ کو مجھے بخش دیں۔ میں زندگی بھر ان کی چاکری کروں گا۔''

''بس پھر دیر مت کرو۔'' ماجدہ نے کہا۔ ''فوراً ہی پیر سائیں کے پاس پہنچو۔''

''ہم لوگ کل ہی ان کے پاس جا رہے ہیں۔'' صالحہ نے مضطرب لہجے میں اسے بتایا۔ ''وہاں سے واپس آ کر میں تمہیں بتاؤں گی کہ پیر سائیں نے کیا کہا۔''

اس سے اگلے دن سارا دن ماجدہ بہت مصروف رہی۔ عبدالستار کی طبیعت بہت خراب تھی۔ ڈاکٹر دو بار گھر پر آ کر اسے دیکھ چکا تھا۔ عبدالستار کو بہت تیز بخار تھا اور اس کے سر پر پانی میں بھیگے ہوئے کپڑے کی پٹیاں رکھنا ضروری تھا۔ تلوؤں کو بھی بھیگی ہوئی پٹیوں سے سہلایا جا رہا تھا۔ یہ کام زیادہ تر ماجدہ کر رہی تھی اور فاضلہ خاتون اسے ضروری ہدایات دے رہی تھی۔

کافی رات گئے عبدالستار کا بخار کچھ کم ہوا اور ماجدہ کو اپنی کوٹھری میں جانے کی اجازت ملی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صالحہ پلنگ پر آنکھیں کھولے ہوئے لیٹی تھی اور اس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح دمک رہا تھا۔ آنکھیں ستاروں کی طرح جگمگا رہی تھیں اور اس کے سارے وجود سے روشنی سے لبریز ایک خوشبو پھوٹ رہی تھی۔

ماجدہ کو دیکھتے ہی صالحہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ اس کے چہرے پر ایک ایسی مسکراہٹ نمودار ہوئی جس میں دنیا کی ساری خوشیاں انگڑائیاں لیتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

''کتنی دیر سے آئیں تم آج ماجدہ۔'' صالحہ نے تیز اور شوخ نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ میری تو آنکھیں تھک گئیں۔''

''بڈھے کا بخار کم نہیں ہو رہا تھا۔'' ماجدہ نے کہا۔ ''بڑی بی بی بھی سارا وقت وہیں تھیں۔ خیر..... اب تم جلدی سے بتاؤ کہ کیا ہوا۔ تم دونوں ملے تھے پیر سائیں سے؟''

صالحہ نے جوشِ مسرت میں ماجدہ کو اپنے ساتھ لپٹا لیا اور لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

''سب کچھ ٹھیک ہو گیا ماجدہ..... ارے تم تو سچ مچ جادوگرنی ہو..... بنگال کی جادوگرنی..... تم نے ہمیں ایسا جادو سکھایا کہ ہمارا کام ہو گیا..... خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔ سدا جیو میری بہن..... طفیل نے بھی تمہارا بہت بہت شکریہ ادا کیا ہے۔''

خوشی کے مارے ماجدہ کا چہرہ جیسے گلنار ہو گیا۔ اس کے مشورے پر عمل کرنے سے ان دونوں کی اجڑی ہوئی دنیا آباد ہو گئی تھی۔ اس کے روئیں روئیں سے جیسے مسرت کے سوتے پھوٹنے لگے۔

''اچھا..... پیر سائیں نے تم لوگوں کی مان لی؟'' ماجدہ نے چہک کر پوچھا۔

''ہاں..... مان لی..... بالکل مان لی۔'' صالحہ نے خوشی سے سرشار لہجے میں کہا۔ ''ہم دونوں نے تنہائی میں ان سے ملاقات کی اور اپنے دل کھول کر ان کے سامنے رکھ دیئے۔ وہ تو بڑے ہی مہربان اور نرم دل نکلے۔ ہماری بات سن کر انہیں ذرا سا بھی غصہ نہیں آیا۔ انہوں نے بڑی شفقت کے ساتھ کہا کہ وہ خود ہم دونوں کی شادی کرا دیں گے۔'' پھر صالحہ نے اس ملاقات کی مزید تفصیلات بیان کیں۔ ''انہوں نے ہمیں ہدایت کی کہ فی الحال ہم کسی سے اس بات کا تذکرہ نہ کریں اور جلد ہی وہ خود ہم دونوں کی شادی کا بندوبست کرا دیں گے اور اس شادی کے سارے اخراجات بھی وہ خود ہی اٹھائیں گے۔''

''واہ واہ..... واہ.....'' ماجدہ نے صالحہ کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو تم لوگوں نے ہمت کی تو کام بن گیا۔''

صالحہ بہت دیر تک اپنی آنے والی زندگی کے بارے میں ماجدہ سے باتیں کرتی رہی۔ وہ ماجدہ کے احسان کے بوجھ تلے جیسے دبی جا رہی تھی۔ بنگال کی اس جادوگرنی نے تو واقعی اپنا کمال کر دکھایا تھا۔

صالحہ نے اپنے باپ کو یہ بات بالکل نہیں بتائی تھی اور طفیل کو بھی سختی کے ساتھ منع کر دیا تھا کہ وہ بابا سے اس کا ذکر نہ کرے، لیکن اب تو نتیجہ ان دونوں کے حق میں نکل چکا تھا۔ پیر سائیں نے کہا تھا کہ جلد ہی وہ خود ان دونوں کی شادی کا بندوبست کر دیں گے..... تو پھر ابھی بابا سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وقت آنے پر پیر سائیں خود ہی بابا سے بات کریں گے۔

ماجدہ اس کامیابی سے بہت خوش تھی اور اس بات پر فخر محسوس کر رہی تھی کہ اس نے صالحہ کو صحیح مشورہ دیا۔ اس مشورے پر عمل کر کے دو چاہنے والے واقعی ہجر کے عذاب سے بچ گئے تھے۔

''کاش..... کاش ایسا ہی کچھ میرے اور ہاشم کے ساتھ بھی ہو جاتا۔'' اس نے گہرے دکھ کے ساتھ سوچا۔ ''مگر دنیا میں سارے لوگ الگ الگ قسمتیں لے کر پیدا ہوتے ہیں۔''

اس واقعے کے کئی دن بعد کی بات ہے، اس روز رات کو جب ماجدہ اپنے سارے کام ختم کر کے اور بیمار عبدالستار کو رات کی دوا کی خوراک دے کر اپنی کوٹھری میں آئی تو اس نے صالحہ کو خاصا پریشان پایا۔

''بابا ابھی تھوڑی دیر پہلے آئے تھے۔'' اس نے تشویش آمیز آواز میں کہا۔ ''وہ کہہ رہے تھے کہ طفیل آج صبح سے ہی غائب ہے، نہ جانے کہاں چلا گیا، کسی کو کچھ بتا کر بھی نہیں گیا۔ بابا نے کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر اسے بہت ڈھونڈا لیکن اس کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ اب بھی بابا اس کی تلاش میں گئے ہیں۔ اب تو اتنی رات ہو چکی ہے۔''

صالحہ کی بات سن کر ماجدہ کے دل میں بھی تشویش اور پریشانی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ طفیل اگر زیادہ دیر کے لیے کہیں جاتا تھا تو صالحہ کو یا بابا کو اس کے بارے میں بتا کر جاتا تھا لیکن وہ بغیر کچھ کہے سنے سارا دن کے لیے کہاں غائب ہو سکتا تھا۔

''ہو سکتا ہے، دوستوں کے ساتھ کہیں اِدھر اُدھر نکل گیا ہو.....'' ماجدہ نے اعتماد سے خالی آواز میں کہا۔

''نہیں۔'' صالحہ نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کے دوست بس دو ایک ہی ہیں اور بابا نے ان سے اس کے بارے میں پوچھ لیا ہے۔ ان دوستوں کو اس بارے میں نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

معلوم..... بلکہ وہ تو خود اس کو تلاش کرنے میں لگے رہے ہیں۔''

ماجدہ کے دل میں خوف کی ایک لہر اٹھی۔ کہیں طفیل کسی حادثے کا شکار نہ ہو گیا ہو، لیکن اس نے صالحہ سے اس خدشے کا اظہار نہیں کیا۔

وہ دونوں جاگتی رہیں اور بابا کا انتظار کرتی رہیں کہ وہ واپس آئے اور طفیل کے بارے میں کوئی خبر لائے۔

نذیر بہت رات گئے دوبارہ صالحہ کے پاس آیا۔ اس کے چہرے پر خاک اُڑ رہی تھی اور آنکھوں میں ویرانی رقصاں تھی۔ اس سے کوئی سوال کرنے کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ اس کے چہرے پر ہر سوال کا جواب لکھا ہوا صاف نظر آ رہا تھا۔

''اس کا کہیں کوئی پتہ نہیں چلا۔'' نذیر نے تھکی ہوئی اور مایوسی سے لبریز آواز میں کہا۔ ''جہاں جہاں ممکن ہو سکتا تھا، اس کو تلاش کیا، ہر جگہ پوچھا لیکن کسی کو بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم.....''

''صالحہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو بہنے لگے۔

''اب سو جاؤ۔'' نذیر نے آہستہ سے کہا۔ ''بہت رات ہو گئی ہے، صبح ہو گی تو پھر دیکھیں گے، نئے سرے سے تلاش شروع کریں گے۔''

نذیر کچھ دیر تک رکا پھر چلا گیا۔ ماجدہ اور صالحہ بہت دیر تک جاگتی رہیں۔ صالحہ برابر روئے جا رہی تھی۔ ماجدہ اسے دلاسہ دینے کی کوشش کر رہی تھی لیکن خود اس کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔

اگلے دن اس سارے علاقے میں زبردست ہلچل مچ گئی۔

ایک سڑک کے کنارے جھاڑیوں میں ایک لاش پڑی ہوئی ملی تھی، جسے سائیکل پر دودھ لے جانے والے ایک آدمی نے دیکھا تھا۔ اس نے فوراً آس پاس کے لوگوں کو اطلاع کر دی۔ لوگوں نے آ کر اس لاش کو دیکھا۔ ان میں سے دو افراد نے لاش کو پہچان لیا۔ یہ طفیل نامی نوجوان کی لاش تھی، جو زمیندار عبدالستار کی حویلی کا ایک ملازم تھا۔ عبدالستار کے بیٹوں کو اطلاع دی گئی۔ وہ نذیر کو ساتھ لے کر آئے اور پولیس کو بھی بلوا لیا گیا۔ طفیل کی لاش کی باقاعدہ شناخت ہو گئی۔

لاش کے ابتدائی معائنے سے یہ معلوم ہوا کہ سڑک پر گزرنے والی کسی گاڑی نے طفیل کو کچل دیا تھا اور پھر اس کے نیم مردہ یا مردہ جسم کو گھسیٹ کر سڑک کے کنارے قریبی جھاڑیوں

میں ڈال دیا گیا تھا۔ ڈرائیور نے اپنے جرم کو چھپانے کی کوشش میں کسی کو اس کی اطلاع بھی نہیں دی تھی اور بھاگ گیا تھا۔

پولیس نے نامعلوم ڈرائیور کے خلاف رپورٹ درج کرنے کے بعد لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دیا تھا۔ نذیر زار و قطار رو رہا تھا۔ لوگوں نے اس کو تسلی دی۔ مرنے والا چلا گیا تھا، اب وہ واپس تو نہیں آ سکتا تھا۔

ماجدہ کو طفیل کی موت کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ کیا واقعی وہ مر گیا تھا؟ ابھی ایک دن پہلے تک تو وہ ایک جیتا جاگتا انسان تھا اور اب اچانک گوشت کے ایک ڈھیر میں تبدیل ہو گیا تھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اتنی دور سڑک پر کیا کرنے گیا تھا۔'' نذیر نے روتے ہوئے اپنی بیٹی سے کہا، جس کی آنکھوں میں آنسو تھمنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ ''اور وہ بھی رات کے وقت..... پولیس والے کہہ رہے تھے کہ حادثہ چند ہی گھنٹے پہلے ہوا ہے..... طفیل تو مہینوں سڑک کی طرف نہیں جاتا تھا۔ ادھر تو کوئی آبادی بھی نہیں ہے، کوئی بازار بھی نہیں ہے۔ بس جنگل ہے اور جھاڑیاں ہیں جن کے پاس سے سڑک گزرتی ہے۔ وہ وہاں کیا کر رہا تھا؟''

نذیر کے ان سوالات کا جواب دینے والا کوئی نہیں تھا لیکن صالحہ کے پاس ان سارے سوالوں کے جوابات کے اشارے موجود تھے، کیونکہ جو کچھ صالحہ کو معلوم تھا، وہ نذیر کو نہیں معلوم تھا، مگر وہ ایسی خوفناک بات کو زبان پر لاتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں اشاروں کی جو بجلیاں کوند رہی تھیں، ان کی تڑپ کو اس نے بڑی سختی کے ساتھ اپنے اندر ہی مقید کر کے رکھا ہوا تھا۔

اشاروں کی یہ بجلیاں صرف صالحہ کے وجود میں ہی نہیں تڑپ رہی تھیں، ماجدہ کے دل و دماغ میں بھی ایک زبردست طوفان سر اٹھا رہا تھا اور وہ اس ساعت کو کوس رہی تھی جب اس نے اس صالحہ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ طفیل کو ساتھ لے کر پیر سائیں کے پاس چلی جائے..... صالحہ کس قدر خوش تھی کہ بنگال کا جادو کام کر گیا، لیکن فی الحقیقت جادو پلٹ گیا تھا۔ اچانک ماجدہ کے دل میں پشیمانی آمیز درد کی تیز و تند لہریں اٹھنے لگیں۔ رفتہ رفتہ درد کی اس شدت میں اس قدر اضافہ ہو گیا کہ اس کے لیے اپنے اوپر قابو رکھنا مشکل ہو گیا۔ اسے ایسا لگا کہ اگر اس نے اپنے اس بے کراں درد میں کسی کو شریک نہیں کیا، کسی اور کو اس راز میں حصہ دار نہیں بنایا تو اس کا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ وہ صالحہ کو اپنے دل کا خوفناک راز بتائے بغیر اور صالحہ کے اپنے دل کا راز جانے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ اس نے گہری آزردگی اور شکستگی میں ڈوبے ہوئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لہجے میں صالحہ سے بات کی۔

''صالحہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ طفیل کو کسی نے جان بوجھ کر..... میرا مطلب ہے.....''

''میں جانتی ہوں ماجدہ۔'' صالحہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''میں سب سمجھ رہی ہوں۔ میرے دل میں بھی یہی بات ہے اور اگر پیر سائیں نے ایسا کیا ہے تو یہ ان کے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ وہ اس سے پہلے بڑی خاموشی سے کئی آدمیوں کو ختم کروا چکے ہیں اور ایسا کرنے کے لیے ان کے پاس ایک ہی جواب ہوتا تھا..... اللہ کی مرضی..... وہ اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی قرار دیتے ہیں۔ ان سے کوئی کچھ پوچھ بھی نہیں سکتا۔ لوگوں کو معلوم ہوتا ہے لیکن پھر بھی وہ خاموش رہتے ہیں۔''

''مگر یہ انہوں نے بہت بُرا کیا صالحہ!'' ماجدہ نے غم آلود لہجے میں کہا۔ ''انہوں نے تم لوگوں کو دھوکا دیا۔''

''انہوں نے ہم لوگوں کو دھوکا نہیں دیا ہے ماجدہ۔'' صالحہ نے ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''انہوں نے خود کو دھوکا دیا ہے۔ اور بہت جلد انہیں اس کا علم بھی ہو جائے گا۔''

اس بات کے کوئی ہفتے بھر کے بعد پیر سائیں نے نذیر کو طلب کیا اور اس کو دوبارہ حکم دیا کہ وہ شادی کی تیاریاں کرے اور زیادہ سے زیادہ اگلے پندرہ دن میں صالحہ کو اس کے حوالے کر دے۔ ''اس کا منگیتر بے چارہ اب زندہ ہی نہیں رہا، تو پھر اب مزید وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟'' پیر سائیں نے کہا۔ ''دو ہفتے کے اندر اندر نکاح ہو جانا چاہیے۔ اس سے زیادہ ایک دن کی بھی گنجائش نہیں۔''

''جو حکم پیر سائیں۔'' نذیر نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ اس کے پاس اب انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ طفیل مر چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔

ماجدہ کو صالحہ کی زبانی سب کچھ معلوم ہو گیا تھا اور اس کے دکھ کی انتہا نہیں تھی۔ اس نے تو صالحہ اور طفیل کی مدد کرنے کی کوشش کی تھی لیکن یہاں تو سب کچھ الٹ گیا تھا..... اور اب پیر سائیں کے ساتھ صالحہ کی شادی کو کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

چند ہی دن کے اندر اندر اس بات کی باقاعدہ تشہیر کر دی گئی کہ پیر سائیں کی نگاہِ کرم نے ایک غریب سائیں کی بیٹی کی تقدیر بدلنے کا فیصلہ کیا ہے اور وہ اس سے نکاح کر رہے ہیں۔

لیکن پیر سائیں کی یہ خواہش کبھی بھی پوری نہ ہو سکی۔

شادی سے تین دن پہلے رات کو صالحہ نے دکھ بھری آواز میں ماجدہ سے کہا۔ ''پیر سائیں یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے ہم لوگوں کو دھوکا دے کر قلعہ فتح کر لیا ہے، مگر نہیں ماجدہ..... پیر سائیں کتنے بھی دھوکے دے لیں، وہ یہ قلعہ کبھی بھی فتح نہیں کر سکیں گے۔''

''مگر انہیں کوئی کیسے روک سکتا ہے صالحہ؟'' ماجدہ نے دھیمی آواز میں کہا۔

''انہیں میں روکوں گی۔'' صالحہ نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

''تم؟'' ماجدہ نے سخت حیرت کے ساتھ کہا۔ ''تم ان کو کیسے روکو گی؟''

صالحہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے گھٹنوں میں سر دیئے روتی رہی۔

شادی سے ایک دن پہلے صالحہ غائب ہو گئی۔ صالحہ کو شادی کے لیے دلہن کے طور پر تیار کرنے اور ساری ابتدائی تیاریاں کروانے کا کام عبدالستار کی سب سے بڑی بہو مسرت انجام دے رہی تھی۔ پیر سائیں نے اس کام کے لیے اس کو مقرر کیا تھا اور مسرت اس بات سے بہت خوش تھی کہ پیر سائیں نے یہ اعزاز اس کے کھاتے میں ڈالا تھا۔ وہ کپڑوں اور زیورات کا بھی بندوبست کر رہی تھی جس کے لیے پیر سائیں نے خاصی بڑی رقم مہیا کر دی تھی۔

صالحہ غائب ہو گئی۔ وہ حویلی میں کہیں نہیں تھی۔ اسے ہر طرف تلاش کر لیا گیا۔ ماجدہ تو پاگلوں کی طرح ہر طرف اسے ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ نذیر سر پر خاک اُڑاتا پھر رہا تھا۔ مسرت بدحواس ہوئی جا رہی تھی۔ آخر صالحہ گئی کہاں؟ پیر سائیں اس کے نہ ملنے سے کتنا ناراض اور پریشان ہوں گے۔

لیکن صالحہ کہیں بھی نہیں گئی تھی..... وہ تو وہیں موجود تھی، بس ان لوگوں کو نظر نہیں آ رہی تھی، کیونکہ وہ کنوئیں کے اندر تھی۔

کنویں میں اس کی موجودگی کا علم اس وقت ہوا جب پانی بھرنے کے دوران بالٹی اندر کسی چیز میں پھنس گئی اور زور لگانے کے باوجود باہر نہیں نکلی۔ تب معلوم ہوا کہ کنویں کے اندر کسی کی لاش تھی۔ کنویں کے اندر اترنے والے نے دیکھا کہ لاش کی ایک ٹانگ رسی میں پھنس گئی تھی۔ لاش کو جب باہر نکالا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ صالحہ کی لاش تھی۔

ساری حویلی میں زبردست سنسنی پھیل گئی۔ یہ ایک بہت سنگین واقعہ تھا، لیکن اس کو اندر ہی اندر دبا دیا گیا۔ پولیس نے اسے ایک اتفاقیہ حادثہ قرار دیا۔ متوفیہ کسی وقت کنویں کے پاس سے گزرتے ہوئے غلطی سے اس میں گر پڑی تھی، قصہ ختم.....

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماجدہ کی آنکھوں سے خون کے آنسو بہہ رہے تھے۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے صالحہ نہیں مری ہے بلکہ وہ خود مر گئی ہے۔ وہ جو اتنے عرصے سے مسلسل مرتی چلی آ رہی تھی، بار بار مرتی تھی، ایک بار پھر مر گئی تھی۔ وہ سارا وقت روتی رہی اور دل ہی دل میں پیر سائیں کو بد دعائیں دیتی رہی۔ شدید احساس پشیمانی اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو طفیل کا اور صالحہ کا قاتل سمجھ رہی تھی۔ کاش اس نے ان لوگوں کو یہ مشورہ نہ دیا ہوتا۔

''لیکن پھر کیا ہوتا؟'' اس نے دل میں سوچا۔ ''انجام اس سے کچھ زیادہ مختلف نہ ہوتا شاید..... پیر سائیں ضرور صالحہ سے شادی پر اصرار کرتا اور شاید صالحہ اور طفیل دونوں ہی اپنی جان دے دیتے..... ہاں، زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ انجام تو بہر حال یہی ہونا تھا۔''

آنے والے دن ماجدہ کے لیے بڑے ہی پھیکے، بے رنگ، صبر آزما اور اکتا دینے والے تھے..... اس کی ساری توجہ کا مرکز اس کی بیٹی ثمینہ تھی، جس پر وہ اپنی مرضی کے مطابق توجہ نہیں دے پا رہی تھی۔ ثمینہ وہ واحد ہستی تھی جس سے ماجدہ بنگالی بول سکتی تھی اور بولتی تھی۔ وہ ثمینہ سے ہمیشہ بنگالی میں بات کرتی تھی اور ثمینہ نے بنگالی بول چال کافی اچھی طرح سیکھ لی تھی، باوجودیکہ یہاں اس کی ماں کے علاوہ اور کوئی بھی بنگالی نہیں بولتا تھا۔

عبدالستار کی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی تھی اور اسی تناسب سے ماجدہ کی مصروفیات میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسے زیادہ سے زیادہ وقت بڈھے کے ساتھ صرف کرنا پڑ رہا تھا۔ عبدالستار کو ہسپتال لے جایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے اسے تین دن تک داخل رکھا۔ یہ تین دن ماجدہ کے لیے بہت سکون کے دن تھے۔ اسے بڈھے کی تیمارداری کے ناخوشگوار اور بوجھل فریضے سے نجات مل گئی تھی، لیکن تین دن کے بعد ڈاکٹروں نے عبدالستار کو یہ کہہ کر واپس بھیج دیا کہ اب اسے دوا کی نہیں بلکہ دعا کی ضرورت ہے۔ لیکن دعائیں بھی بڈھے کو کوئی فائدہ نہ پہنچا سکیں۔ ہسپتال سے واپس آنے کے تیسرے دن عبدالستار کو طویل زندگی اور طویل بیماری دونوں سے نجات مل گئی۔ بڈھے کی موت کا سب سے زیادہ صدمہ اس کی بیوی فاضلہ خاتون کو تھا۔ ایک لمبا ساتھ تھا، رفاقت کا ایک طویل عرصہ تھا جو دونوں نے مل کر گزارا تھا اور اب سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ وہ خود کو بہت تنہا محسوس کر رہی تھی۔

بڈھا جب تک زندہ تھا، تب تک زمین اور جائیداد کے تمام معاملات ٹھیک چل رہے تھے۔ تینوں بیٹوں کے سر پر اس کا جوتا موجود رہتا تھا اور وہ دم نہیں مار سکتے تھے۔ بڈھے کے ہر حکم کو آخری درجہ حاصل ہوتا تھا، لیکن بڈھے کی آنکھ بند ہوتے ہی تینوں بیٹوں میں آپس میں

کھینچا تانی شروع ہو گئی۔ مناف سب سے بڑا بیٹا تھا اور اس نے باپ کی جاں نشینی کا حق طلب کیا۔ اس کی بیوی مسرت مکمل طور پر اس کے ساتھ تھی، لیکن دونوں چھوٹے بھائیوں بصیر اور ندیم نے اس کی ولی عہدی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ان کی بیویاں بتول اور ناعمہ اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ تھیں۔ گھر میں خانہ جنگی کا آغاز ہو گیا۔ غمزدہ فاضلہ خاتون بگڑے ہوئے حالات کو سنبھالنے کی کوشش کرتی تھی، مگر شوہر کی موت کے بعد اس گھر میں اس کی اوقات بھی کچھ نہیں رہی تھی۔ بیٹے بات بات پر غراتے تھے، بہوئیں خاطر میں نہیں لاتی تھیں اور کوئی کسی کام کے لیے اس سے نہیں پوچھتا تھا۔ سب لوگ اسے نظر انداز کرتے تھے۔

فیاض اس علاقے کا نہیں تھا۔ وہ ڈیرہ غازی خاں کا رہنے والا تھا اور کئی برس پہلے تلاش معاش میں گھومتا پھرتا ادھر آ نکلا تھا۔ یہاں اسے زمیندار عبدالستار کی حویلی میں نوکری مل گئی۔ اب اسے یہاں کام کرتے ہوئے کئی سال گزر چکے تھے۔ اس دوران وہ دو ایک بار چھٹی لے کر اپنے گھر بھی جا چکا تھا۔ فیاض حویلی کے اندرونی حصے میں کام کرتا تھا۔ اس کا زیادہ تر کام باورچی خانے کی صفائی ستھرائی کا تھا۔

صالحہ کی دردناک موت پر ماجدہ کو تسلی دینے والا ایک ہی شخص تھا اور وہ تھا فیاض، جسے ماجدہ اور صالحہ کی گہری دوستی کا بخوبی اندازہ ہونے کے ساتھ ساتھ ماجدہ کے دکھ کا بھی احساس تھا۔ صالحہ کی موت کے بعد فیاض ماجدہ کے خاصا قریب آ گیا تھا اور اکثر اس سے بہت دیر باتیں کرتا رہتا تھا۔ ماجدہ کو فیاض کی شکل میں ایک دردمند اور مہربان دوست مل گیا تھا جس سے باتیں کر کے، جس کے ساتھ بیٹھ کر اسے ایک گونہ سکون حاصل ہوتا تھا۔ وہ بالکل غیر محسوس طریقے پر فیاض کے قریب آتی جا رہی تھی۔

عبدالستار کی موت کے بعد سے حویلی کی سیاست میں بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوتی جا رہی تھیں۔ دونوں چھوٹے بھائی بڑے بھائی کے مخالف تھے اور بڑا بھائی دونوں چھوٹے بھائیوں کا دشمن بن گیا تھا۔ دو پارٹیاں بن گئی تھیں۔ فاضلہ خاتون اپنے برسر پیکار بیٹوں میں صلح صفائی کی کوشش کرتی رہتی تھی، لیکن اس کی کوئی نہیں سنتا تھا۔ بلکہ الٹا بہوئیں اس پر آنکھیں نکالنے لگتی تھیں۔

دونوں چھوٹے بھائی اب کھل کر جائیداد کی تقسیم کا مطالبہ کر رہے تھے اور بڑا بھائی سختی کے ساتھ اس مطالبے کو مسترد کر رہا تھا۔ ماں آٹھ آٹھ آنسو روتی تھی اور کوشش کرتی تھی کہ کسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طرح کوئی تصفیہ ہو جائے لیکن اس کی اوقات اب دو کوڑی کی ہو کر رہ گئی تھی۔ ساری حویلی میں ایک زبردست کشیدگی کی فضا تھی۔ ملازم اور ملازمائیں سہمے سہمے رہتے تھے۔ مالک لوگوں اور خاص طور سے تینوں بہوؤں کا پارہ ہر وقت چڑھا رہتا تھا۔ وہ آپس میں ایک دوسرے سے ہر وقت لڑنے جھگڑنے کے علاوہ ملازموں سے بھی بہت بُری طرح پیش آتی تھیں اور بات بے بات انہیں بُری طرح ڈانٹتی رہتی تھیں۔ ہر بہو یہ چاہتی تھی کہ صرف اس کے احکامات پر عمل کیا جائے۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ یہاں سے نوکری چھوڑ کر چلا جاؤں۔'' ایک دن فیاض نے ماجدہ سے کہا۔ ''یہاں کے حالات روز بروز خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ یہاں کے لڑائی جھگڑوں کا خدا جانے کیا انجام ہوگا۔''

ماجدہ کے دل پر ایک گہری چوٹ لگی۔ صالحہ کی موت کے بعد فیاض اس کا ایک اچھا دوست تھا جس کا وجود ماجدہ کے لیے ایک بڑا سہارا تھا۔ اب اگر وہ بھی چلا گیا تو پھر..... پھر وہ بہت اکیلی رہ جائے گی۔

اس حویلی کے لڑائی جھگڑوں کا انجام بھی دردناک ہوا۔

مناف ایک شام اپنی جیپ پر زمینوں سے واپس آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ صرف ایک ڈرائیور تھا۔ راستے میں کسی کمین گاہ سے اس کی جیپ پر فائرنگ کی گئی۔ مناف اور اس کا ڈرائیور، دونوں ہلاک ہو گئے، حملہ آور فرار ہو گئے۔

حویلی خبر پہنچی تو وہاں ایک قیامت برپا ہو گئی۔ فاضلہ خاتون پر سکتہ طاری ہو گیا اور مسرت پر غشی کے دورے پڑنے لگے۔ مسرت کے میکے والوں نے فوراً ہی معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مناف کے دونوں چھوٹے بھائیوں کے نام ایف آئی آر میں درج کروا دیئے۔ فاضلہ نے رو رو کر ان لوگوں سے التجا کی کہ وہ ایسا نہ کریں، لیکن انہوں نے صاف کہا کہ مناف کو جائیداد کے تنازع میں اس کے دونوں چھوٹے بھائیوں نے قتل کروایا ہے اور وہ انہیں پھانسی لگوائے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ مسرت کے میکے والوں نے حویلی میں مسرت کی حفاظت کے نام پر اپنے کئی آدمی تعینات کر دیئے۔

''میں نے اب یہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔'' اس رات فیاض نے ماجدہ سے کہا۔ ''اس جگہ اب پتہ نہیں خون کی کتنی ندیاں بہہ جائیں گی۔ اس قسم کے جھگڑے جب ایک بار شروع ہوتے ہیں تو پھر آسانی سے ختم نہیں ہوتے۔ میں فاضلہ خاتون کو بتا دوں گا کہ میں

اب مزید کام نہیں کرنا چاہتا..... اور میں..... میں تم سے بھی ایک بات کہنا چاہتا ہوں..... خاموشی سے میرے ساتھ نکل چلو..... یہاں کسی کو تمہارے پیچھے آنے کی فرصت نہیں ہوگی۔ یہ سب لوگ اپنے اپنے چکروں میں گرفتار ہیں۔ انہیں اپنی اپنی جان کی پڑی ہے..... وہ تمہیں کہاں ڈھونڈتے پھریں گے۔''

ماجدہ کے دل میں ہیجان و اضطراب کی ایک شدید رَو دوڑ گئی۔ شاید..... شاید یہی وہ بات تھی جو وہ فیاض کی زبان سے سننے کی آرزومند تھی لیکن اس آرزو کو اس نے کبھی اپنے دل میں پورے طور پر ابھرنے نہیں دیا تھا۔

''مگر..... میں..... میں ثمینہ کو لے کر تمہارے ساتھ کہاں جا سکتی ہوں؟'' اس نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں کہا۔ ''میں.....''

''تم کسی کی بیوی نہیں ہو۔'' فیاض نے سرگوشی میں کہا۔ ''کوئی شخص تمہارا شوہر ہونے کا دعویدار نہیں ہے۔ تم میرے ساتھ چلو..... ہم دونوں شادی کر لیں گے۔ میں ثمینہ کو اپنی بیٹی کی طرح رکھوں گا.....''

شادی..... ماجدہ پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ فیاض اس کے ساتھ شادی کرنے اور اس کی بیٹی کو اپنانے پر تیار تھا۔

اس نے فیصلہ کرنے میں ایک منٹ بھی ضائع نہیں کیا۔ اس حویلی میں اس کے لیے کچھ نہیں تھا، نہ پہلے نہ اب.....

اگلے روز فیاض نے فاضلہ خاتون کو بتایا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے اپنے گھر جانا چاہتا ہے۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ وہ اب واپس نہیں آئے گا، کیونکہ اس صورت میں شاید فاضلہ خاتون اس کو روکنے کی کوشش کرتی۔ فاضلہ خاتون سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی اور زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں ہی پڑی رہتی تھی۔ پہلے تو میاں کی موت کا صدمہ اور پھر بیٹوں کی ایک دوسرے کے ساتھ خونی دشمنی اور بڑے بیٹے کا قتل..... چھوٹے بیٹوں کا قتل کے الزام میں ماخوذ کیا جانا..... ان سارے صدمات نے فاضلہ خاتون کو جیسے زندہ درگور کر دیا تھا۔ اسے اب اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ حویلی میں کون ملازم رہتا ہے اور کون جاتا ہے۔ حویلی کی اندرونی افراتفری میں کسی کو فیاض کے بارے میں سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔

فیاض نے ماجدہ کو بتا دیا کہ وہ اسے کہاں ملے گا اور خود حویلی سے چلا گیا۔ ماجدہ نے اپنے کپڑوں وغیرہ کی پوٹلی پہلے ہی اس کے حوالے کر دی تھی۔ چند گھنٹوں کے بعد ماجدہ خود

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی ثمینہ کو ساتھ لے کر خالی ہاتھ حویلی سے باہر نکل گئی۔ کسی نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ شاید کسی کام سے حویلی سے باہر جا رہی ہوگی۔

فیاض مقررہ جگہ پر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اسے اور ثمینہ کو ساتھ لے کر ایک تانگے میں بیٹھ کر سیدھا ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ حویلی سے نکلنے کے بعد ماجدہ نے ایک بار بھی پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

وہ دونوں ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔

''ہم پہلے لاہور جائیں گے۔'' فیاض نے ماجدہ کو بتایا۔ ''ہفتہ دس دن لاہور میں رہیں گے اور گھومیں پھریں گے۔ لاہور میں میرے کئی دوست ہیں۔ میں ان سے ملوں گا۔ اس کے بعد ڈیرہ غازی خان چلیں گے تاکہ اگر اس دوران کوئی ہمارے بارے میں ڈیرہ غازی خاں سے معلومات حاصل کرنا چاہے تو اسے کچھ بھی نہ معلوم ہو سکے۔''

''لیکن لاہور میں ہم..... میرا مطلب ہے..... کس طرح ایک ساتھ.....''

''اس کی تم فکر مت کرو۔'' فیاض نے کہا۔ ''میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں۔ لاہور پہنچ کر ہم نکاح کر لیں گے۔ جب ہم ڈیرہ غازی خان پہنچیں گے تو اس وقت تک ہم میاں بیوی بن چکے ہوں گے۔ کوئی ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا۔''

ماجدہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کتنے عرصے کے بعد..... ذلت اور محرومی کی زندگی کے کتنے برسوں کے بعد..... کسی نے اس کی عزتِ نفس کو ابھرنے کا موقع دیا تھا۔ وہ خود کو ایک آزاد انسان کی طرح محسوس کر رہی تھی۔

فیاض نے اسے ثمینہ کے ساتھ ٹرین کے زنانے ڈبے میں بٹھا دیا اور خود مردانہ ڈبے میں جا بیٹھا۔

''میں بیچ بیچ میں آتا رہوں گا۔'' اس نے ماجدہ سے کہا۔ ''تم پریشان مت ہونا.....''

ماجدہ نے اپنے چہرے کو چادر سے تقریباً نصف چھپا رکھا تھا اور وہ پوری طرح ہوشیار تھی، تاہم اسے کوئی آشنا چہرہ نظر نہیں آیا۔

ماجدہ خوش اور مطمئن تھی کہ اسے وہاں سے نکل بھاگنے کا موقع مل گیا تھا اور اب اس کی دلی خواہش پوری ہونے والی تھی۔

اسٹیشن بدلتے گئے اور زبان بھی بدلتی گئی۔ ماجدہ پنجابی زبان سے بالکل نابلد نہیں تھی۔ اب تک جن حویلیوں میں اس نے وقت گزارا تھا، وہاں کوئی نہ کوئی پنجابی بولنے والا بھی موجود

تھا۔

اب جس اسٹیشن پر بھی گاڑی رکتی وہاں صرف پنجابی یا پھر تھوڑی بہت اردو سنائی دیتی تھی۔ فیاض بیچ بیچ میں آ کر اسے اور ثمینہ کو دیکھ لیتا تھا۔ ان کو کھانے پینے کی چیزیں بھی فراہم کر دیتا تھا۔

ماجدہ آنے والی زندگی کے تصور میں مست تھی۔ ''بس، خدا کرے لاہور پہنچتے ہی ہمارا نکاح ہو جائے۔'' وہ دل میں کہہ رہی تھی۔ ''میں فیاض سے کہوں گی۔ ایک منٹ کی بھی دیر نہ کرے۔ سب سے پہلے نکاح کر لے۔''

بالآخر وہ لوگ لاہور پہنچ گئے۔ ماجدہ نے لاہور کا نام بہت سنا تھا۔ لاہور کا شاندار ریلوے اسٹیشن اسے بہت اچھا لگا۔

''خدا کا شکر ہے کہ ہم بخیر و عافیت لاہور پہنچ گئے۔'' فیاض نے ایک طمانیت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''اب ہمیں کسی کا خوف نہیں ہے۔''

''ہمارا خوف پوری طرح تو اس وقت دور ہوگا فیاض، جب ہمارا نکاح ہو جائے گا۔'' ماجدہ نے کہا۔ ''تب ہمیں کسی طرف سے بھی خطرہ نہیں ہوگا۔ بس تم جلدی سے کسی مولوی کے پاس چلو جو ہمارا نکاح پڑھا دے۔''

''تم اس کی فکر مت کرو۔'' فیاض نے اسے اطمینان دلایا۔ ''نکاح تو خیر اب ہو ہی جائے گا۔ اگر کوئی ہم سے پوچھے گا تو ہم یہی بتائیں گے کہ ہم میاں بیوی ہیں۔''

فیاض کے پاس اچھی خاصی رقم تھی، جو وہ اپنی ملازمت کے دوران جمع کرتا رہا تھا۔ ماجدہ کے پاس بھی کچھ رقم تھی، جو اس نے بچا کر رکھی تھی۔ اسے کوئی تنخواہ تو ملتی نہیں تھی۔ جو کچھ انعام، بخشش یا خیرات کے نام پر مل جاتا تھا، وہ اسے سنبھال کر رکھ لیتی تھی۔

فیاض اسے لے کر ایک چھوٹے سے، معمولی درجے کے ہوٹل میں آیا اور یہاں اس نے ماجدہ کو اپنی بیوی بتا کر ایک کمرہ کرائے پر لے لیا۔

☆======☆======☆

ہوٹل کی وہ رات ماجدہ کی زندگی کی ایک بہت اہم رات تھی۔ اگرچہ وہ اس کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھی اور اس کا اصرار یہی تھا کہ انہیں نکاح تک انتظار کرنا چاہیے، لیکن فیاض کی بے تابی اپنے عروج پر تھی اور وہ ساری حدیں پھلانگنے پر مُصر تھا۔

ماجدہ انکار نہیں کر سکی۔ فیاض اس کا ہونے والا شوہر تھا۔ بس ایک آدھ دن کی ہی تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بات تھی.....اور ویسے بھی ماجدہ کے پاس اب ایسا کچھ نہیں بچا تھا جس کے کھو جانے کا اسے غم ہو۔ وہ ایک لٹی پٹی عورت تھی، جو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتی رہی تھی۔

صبح کو فیاض بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے ماجدہ کو گلے لگا لیا اور ثمینہ کو پیار کیا۔ ماجدہ کا دل بھر آیا۔ اسے ایسا لگا جیسے یہ اس کا چھوٹا سا خوش وخرم خاندان ہے، وہ خود اس کا شوہر اور اس کی بیٹی..... کاش..... یہ سب کچھ ہمیشہ ایسا ہی رہے..... وہ اور فیاض میاں بیوی بن کر ایک دوسرے کی رفاقت میں زندگی گزار دیں۔ ایک چاہنے والا شوہر مل جائے تو پھر اور کیا چاہیے۔

وہ دل ہی دل میں فیاض کی وسیع القلبی کی معترف اور مداح تھی۔ فیاض نے اس کے بارے میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس کو بیوی کے طور پر قبول کیا تھا۔ یہ واقعی بہت بڑی بات تھی۔ وہ ایک ایسی عورت تھی جسے مرد صرف باندی اور داشتہ بنا کر ہی رکھنا چاہتے تھے۔ فیاض نے تو اسے بیوی کا درجہ دے دیا تھا۔

''میں اب چلوں گا۔'' ناشتہ کرنے کے بعد فیاض نے اس سے کہا۔ ''اگر دوپہر کے کھانے تک واپس نہ آ سکوں، تو میرا انتظار نہ کرنا اور کھانا منگا کر کھا لینا۔ میں کسی نکاح خواں سے بھی بات کروں گا اور دیکھوں گا اگر یہاں کہیں کسی ملازمت کا بندوبست ہو جائے تو بہت اچھا ہے۔ ہم لوگ کچھ دن کے لیے یہیں رہ جائیں گے۔''

''یہ تو بہت اچھا ہوگا۔'' ماجدہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ''اگر حویلی سے کوئی ہماری تلاش میں ڈیرہ غازی خان جائے گا تو اسے وہاں ہمارے بارے میں کچھ پتہ نہیں چل سکے گا۔''

''ہاں۔'' فیاض نے کہا۔ ''وہاں کسی کو بھی ہمارے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہے اور معلوم ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ میں نے اپنے گھر والوں کو کچھ بتایا ہی نہیں ہے۔ میں تو انہیں اس وقت حیران کر دوں گا جب تم کو اور ثمینہ کو اپنے ساتھ لے کر وہاں پہنچوں گا۔''

فیاض کچھ دیر بعد ہوٹل سے چلا گیا۔ اس نے ماجدہ کو ہوشیار رہنے کی تاکید کر دی تھی۔

ماجدہ دوپہر کے کھانے کے وقت بے چینی سے فیاض کا انتظار کرتی رہی، لیکن فیاض نہیں آیا۔ ماجدہ نے اس کی ہدایت کے مطابق کھانا منگوا کر کھا لیا اور ثمینہ کو بھی کھلا دیا۔ پھر وہ آرام کرنے کے لیے لیٹ گئی۔

فیاض شام کو واپس آیا۔ وہ خاصا خوش نظر آ رہا تھا۔

''مجھے یہاں کام مل گیا ہے۔'' اس نے خوش ہوتے ہوئے ماجدہ کو بتایا۔ ''میری دن بھر کی دوڑ دھوپ رائیگاں نہیں گئی۔ مجھے ایک پرانا دوست مل گیا۔ اس نے میرے لیے کام کا بندوبست کر دیا ہے اور میں نے نکاح خواں سے بھی بات کر لی ہے۔ ان کو پیشگی نذرانہ بھی دے دیا ہے۔ کل ہمارا نکاح بھی ہو جائے گا۔''

''واقعی؟'' ماجدہ نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔ ''کل..... کل ہمارا نکاح ہو جائے گا؟''

''ہاں ماجدہ۔'' فیاض نے کہا۔ ''کل ہمارا نکاح ہو جائے گا اور پھر ہم زندگی بھر ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔''

وہ رات بھی ان دونوں نے خوشگوار انداز میں گزاری۔ ماجدہ اب کسی تکلف سے کام نہیں لے رہی تھی۔ فیاض اس کا شوہر گویا بن ہی چکا تھا۔

''آج ہم یہ ہوٹل چھوڑ دیں گے۔'' اگلے دن صبح کو فیاض نے ماجدہ سے کہا۔ ''میں تمہیں اپنے دوست کے گھر لے چلوں گا۔ اس کا نام عزیز ہے اور وہ کافی عرصے سے لاہور میں رہتا ہے۔ اس کے بیوی بچے ان دنوں ڈیرہ غازی خاں گئے ہوئے ہیں اور وہ اکیلا ہے۔ فی الحال ہم لوگ اس کے گھر میں رہیں گے۔ اس کے گھر والوں کی واپسی تک میں کوئی دوسرا ٹھکانہ تلاش کر لوں گا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمیں یہاں سر چھپانے کا ایک محفوظ ٹھکانہ مل گیا ہے۔''

''خدا ہم پر مہربان ہے فیاض۔'' ماجدہ نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سارے کام خود بخود بنتے چلے جا رہے ہیں۔''

''اور ان شاء اللہ آئندہ بھی بنتے رہیں گے۔'' فیاض نے مسکرا کر کہا۔

دوپہر سے ذرا دیر پہلے وہ لوگ تانگے میں وہاں سے روانہ ہو گئے۔ لاہور ماجدہ کے لیے ایک بالکل نیا شہر تھا اور وہ راستے کی تمام چیزوں کو بڑے شوق اور دلچسپی کے ساتھ دیکھتی جا رہی تھی۔

کچھ دیر کے بعد تانگہ پرانے شہر کی ایک گلی میں واقع ایک مکان کے دروازے کے سامنے جا کر رک گیا۔ یہ ایک دو منزلہ مکان تھا۔

فیاض کی دستک کے جواب میں تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والا ایک پینتیس چالیس سال کا مضبوط بدن اور نا ٹے قد کا آدمی تھا جس کے چہرے پر ہلکی ہلکی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

داڑھی تھی۔اس کو دیکھتے ہی ماجدہ کو جو پہلا احساس ہوا وہ یہ تھا کہ یہ شخص عمر میں فیاض سے کافی بڑا تھا۔مہمانوں کو دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔سب لوگ اندر آ گئے۔

''یہ عزیز ہے۔'' فیاض نے اپنے دوست کا ماجدہ سے تعارف کرایا۔''میرے ہی شہر کا رہنے والا ہے اور میرا دوست.....اور عزیز، یہ ماجدہ ہے۔'' اس نے ماجدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آیئے آیئے، بھابی آیئے۔'' عزیز نے بڑی اپنائیت کے انداز میں کہا۔''مجھے فیاض نے آپ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔''

بھابی.....اس لفظ نے ماجدہ کے جسم میں گویا ایک نئی روح پھونک دی۔اس نے خود کو آسمانوں میں اُڑتے ہوئے محسوس کیا۔کوئی اسے اتنی عزت دے رہا تھا جس کے بارے میں وہ سوچنا بھی بھول گئی تھی۔اچانک سب کچھ کس قدر تیزی سے بدل گیا تھا۔وہ کسی کی منکوحہ بننے جا رہی تھی۔کسی کی بھابی بن رہی تھی۔اسے انسانی رشتوں کا احترام حاصل ہو رہا تھا۔

عزیز نے ان لوگوں کو ایک اندرونی کمرے میں لا کر بٹھایا اور فوراً ہی بے تکلفی کے ساتھ ماجدہ سے اس کی اور اس کی بیٹی کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ماجدہ کو اس کے انداز کی بے ساختگی بہت پسند آئی۔وہ ایسے ملنسار لوگوں میں سے تھا جو بہت جلد بے تکلف ہو جاتے ہیں۔

''اچھا.....اب میں ذرا بازار تک ہو کر آتا ہوں۔'' عزیز نے کہا۔''تم لوگوں کے لیے کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔''

''بازار سے کھانا لانے کی کیا ضرورت ہے عزیز بھائی؟'' ماجدہ نے کہا۔''مجھے بتایئے، کچن کدھر ہے، میں خود پکا لوں گی۔''

''ضرور پکایئے گا بھابی، مگر آج نہیں۔'' عزیز نے ہنس کر کہا۔''اب آپ یہاں رہیں گی تو پھر سب کچھ اپنے ہی ہاتھ سے پکایئے گا لیکن دو ایک دن تو آپ میری مہمان بن کر رہیں گی۔'' یہ کہہ کر عزیز باہر چلا گیا۔

''دیکھا تم نے؟'' فیاض نے ماجدہ سے کہا۔''کتنا اچھا ہے میرا دوست.....''

''واقعی.....'' ماجدہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔''مگر.....وہ.....مولوی کو ابھی بلوا لینے تو اچھا تھا۔''

''اس کا بندوبست ہو گیا ہے۔'' فیاض نے کہا۔''میں کھانا کھانے کے بعد جاؤں گا اور

نکاح خواں کو لے آؤں گا۔گواہوں وغیرہ کا بھی انتظام ہے، آج ہی نکاح بھی ہو جائے گا۔''

ماجدہ کو ساری کائنات خوشی سے رقص کرتی ہوئی لگ رہی تھی۔فیاض اسے ایک ایسی زندگی کی نوید دے رہا تھا جس کا ماجدہ خواب دیکھتے ہوئے بھی ڈرتی تھی۔

کچھ دیر کے بعد عزیز کھانے کے پیکٹوں سے لدا پھندا واپس آ گیا۔وہ بازار سے کھانے پینے کی بہت سی چیزیں خرید کر لے آیا تھا۔ماجدہ نے باورچی خانے سے برتن نکالنے اور ان میں کھانا لگانے میں عزیز کی مدد کی۔گھر میں ایک ڈائننگ ٹیبل موجود تھی، سارا کھانا اس پر سجا دیا گیا اور پھر سب نے میز کے گرد بیٹھ کر کھانا کھایا۔

''اچھا.....اب تم آرام کرو۔'' کھانا ختم ہونے کے کچھ دیر کے بعد فیاض نے کہا۔''میں اب جا رہا ہوں، شام تک واپس آؤں گا اور اپنے ساتھ نکاح خواں کو بھی لے کر آؤں گا۔مغرب کے بعد ہمارا نکاح ہو جائے گا۔''

فیاض کے الفاظ شہد کے میٹھے قطروں کی طرح ماجدہ کے کانوں میں اتر رہے تھے۔

''جلدی آنے کی کوشش کرنا۔'' ماجدہ نے اپنی گہری سیاہ آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔''بہت دیر مت لگانا۔''

فیاض چلا گیا۔عزیز گھر میں ہی رہا۔''اب آپ آرام کر لیجیے بھابی۔''

عزیز نے ماجدہ سے کہا۔''فیاض تو شام تک آئے گا، آپ آرام کیجیے۔''

''میں سوچ رہی ہوں کہ ذرا کچن کو ٹھیک ٹھاک کر دوں۔'' ماجدہ نے کہا۔''کل سے میں اس میں پکانے کا کام شروع کر دوں گی۔''

''آپ کی مرضی۔'' عزیز نے کہا۔''جس چیز کی ضرورت ہو، مجھے بتا دیجیے گا، میں لا دوں گا۔''

عزیز اندر کمرے میں جا کر لیٹ گیا اور ماجدہ کچن کی صفائی میں لگ گئی۔کچن بہت خراب حالت میں تھا۔ایسا لگتا تھا جیسے اسے کافی عرصے سے کسی نے استعمال نہیں کیا تھا۔

ماجدہ کچن کی صفائی کے دوران کئی باتوں کے بارے میں سوچتی رہی۔

آج اس کا نکاح ہونے والا تھا لیکن اس کے پاس شادی کا جوڑا موجود تھا، نہ کوئی زیور وغیرہ۔کیا وہ دلہن بن سکے گی؟ کون اسے دلہن بنائے گا؟ دلہن بنانے کا کوئی سامان بھی تو موجود نہیں تھا اور فیاض نے تو ان چیزوں کے بارے میں کوئی ذکر ہی نہیں کیا تھا۔ہو سکتا ہے کہ وہ گھر واپس آتے وقت کچھ چیزیں ساتھ لے آئے۔اس نے دل میں سوچا۔''اور کچھ نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو کچھ ہار پھول تو لا ہی سکتا ہے۔''

ماجدہ تقریباً دو گھنٹے تک کچن کی صفائی میں لگی رہی۔ اس کے بعد وہ نہائی اور کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ عزیز ایک دوسرے کمرے میں تھا۔

سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ عزیز اور ماجدہ اپنے اپنے کمروں سے باہر نکل آئے تھے اور برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ماجدہ کے پاس میک اپ کا تھوڑا بہت سامان تھا اور اس نے معمولی سا میک اپ کر لیا تھا۔ عزیز نے اسے غور سے دیکھا اور مسکرا کر بولا۔ ''خدا کی قسم، آپ بہت حسین لگ رہی ہیں بھابی..... اور خاص طور سے آپ کی آنکھیں اور یہ لمبے لمبے بال..... بہت خوبصورت.....''

ماجدہ نے شرما کر نظریں جھکا لیں۔ ''فیاض نہ جانے کب تک آئیں گے۔'' اس نے موضوع بدلتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ عزیز نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ماجدہ کے کان دستک کی آواز پر اور آنکھیں دروازے کی جانب لگی ہوئی تھیں۔

''میں ذرا بازار تک جا رہا ہوں۔'' کچھ دیر کے بعد عزیز نے کہا۔ ''آپ کے لیے چائے لے کر آتا ہوں۔''

''چائے میں بنا لوں گی۔'' ماجدہ نے کہا۔ ''آپ کو صرف دودھ لانا ہوگا اور سب سامان کچن میں موجود ہے۔''

عزیز باہر چلا گیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ واپس آیا تو دودھ کے علاوہ کچھ مٹھائی بھی ساتھ لایا تھا۔

''ہم لوگ چائے پئیں گے۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''اور اس خوشی کے موقع پر تھوڑی سی مٹھائی بھی کھائیں گے۔''

''تب تک فیاض بھی آ ہی جائیں گے۔'' ماجدہ نے آہستہ سے کہا۔

ماجدہ نے کچن میں جا کر جلدی جلدی چائے بنا لی۔ عزیز نے ایک پلیٹ میں مٹھائی سجائی اور ہرے رنگ کی برفی کا ایک ٹکڑا خاص طور سے ماجدہ کو کھانے کے لیے دیا۔ ماجدہ نے وہ ٹکڑا کھا لیا اور اس کے بعد ایک اور بھی..... اور چائے بھی پی لی۔ عزیز نے خود برفی کے سفید ٹکڑے کھائے۔

کچھ ہی دیر کے بعد ماجدہ کو اپنا سر گھومتا ہوا لگا اور ساتھ ہی اس کی آنکھوں کے آگے طرح طرح کے عجیب و غریب مناظر گشت کرنے لگے۔ بے خودی اور سرشاری کی ایک انوکھی کیفیت تھی جو اس پر طاری ہوتی جا رہی تھی۔ اسی وقت عزیز نے آگے بڑھ کر اسے اپنی گرفت

میں لے لیا۔ ماجدہ اپنے آپ کو اس سے چھڑانا چاہتی تھی مگر وہ ایسا نہیں کر سکی۔

بہت دیر کے بعد جب ماجدہ کو ہوش آیا تو اس نے نیم تاریک کمرے میں اپنے آپ کو عزیز کے ساتھ پایا۔ وہ جلدی سے ہڑبڑا کر اٹھی اور اس نے بستر سے نیچے اترنا چاہا لیکن عزیز نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روک لیا۔

''ہمارے درمیان اب کوئی پردہ نہیں ہے ماجدہ جان۔'' عزیز نے سرگوشی کی۔ ''اب وقت آ گیا ہے کہ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں۔'' وہ اب ''بھابی'' سے صرف ''ماجدہ'' بن چکی تھی۔

''کیا؟ کیا بتاؤ گے؟'' شدید غم و غصے کے عالم میں ماجدہ کی آواز کانپ رہی تھی۔ ''تم بے غیرت انسان..... تم نے اپنے دوست کی امانت پر ڈاکا ڈالا ہے۔ تم نے اپنے دوست کو دھوکا دیا ہے..... لعنت ہو تم پر.....'' ماجدہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''ایسا کچھ نہیں ہے ماجدہ۔'' عزیز نے بڑے پُرسکون انداز میں کہا۔ ''میں نے تمہیں دھوکا نہیں دیا ہے۔ اگر کسی نے تمہیں دھوکا دیا ہے تو وہ فیاض ہے۔ وہ تمہیں میرے ہاتھ بیچ کر اور رقم لے کر چلا گیا ہے اور اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔''

''نہیں۔'' ماجدہ بدحواس ہو کر بڑے زور سے چیخی۔ اس کی آواز کسی دم توڑتے ہوئے انسان کی کراہ کی طرح تھی۔ ''تم جھوٹ بولتے ہو..... فیاض ایسا نہیں کر سکتا..... وہ مجھ سے شادی.....''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔'' عزیز نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''وہ تم سے صرف جھوٹ بولتا رہا۔ اسے رقم کی ضرورت تھی تاکہ اپنے گھر واپس جا کر اپنی منگیتر روبینہ سے شادی کر سکے جو ایک طویل عرصے سے اس کے انتظار میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اس نے تم کو بیچ کر رقم حاصل کی۔ وہ تمہیں بھگا کر اس لیے لایا تھا تاکہ تم کو فروخت کر سکے۔ شکر کرو کہ تم کو میں نے خرید لیا۔ اگر میں تم کو نہ خریدتا تو وہ تم کو کسی اور کے ہاتھ فروخت کر دیتا۔ تمہیں بکنا تو بہرحال تھا۔''

ماجدہ بلک بلک کر روتی رہی۔ قسمت نے ایک بار پھر اس کے ساتھ بڑا سنگین مذاق کیا تھا۔ یہ ذلت آمیز احساس اس کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے اڑائے دے رہا تھا کہ وہ محض استعمال کی جانے والی ایک بے مایہ شے ہے، جو کسی بھی عزت، احترام یا محبت کی مستحق نہیں ہے۔ اپنی مزید بے توقیری اور بے بضاعتی کا صدمہ اسے مارے ڈال رہا تھا۔

آنے والے دنوں میں عزیز نے اسی طرح اسے اپنے ساتھ رکھا۔ وہ دن میں اسے گھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں بند کر کے دروازے میں باہر سے تالا لگا کر چلا جاتا تھا اور رات کو جب واپس آتا تھا تو دروازے میں اندر سے تالا لگا کر چابی اپنے پاس سنبھال کر رکھ لیتا تھا۔ ماجدہ کے لیے فرار کا راستہ مسدود تھا لیکن ماجدہ کا فی الحقیقت فرار ہونے کا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔ وہ فرار ہو کر کہاں جاتی؟ اس کے پاس کوئی دوسرا ٹھکانہ نہیں تھا۔ لیکن چند روز کے بعد ہی اس کو بھاگنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔

اس رات عزیز کسی آدمی کو ساتھ لے کر گھر آیا اور ماجدہ کو الگ بلا کر کہنے لگا۔ ''یہ ایک بہت بڑا سیٹھ ہے، بس اس کا جی خوش کر دو، بہت پیسے ملیں گے، ہم دونوں عیش کریں گے۔ ایسے سیٹھوں کی کمی نہیں ہے جو ہزاروں روپے بڑی آسانی سے دے دیتے ہیں۔''

ماجدہ کا دماغ سن ہو گیا۔ اس کا دامن اس کی اپنی کسی خطا کے بغیر داغ دار ہو چکا تھا اور وہ تقدیر کے ہاتھوں میں کھلونا بن چکی تھی لیکن وہ خود کو ایک بازاری عورت کی سطح تک گرا دینے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی۔ عزیز کی شکل میں اس کے سامنے عورتوں کی کمائی کھانے والا ایک دلال کھڑا ہوا تھا۔ نفرت کی ایک شدید لہر ماجدہ کے رگ و پے میں دوڑ گئی، اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' اس نے بھاری آواز میں کہا۔ ''اس آدمی کو یہاں سے چلتا کرو ورنہ میں اپنی اور تمہاری جان ایک کر دوں گی۔''

''پاگل مت بنو بے وقوف عورت۔'' عزیز نے ماجدہ کو بازو سے پکڑ کر کمرے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔ ''گھر آئی ہوئی دولت کو ٹھکرا رہی ہو، ارے ایسے موقعے تو قسمت والوں کو ملتے ہیں۔ بس ایک بار سلسلہ شروع ہو جانے دو۔ پھر میں اور تم دونوں عیش کریں گے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے ماجدہ کو اس کمرے میں دھکیل دیا اور کمرے میں موجود سیٹھ نے جلدی سے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

لیکن ماجدہ اپنے اس حشر کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی۔ سیٹھ کی پیش قدمی پر وہ کسی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اس پر پل پڑی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کا منہ نوچ ڈالا اور اس کی کلائی میں اپنے دانت گاڑ دیئے۔ وہ آدمی اس صورتِ حال کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ وہ بد حواس ہو کر چیختا ہوا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا اور عزیز پر برس پڑا جو شور سن کر سامنے آ گیا تھا۔

''کنجر کی اولاد..... یہ تُو مجھے کہاں لے آیا؟ تجھے میں اچھی طرح سے سبق سکھاؤں گا۔''

اور اس کے ساتھ ہی وہ بھاگتا ہوا گھر کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ عزیز نے اسے روکنے کی

کوشش نہیں کی، بلکہ جلدی سے آگے بڑھ کر دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔

''کتیا..... کمینی.....'' وہ دانت پیس کر ماجدہ پر پل پڑا اور اس کے بال پکڑ کر اسے بُری طرح مارنے لگا۔ ماجدہ کے لیے یہ بالکل نیا تجربہ تھا۔ اب تک کسی مرد نے اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ اسے صرف شاہ بی بی نے ایک بار مارا تھا اور اب عزیز اسے بُری طرح مار رہا تھا۔ وہ رو رہی تھی، چیخ رہی تھی اور مزاحمت کر رہی تھی اور عزیز اسے گالیاں دے رہا تھا اور مار رہا تھا۔ شور کی آواز سن کر سوئی ہوئی ننھی ثمینہ بھی جاگ گئی تھی اور وہ بھی زور زور سے رونے لگی تھی۔

''چپ۔'' عزیز نے بڑے زور سے ثمینہ کو ڈانٹا اور بچی سہم کر خاموش ہو گئی۔

''تجھے تو سیدھا جا کر کوٹھے پر بٹھا دینا چاہیے تھا۔'' عزیز نے دانت پیس کر کہا۔ ''میں نے غلطی کی جو تجھے گھر پر لا کر رکھا۔''

عزیز نے مار مار کر ماجدہ کو زخمی کر دیا۔ وہ خود بھی اسے مارتے مارتے تھک گیا اور پلنگ پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ ماجدہ روتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی اور پلنگ پر ڈھیر ہو گئی۔

وہ سسکیاں لے لے کر روتی رہی اور پھر اسی عالم میں نہ جانے کب اسے نیند آ گئی۔ ثمینہ اس کے پہلو میں لیٹی ہوئی سو رہی تھی۔ وہ نہ جانے کب تک سوتی رہی اور پھر یکبارگی اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور کمرے میں لگی ہوئی کھڑکی پر نظر ڈالی۔ صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ جسم میں جگہ جگہ ٹیسیں سی اٹھ رہی تھیں۔ ظالم نے بڑی بے دردی کے ساتھ مارا تھا۔

اس نے کمرے سے باہر نکل کر برابر والے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ عزیز بے سدھ پڑا سو رہا تھا اور دروازے کے تالے کی چابی اس کے تکیے کے نیچے سے جھانکتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ مار پیٹ کے دوران وہ اسے جیب میں رکھنا بھول گیا تھا۔

ماجدہ بلی کی طرح دبے پاؤں آگے بڑھی۔ کمرے میں عزیز کے خراٹوں کی مکروہ آواز گونج رہی تھی۔ ماجدہ نے بڑی خاموشی سے ہاتھ بڑھا کر تکیے کے نیچے سے چابی اٹھا لی اور تیزی سے کوئی آواز پیدا کیے بغیر دروازے سے باہر نکل آئی۔

دوسرے کمرے میں جا کر اس نے جلدی سے ثمینہ کو اٹھا کر گود میں لیا، اپنا پرس لیا، چند جوڑے کپڑوں کو لپیٹ کر ایک تھیلے میں ٹھونسا اور دروازے کا تالا کھول کر باہر نکل آئی۔ اس نے ایک کام یہ کیا کہ باہر نکل کر گھر کے دروازے کی باہر سے کنڈی لگا دی۔ اس کے بعد وہ تیزی سے وہاں سے چل پڑی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رات دم توڑ رہی تھی۔ سڑک پر گہرا سناٹا تھا۔ ابھی کاروبار زندگی کے شروع ہونے میں دیر تھی۔ ماجدہ گھر سے نکلنے سے پہلے ہی طے کر چکی تھی کہ اسے کہاں جانا چاہیے۔ اس شہر میں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں اسے پناہ مل سکے۔ وہ یہاں کسی کو بھی نہیں جانتی تھی۔

وہ ایک طرف جا رہی تھی، لیکن راستے کو اچھی طرح ذہن میں رکھتی جا رہی تھی تاکہ اس مکان کی نشاندہی کر سکے۔

کچھ دور جانے کے بعد اسے سائیکل پر جاتا ہوا ایک خاکروب ملا۔ اس کی سائیکل کے ساتھ جھاڑو اور ٹوکری لٹکی ہوئی تھی۔ ماجدہ نے اسے روکا اور اس سے پوچھا کہ اس علاقے کا تھانہ کدھر ہے۔ خاکروب نے اسے تھانے کا پتہ بتا دیا۔ تھانہ زیادہ دور نہیں تھا۔ ماجدہ ثمینہ کو ساتھ لیے ہوئے سیدھی تھانے پہنچ گئی۔

اس نے ڈیوٹی پر موجود پولیس آفیسر کو مختصر الفاظ میں اپنی روداد سنائی کہ وہ ایک زمیندار کے گھر میں باندی تھی، جہاں سے ایک ملازم اسے شادی کا جھانسہ دے کر لاہور لے آیا اور یہاں لا کر اس نے اسے عزیز نامی ایک شخص کے ہاتھ بیچ دیا جو اب اس کو جسم فروشی پر مجبور کر رہا ہے اور اس کے انکار پر اس نے اس کو شدید تشدد کا نشانہ بنایا ہے۔

''میں بڑی مشکل سے اس کے گھر سے اپنی جان بچا کر بھاگی ہوں۔'' ماجدہ نے روتے ہوئے کہا۔ ''مجھے امان چاہیے..... مجھے پناہ چاہیے۔''

''ملے گی بی بی، ملے گی۔'' افسر نے بڑی نرمی سے کہا۔ ''تم کو امان ضرور ملے گی۔ تم اس شخص کے مکان کا پتہ بتا سکتی ہو؟''

ماجدہ راستہ یاد کرتی آئی تھی۔ اسے محلے کا نام اور مکان نمبر تو نہیں معلوم تھا لیکن اس نے پولیس افسر کو پتہ اچھی طرح سمجھا دیا۔ پولیس افسر اس کی بات سمجھ گیا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اب تم اندر کمرے میں جا کر آرام سے بیٹھ جاؤ۔ یہاں کوئی تمہیں پریشان نہیں کرے گا۔ بڑے صاحب آ جائیں تو اس کے بعد ہم کارروائی کریں گے۔''

ماجدہ کو ایک اندرونی کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ ثمینہ اس کے ساتھ تھی۔ ماجدہ خود کو کافی پُرسکون محسوس کر رہی تھی۔

بہت وقت گزر گیا..... کئی گھنٹے..... اس دوران کئی پولیس والے اس کمرے میں آتے جاتے رہے، لیکن کسی نے ماجدہ سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ بس اسے کن اکھیوں سے دیکھ کر چلے گئے۔

دن کے دس بج رہے تھے جب ایک پولیس والا ماجدہ کو بلانے کے لیے آیا۔ ماجدہ کو بڑے صاحب کے کمرے میں لے جایا گیا۔ اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ وہاں عزیز بھی موجود تھا، لیکن اس کا یہ اطمینان اگلے ہی لمحے زبردست خوف اور حیرت میں بدل گیا، جب بڑے صاحب نے اس سے نہایت تلخ و ترش لہجے میں گفتگو کا آغاز کیا۔

''کیوں؟ تُو ایک شادی شدہ عورت ہو کر اپنے میاں کو دھوکا دیتی ہے؟ بدچلنی کرتی ہے؟''

''نن..... نہیں..... تو.....'' ماجدہ کا دماغ گھوم گیا۔ ''میں نے ایسا کچھ نہیں کیا.....''

''یہ تیرا شوہر ہے۔'' پولیس افسر نے آنکھیں نکال کر عزیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تُو اس کو دھوکا دے کر کسی اور کے ساتھ بھاگنا چاہتی ہے۔ تجھ پر ہم نے حدود کے تحت مقدمہ قائم کر دیا ہے، اب تجھ کو جیل جانا ہوگا۔''

ماجدہ کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ یہ کیسا اندھیرا تھا..... یہ سب کیا ہو رہا تھا، وہ ایک عذاب سے نکلنے بھی نہیں پائی تھی کہ ایک دوسرے، کہیں زیادہ خوفناک عذاب میں پھنس گئی۔

''تم میری بیوی ہو۔'' عزیز نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''میرے پاس اس کا قانونی ثبوت موجود ہے۔ ہمارا نکاح نامہ..... یہ دیکھو..... میں نے اس کی کاپی یہاں تھانے میں جمع کرا دی ہے۔'' اس نے ایک کاغذ جیب سے نکال کر ماجدہ کی طرف بڑھا دیا۔

ماجدہ کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''نہیں..... یہ سب جھوٹ ہے، تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' اس نے چیخ کر کہا۔ ''میں تمہاری بیوی نہیں ہوں، تم دلال ہو۔ تم مجھے کوٹھے پر بٹھانا چاہتے ہو، میری کمائی کھانا چاہتے ہو، مگر میں تمہیں ایسا ہرگز نہیں کرنے دوں گی۔'' غیظ و غضب کے عالم میں ماجدہ کا پورا جسم بُری طرح کانپ رہا تھا۔

''اس کو اس کی بچی کے ساتھ زنانہ حوالات میں بند کر دو۔'' بڑے صاحب نے ایک پولیس والے کو حکم دیا۔ ''اس پر حدود آرڈیننس کے تحت مقدمہ چلے گا۔ بڑی لمبی سزا ہوگی اس کو.....''

ماجدہ چیختی چیختی رہی، لیکن کسی نے اس کی ایک نہ سنی۔ اسے ثمینہ کے ساتھ حوالات میں بند کر دیا گیا۔

چند روز کے بعد ماجدہ کو ثمینہ کے ساتھ جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ وہ صدمے سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ اس بھری دنیا میں کوئی اس کی مدد کرنے والا نہیں تھا۔ اس نے اپنے آپ کو اس قدر بے یار و مددگار اور محرومی کا شکار اس سے پہلے کبھی نہیں پایا تھا۔ اب تو ایسا لگتا تھا جیسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے لیے ساری دنیا ختم ہو چکی ہے۔ اس کے جیل جانے سے پہلے عزیز نے تھانے آ کر اس سے ملاقات کی اور کہا۔ ''میں جیل میں تم سے ملنے آؤں گا۔ اگر تم میری بات مان لو گی تو تمہارے لیے عیش ہی عیش ہے ورنہ ساری عمر جیل میں پڑی سڑتی رہو گی۔''

جیل میں اس کی ملاقات بہت سی عورتوں سے ہوئی جن کے مقدمات زیرِ سماعت تھے۔ انہی میں ایک عورت صابرہ تھی۔

صابرہ نے ماجدہ سے اس کی کہانی سنی اور پھر زار و قطار روتے ہوئے اپنی داستانِ غم بیان کی۔

صابرہ گاؤں کے ایک غریب کسان کی بیٹی تھی۔ زمیندار کے بیٹے نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر اس کی اجتماعی عصمت دری کی۔ صابرہ کے غریب باپ نے اپنی برادری کے کچھ لوگوں کی مدد سے پولیس میں رپورٹ درج کروانی چاہی لیکن رپورٹ درج نہیں کی گئی۔ زمیندار نے پولیس والوں کا منہ بند کر دیا تھا۔ تمام ثبوت اور شہادتیں ضائع کر دی گئی تھیں۔ اسی عالم میں تین ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ اجتماعی عصمت دری کے نتیجے میں صابرہ کا پاؤں بھاری ہو گیا اور وقت گزرنے کے ساتھ گاؤں والوں کو یہ بات معلوم ہو گئی اور تب پولیس نے صابرہ کو حدود آرڈیننس کے تحت زنا کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ صابرہ یہ کسی طرح بھی ثابت نہیں کر سکی تھی کہ اس کے ساتھ زبردستی کی گئی ہے، کیونکہ اس کے پاس اس واقعے کا کوئی ثبوت نہیں تھا لیکن قسمت یہ ضرورت ثابت کر رہی تھی کہ وہ شادی کے بغیر ماں بننے والی ہے۔ چنانچہ اب اس پر زنا کا الزام عائد کر کے اسے جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔

صابرہ کی داستان سن کر ماجدہ کا دل دہل گیا اور وہ بہت زیادہ خوفزدہ ہو گئی۔ اسے ان قوانین کے بارے میں زیادہ علم نہیں تھا۔ اب صابرہ کی زبان سے اس نے جو کچھ سنا، اس سے وہ بُری طرح سہم گئی، کیونکہ وہ خود بھی فیاض کے بچے کی ماں بننے والی تھی اور جلد ہی یہ راز فاش ہو جاتا کہ وہ شادی کے بغیر ماں بننے والی ہے..... پھر کیا ہو گا؟ پھر کیا ہو گا؟ اس پر نہ جانے کیسے کیسے الزامات لگائے جائیں گے۔

غیر معینہ مدت کی جیل اور نامعلوم سزا سے بچنے کا اس کے پاس ایک ہی طریقہ تھا اور اس نے خوب سوچ سمجھ کر ایک فیصلہ کر لیا۔ وہ عزیز کے حربے کو اسی پر آزمانا چاہتی تھی۔ اب اسے انتظار تھا کہ عزیز حسبِ وعدہ اس سے ملنے کے لیے آئے۔

عزیز تقریباً ایک ہفتے کے بعد آیا۔ ماجدہ کو دیکھ کر اس نے بڑے پُرسکون لہجے میں

پوچھا۔ ''پھر کیا فیصلہ کیا ماجدہ؟ میری بات مانو گی یا جیل میں زندگی گزارو گی۔''

''میں جیل میں رہنے کے بجائے تمہاری بات مانوں گی۔'' ماجدہ نے آہستہ سے کہا۔

''یہ ہوئی نا عقلمندی کی بات۔'' عزیز کے چہرے پر ایک دم خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ''ٹھیک ہے، معاملے کو ختم کرنے میں چند روز لگیں گے، اب تم اطمینان سے بیٹھی رہو۔ میں خود آ کر تمہیں اور ثمینہ کو لے جاؤں گا۔''

ماجدہ نے جیل میں ساتھی عورتوں میں سے کسی سے بھی اس بات کا ذکر نہیں کیا۔ اس فیصلے کی تہہ میں جو اصل مجبوری کارفرما تھی اس کے بارے میں سب کو بتا کر وہ اپنے لیے مزید عذاب مول نہیں لینا چاہتی تھی۔ اس نے عزیز کی بیوی ہونے سے صاف انکار کیا تھا، تو پھر پاؤں بھاری ہونے کے انکشاف کے نتیجے میں خدا جانے اور کتنے مقدمات کھڑے ہو جاتے۔

وہ ایک ایک دن گن رہی تھی۔ ٹھیک پانچویں دن اس کو جیل کے آفس میں طلب کیا گیا۔ وہ ثمینہ کے ساتھ وہاں پہنچی تو اس کو بتایا گیا کہ اس کی ضمانت ہو گئی ہے اور وہ جا سکتی ہے۔

عزیز جیل کے دروازے کے باہر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ ماجدہ کے دل میں اس کے خلاف جو شدید نفرت تھی اس میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا، لیکن اسے اس نفرت کو اپنے دل میں بسائے ہوئے عزیز کے ساتھ ہی رہنا تھا، تقدیر نے اس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں چھوڑا تھا۔

عزیز اسے اور ثمینہ کو اسی گھر میں لے آیا جہاں سے وہ بھاگی تھی۔ نو سال کی عمر سے اب تک ماجدہ قانون کے نام پر جو طرح طرح کے تماشے دیکھتی رہی تھی، یہ ان میں سے ایک بہت بڑا تماشا تھا۔

''ایک ہفتہ آرام کرو۔'' عزیز نے نرمی کے ساتھ اس سے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ تم نے جیل میں بہت تکلیف اٹھائی ہو گی۔ اب ذرا خوب اچھی طرح سے کھاؤ پیو اور جان بناؤ اور اس بات کو یاد رکھنا کہ تم میری بیوی ہو۔ تمہارا میرے ساتھ نکاح ہوا ہے۔''

''تو تم سچ مچ مجھ سے نکاح کیوں نہیں کر لیتے؟'' ماجدہ نے کہا۔ ''تم مجھے باقاعدہ اپنی بیوی بنا لو۔ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''نکاح نامہ تو پہلے ہی بن چکا ہے۔'' عزیز نے ایک گندی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''وہ میرے پاس موجود ہے۔ بس، ہم میاں بیوی ہیں۔ اس میں کسی کو شک نہیں ہونا چاہیے، اب کسی دوسرے نکاح نامے کی ضرورت نہیں ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماجدہ نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ ایک ہفتہ گزرنے سے ایک دن پہلے ماجدہ نے عزیز سے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ میں ماں بننے والی ہوں۔''

''کیا؟'' عزیز نے چونک کر کہا۔ ''ماں بننے والی ہو؟ کس کے بچے کی؟''

''تمہارے بچے کی اور کس کے بچے کی؟'' ماجدہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''میرے بچے کی یا..... یا..... فیاض کے بچے کی؟'' عزیز نے رک رک کر پوچھا۔

''نہیں..... تمہارے بچے کی۔'' ماجدہ نے قطعیت کے ساتھ کہا۔ ''میں اس بات کو جانتی ہوں۔''

''چلو، کیا فرق پڑتا ہے؟'' عزیز نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''بچہ میرا ہو یا فیاض کا، کام تو ہمارے ہی آئے گا۔''

ماجدہ کو اس وقت عزیز دنیا کا سب سے زیادہ نجس اور گھناؤنا انسان لگا۔ اس رات عزیز نے جب ایک شخص کو ماجدہ کے کمرے میں بھیجا تو ماجدہ نے جان بوجھ کر الٹیاں کرنا شروع کر دیں۔ وہ سخت بدمزہ ہو کر چلا گیا۔

''اب تمہیں صبر سے کام لینا چاہیے۔'' ماجدہ نے اس کو سمجھایا۔ ''اب جو کچھ بھی ہوگا، بچے کی پیدائش کے بعد ہی ہوگا۔''

''افوہ..... بڑا لمبا انتظار کرنا ہوگا۔'' عزیز نے کہا۔ ''کیوں نہ تم اس بچے سے نجات حاصل کر لو؟ میں سارا بندوبست کرا دوں گا۔''

''خبردار۔'' ماجدہ نے اسے سختی کے ساتھ ڈانٹا۔ ''کبھی بھول کر بھی ایسی بات زبان پر نہ لانا۔ آج کا بچہ کل کے بڑھاپے کا سہارا ہوتا ہے۔ مجھے اور تمہیں دونوں ہی کو بڑھاپے میں سہارے کی ضرورت ہوگی۔ خدا میری ثمینہ کو سلامت رکھے، ہمیں ایک اور سہارا بھی مل جائے تو کتنا اچھا ہوگا۔ عقلمند لوگ تو وہی ہوتے ہیں جو آنے والے وقت کے بارے میں بہت پہلے سے سوچ لیتے ہیں۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' عزیز نے پُرخیال انداز میں کہا۔

لیکن ماجدہ جو کچھ سوچ رہی تھی، وہ عزیز کو کبھی نہیں معلوم ہو سکتا تھا۔ ماجدہ صرف اس وقت کا انتظار کر رہی تھی جب وہ اپنے بچے کو جنم دے دے اور کوئی اس کے بچے کو ناجائز اولاد نہ کہہ سکے۔ اس کے بعد اسے کسی نہ کسی طرح عزیز سے نجات حاصل کر لینی تھی، خواہ اس کے لیے اسے عزیز کو اپنے ہاتھوں سے کیوں نہ ختم کرنا پڑے۔ اس کی نس نس سے عزیز کے لیے

نفرت کا زہر ابلتا تھا، عزیز کے لیے اور فیاض کے لیے بھی..... عزیز اس کی نظروں کے سامنے موجود تھا اور فیاض کے بارے میں اب اسے کچھ نہیں معلوم تھا۔

ماجدہ اب ''چھٹی'' پر تھی اور عزیز کی بیوی کے طور پر اس کے ساتھ رہ رہی تھی۔ عزیز اسے کافی رقم لا کر دیتا تھا تاکہ وہ گھر چلا سکے۔ جس کا پورا کام اب ایک سگھڑ بیوی کی حیثیت سے ماجدہ نے سنبھال لیا تھا۔ عزیز کو اب اسے قید کر کے رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو اب اپنی ''مرضی'' سے رہ رہی تھی۔

''شاید تمہارے پاس پہلے سے کافی پیسہ جمع ہے۔'' ایک دن ماجدہ نے اس سے کہا۔

''پہلے سے بھی ہے اور آتا بھی رہتا ہے۔'' عزیز نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''میں کام جو کرتا ہوں۔''

''کیا کام کرتے ہو تم؟'' ماجدہ نے پوچھا۔ ''زیادہ تر وقت تو تم گھر میں ہی موجود رہتے ہو، شام کو نکل کر جاتے ہو۔''

''بات یہ ہے میری جان کہ تم تو ابھی چھٹی پر ہو۔'' عزیز نے ہنس کر کہا۔ ''مگر دھندا کرنے والی اور بھی لڑکیاں ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کمائی میں میرا بھی حصہ ہوتا ہے۔ دنیا اسی طرح چلتی ہے ماجدہ..... اصل چیز ہے پیسہ..... پیسہ آنا چاہیے..... چاہے کسی طرح بھی آئے، یہ کبھی مت سوچو کہ پیسہ کس طرح آ رہا ہے..... بس یہ دیکھو کہ پیسہ آ رہا ہے..... اور آتے رہنا چاہیے۔''

ماجدہ کی مسکراہٹ کے پیچھے جو خوفناک زہر چھپا ہوا تھا، عزیز اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ عزیز خوش تھا کہ وہ ماجدہ کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہا ہے لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ فی الحقیقت ماجدہ اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہی ہے۔

ماجدہ نے رفتہ رفتہ عزیز سے اس کے بارے میں ساری معلومات حاصل کر لی تھیں۔ جس مکان میں عزیز رہ رہا تھا، وہ کرائے کا تھا۔ اس سے پہلے یہاں عزیز کے ساتھ ایک اور عورت رہتی تھی جو دھندا کرتی تھی اور عزیز اسے اپنی بہن بتاتا تھا۔ چند ماہ پہلے وہ عورت اپنے کسی عاشق کے ساتھ گھر سے سارا روپیہ پیسہ بٹور کر بھاگ گئی اور عزیز تنہا رہ گیا۔ وہ اس گھر میں کسی دوسری عورت کو لا کر رکھنا چاہتا تھا تاکہ اس کا گھر بھی آباد رہے اور دھندا بھی چلتا رہے۔

ماجدہ بڑی ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے عزیز کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئی تھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ اس کے ہونے والے بچے کا باپ وہی ہے اور وقت آنے پر جب ماجدہ نے ایک بیٹے کو جنم دیا تو عزیز بہت خوش ہوا۔

''میں چاہتا تھا کہ بیٹی ہی ہوتی تاکہ ہم لوگ بڑھاپے میں زیادہ کمائی کر سکتے، چلو کوئی بات نہیں لڑکا ہی سہی، اس کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور لڑکی تو ایک پہلے سے موجود ہے۔ ہماری ثمینہ بڑی ہو کر بہت خوبصورت نکلے گی۔'' عزیز نے کہا۔

ماجدہ کی آنکھوں سے نکلنے والے آتشیں شرارے عزیز کو نظر نہیں آسکتے تھے۔

نومولود بیٹے کا نام وسیم رکھا گیا۔ عزیز کا کہنا تھا کہ یہ نام اس کے دادا کا تھا جو ایک بہت متمول آدمی تھا، لیکن اس کی ساری دولت اس کے تینوں بیٹوں نے عیاشیوں میں اُڑا دی تھی اور ان کی اولادوں کو زندہ رہنے کے لیے طرح طرح کے دوسرے دھندے اختیار کرنے پڑے تھے۔ ''اور ایسا ہی ایک دھندا میں نے بھی اختیار کر لیا۔'' عزیز نے ہنستے ہوئے کہا۔

وسیم کی عمر کوئی تین ماہ کی ہو گئی تھی اور عزیز اس کا اپنے بچے کی طرح خیال رکھتا تھا۔ ماجدہ نے اب تک کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو دھندے سے روک رکھا تھا لیکن وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ سلسلہ زیادہ عرصے تک نہیں رکے گا۔ جلد ہی اسے اپنے آپ کو اس گھناؤنے کام کے لیے تیار کرنا ہوگا جبکہ وہ ایسا کرنے کے لیے قطعی تیار نہیں تھی۔ لیکن قبل اس کے کہ اس کی نوبت آتی، قدرت نے نہایت غیر متوقع طور پر اس کی مدد کر دی۔

عزیز دن میں زیادہ تر گھر پر ہی رہتا تھا، البتہ سہ پہر کو وہ تیار ہو کر باہر نکل جاتا تھا اور رات کو بہت دیر سے گھر واپس آتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ ساری رات گھر نہیں آتا تھا بلکہ صبح کو آتا تھا۔ اس نے ماجدہ کو سمجھا دیا تھا کہ ایسی صورت میں وہ کسی تشویش میں مبتلا نہ ہو، کیونکہ اس کے دھندے میں ایسی چیزوں کی ضرورت تھی۔

اس روز بھی عزیز ساری رات واپس نہیں آیا۔ ماجدہ دونوں بچوں کے ساتھ اکیلی تھی۔ اسے عزیز کے نہ آنے کی کوئی فکر تھی نہ اس کا انتظار تھا۔ وسیم کی پیدائش کے بعد، جسے عزیز نے اپنی اولاد کے طور پر تسلیم کر لیا تھا، ماجدہ کو اب عزیز کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

دن کے کوئی نو بجے کے قریب ایک پولیس والے نے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا کر ماجدہ کو ایک خوفناک اطلاع دی۔

گزشتہ رات عزیز اور اس کے ساتھیوں کا کچھ لوگوں سے جھگڑا ہو گیا تھا، جس کے دوران دونوں فریقوں کی طرف سے فائرنگ ہوئی جس میں تین آدمی مارے گئے۔ مرنے

والوں میں عزیز بھی شامل تھا۔

''اس کی لاش ہسپتال کے مردہ خانے میں رکھی ہے۔'' پولیس والے نے بتایا۔ ''تم جا کر لاش کو شناخت کر لو۔ پوسٹ مارٹم کے بعد لاش تمہارے حوالے کر دی جائے گی۔''

ماجدہ کی سراسیمگی میں مسرت کا گہرا رنگ گھلا ہوا تھا۔ وہ ثمینہ کو پڑوس میں چھوڑ کر اور وسیم کو ساتھ لے کر ہسپتال پہنچی۔ اس نے عزیز کی لاش کو شناخت کیا۔ عزیز کا سارا جسم بالکل سلامت تھا۔ صرف ایک گولی اس کی گردن میں لگی تھی اور وہاں سوراخ ہو گیا تھا۔ اس گولی نے اس کی جان لے لی تھی۔

ماجدہ نے عزیز کی لاش کو دیکھا اور اس کے دل میں درد کی کوئی لہر نہیں پیدا ہوئی۔ ایسے کاموں میں تو یہ سب کچھ ہوتا ہی ہے۔

عزیز مر گیا۔ گھر میں جو بھی رقم موجود تھی اور جو اچھی خاصی تھی، وہ ماجدہ نے اپنی تحویل میں لے لی۔ گھر میں اچھا خاصا قیمتی ساز و سامان بھی تھا، جس میں ٹی وی، وی سی آر، فریج، بیڈز اور کچھ فرنیچر وغیرہ شامل تھا۔ اب یہ سب سامان ماجدہ کا تھا، کیونکہ وہ عزیز کی ''بیوہ'' تھی۔

جو رقم موجود تھی، اس سے ماجدہ کافی عرصے اپنی اور اپنے دونوں بچوں کی ضروریات بآسانی پوری کر سکتی تھی، لیکن صرف کچھ عرصے کے لیے۔ اس کے بعد آنے والا کل اس کے سامنے پھر ایک سوالیہ نشان بن کر کھڑا ہونے والا تھا۔

عزیز کی موت کے ایک ماہ کے بعد عرفان ماجدہ کے سر پر آن پہنچا۔

عرفان اس مکان کا مالک تھا جس میں عزیز رہ رہا تھا۔ ماجدہ، عرفان کو پہچانتی تھی۔ وہ کرایہ وصول کرنے کے لیے عزیز کے پاس آتا تھا۔ ماجدہ نے دو ایک بار اسے دیکھا تھا۔ عزیز کرایہ پابندی سے ادا کرتا تھا، یہ بات ماجدہ کو معلوم تھی۔

ماجدہ عدت میں تھی۔ اس نے پردے کے پیچھے سے عرفان سے بات کی۔

''عزیز نے پچھلے کئی ماہ کا کرایہ ادا نہیں کیا تھا۔'' عرفان نے کہا۔ ''مجھے وہ ساری رقم چاہیے اور خالی مکان بھی۔ اس کے علاوہ مرحوم نے مجھ سے بیس ہزار روپے کی رقم بھی ادھار لی تھی۔ اس کی باقاعدہ دستاویز میرے پاس موجود ہے۔ مجھے وہ رقم بھی واپس چاہیے۔ تم فوراً ہی سارا بندوبست کر دو اور میرا مکان خالی کر دو۔''

''مگر عزیز تو ہر ماہ پابندی سے کرایہ دیتے تھے۔'' ماجدہ نے کہا۔ ''اور جہاں تک قرض کی رقم کا تعلق ہے، تو ایسی کوئی بات میرے علم میں نہیں ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' عرفان نے خشک لہجے میں کہا۔''میرے پاس باقاعدہ دستاویز موجود ہے، میں تمہیں دکھا سکتا ہوں اور وقت آنے پر اسے عدالت میں بھی پیش کر دوں گا۔''

''میں عدت کی مدت پوری ہونے سے پہلے یہاں سے کہیں نہیں جا سکتی۔'' ماجدہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔''آپ کو جو کچھ بھی کرنا ہے، میری عدت کی مدت ختم ہونے کے بعد کیجیے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' عرفان نے کہا۔''میں تمہاری عدت ختم ہونے پر ہی آؤں گا، مجھے میری پوری رقم اور خالی مکان چاہیے۔''

عرفان چلا گیا اور ماجدہ کے لیے ایک نیا عذاب کھڑا ہو گیا۔ ماجدہ کو مکمل یقین تھا کہ عرفان جھوٹ بول رہا ہے اور عزیز نے اس سے کبھی کوئی رقم قرض نہیں لی تھی۔ لیکن وہ اپنے تجربے سے یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ اس ملک میں ہر طرح کی جعلی دستاویزات تیار کرنا کتنا آسان تھا اور عزیز تو زندہ بھی نہیں تھا جو اس دستاویز کو جعلی قرار دے سکے۔ عزیز کے مالی حالات اچھے تھے اور اس نے ماجدہ سے کبھی اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا کہ اس نے مالک مکان سے کوئی رقم قرض لے رکھی ہے۔

''یہ بات بہتوں کو معلوم ہو گی اور شاید عرفان کو بھی کہ عزیز کیا دھندا کرتا ہے۔'' ماجدہ نے دل میں سوچا۔''تو لوگوں نے اسے کسی عزت کا مستحق نہیں سمجھا اور اس کے قتل کے بعد اس کی لاش کی بوٹیاں نوچنے پر تل گئے۔''

ماجدہ نے فی الحال عرفان کو ٹال دیا تھا لیکن وہ یہ سمجھ چکی تھی۔ کہ اس کو کم از کم یہ مکان خالی کرنا ہی ہو گا۔ جہاں تک اس فرضی قرضے کا تعلق تھا تو وہ صاف طور پر یہ کہہ سکتی تھی کہ اس کے پاس کوئی رقم نہیں ہے اور عرفان زیادہ سے زیادہ یہ کر سکے گا کہ مکان کے ساز و سامان پر قبضہ کر لے۔

ماجدہ نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ مکان کے سارے قیمتی ساز و سامان کو آہستہ آہستہ بیچ دیا اور پیسے کھرے کر کے اپنے قبضے میں کر لیے۔ صرف بالکل معمولی سا، عام استعمال کا سامان رکھ لیا۔ ایک پرانا بوسیدہ سا فریج اور پرانا ٹی وی خرید لیا۔ مسہریوں کی جگہ معمولی پلنگ ڈلوا دیئے۔ جو کچھ وہ آسانی سے بیچ سکتی تھی اس نے بیچ دیا۔

اس کی عدت جیسے ہی ختم ہوئی ویسے ہی عرفان ایک بار پھر آن دھمکا۔ اب ماجدہ کو اس سے پردے کے پیچھے سے بات کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے اس کے سامنے آ کر

بات کی۔

''مرحوم میرے لیے کوئی بڑی رقم چھوڑ کر نہیں مرا ہے۔'' اس نے سرد اور خشک لہجے میں عرفان سے کہا۔''میرے علم کے مطابق وہ ہر ماہ کرایہ پابندی سے ادا کرتا تھا اور جہاں تک آپ کے قرضے کی رقم کا تعلق ہے تو میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ مرحوم نے مجھے اس کے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا تھا۔''

''یہ ہے دستاویز..... تم دیکھ سکتی ہو۔'' عرفان نے جلدی سے ایک کاغذ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

''مجھے کچھ دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ماجدہ نے قدرے ترش روئی کے ساتھ کہا۔ ''اگر یہ دستاویز درست ہے تو بھی میرے پاس ادائیگی کے لیے رقم نہیں ہے اور میں اس ادائیگی کی ذمہ دار بھی نہیں ہوں کیونکہ یہ رقم میں نے قرض نہیں لی تھی۔''

''بی بی تم قانونی پیچیدگیوں سے واقف نہیں ہو۔'' عرفان نے کہا۔''میں عدالت کے ذریعے تمہارے گھر کا سارا سامان قرق کروا سکتا ہوں۔''

''ضرور کروا لیجیے۔'' ماجدہ نے کہا۔''اس گھر میں جو کچھ موجود ہے، اٹھا کر لے جایئے اور اس سے اپنا قرض وصول کر لیجیے، میرے پاس کوئی رقم نہیں ہے۔''

''میں عدالتی کارروائی کروں گا اور تم کو رقم دینے کے علاوہ یہ مکان بھی خالی کرنا ہو گا۔''

''آپ کا جو جی چاہے کیجیے۔'' ماجدہ نے سخت لہجے میں کہا۔''جہاں تک مکان چھوڑنے کا تعلق ہے تو میں ایک ماہ کے بعد آپ کا مکان خالی کر دوں گی، لیکن میرے پاس آپ کو دینے کے لیے کوئی رقم نہیں ہے۔'' ماجدہ کو اپنے لب و لہجے پر خود بہت حیرت ہو رہی تھی۔ اس کے اندر یہ غیر معمولی جرأت اچانک نہ جانے کس طرح پیدا ہو گئی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ عرفان اس سے جھوٹ بول رہا ہے اور ایک مرے ہوئے بدنام آدمی پر بڑی آسانی کے ساتھ جھوٹے الزام لگا رہا ہے۔ اگر عزیز ایک گھٹیا انسان تھا، تو عرفان کون سا اچھا آدمی تھا۔ برسوں تک دھکے کھاتے رہنے کے بعد ماجدہ کے اعصاب میں مضبوطی اور سختی آ گئی تھی اور اس نے زندگی کے تجربات سے بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔

ماجدہ کے کڑے تیوروں کو دیکھ کر عرفان ذرا سنبھل گیا۔ ماجدہ مکان چھوڑنے پر تیار تھی، لہٰذا اس سلسلے میں اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جا سکتی تھی اور باقی معاملات اتنے آسان نہیں تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اچھی طرح سوچ لو۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک ہفتے کے بعد پھر آؤں گا۔ مکان تو خیر تم خالی کر ہی دو گی لیکن تمہیں رقم بھی ادا کرنی ہوگی۔''

''میں کہہ چکی ہوں کہ میرے پاس کوئی رقم نہیں ہے۔'' ماجدہ نے تڑخ کر کہا۔ ''اگر آپ وصول کر سکتے ہیں تو عزیز کی قبر سے وصول کر لیجیے۔''

عرفان حیرانی کے ساتھ اس کی شکل دیکھنے لگا۔ اسے شاید اس عورت سے ایسے سخت رویے کی توقع نہیں تھی۔

''میں ابھی تو جا رہا ہوں۔'' عرفان نے کہا۔ ''لیکن پھر آؤں گا اور تم اس سارے معاملے کے بارے میں اچھی طرح سوچ لو۔ اگر تم جیل جانے اور بے عزت ہونے سے بچنا چاہتی ہو تو تمہیں میری بات پر سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا۔''

''میرے اوپر آپ کا کوئی قرضہ نہیں ہے۔'' ماجدہ نے آنکھیں نکال کر کہا۔ ''مجھے دھمکیاں دینے کی کوشش مت کیجیے۔''

عرفان وہاں سے چلا گیا۔ اسی دن سے ماجدہ نے ایک دوسرے مکان کی تلاش شروع کر دی۔

کوئی دس دن کے بعد عرفان ایک بار پھر اس کے پاس آیا لیکن اس بار وہ بالکل بدلا ہوا لگ رہا تھا۔ عرفان کی عمر کوئی پچاس پچپن سال تھی اور ماجدہ نے اسے ہمیشہ معمولی سے کپڑوں اور معمولی حلیے میں دیکھا تھا۔ اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ اسے اپنی کوئی خاص پروا نہیں ہے۔ اس کی داڑھی بھی اکثر بڑھی ہوئی ہوتی تھی۔ لیکن آج جب وہ آیا تو بہت نفیس قسم کا شلوار قمیص سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس نے تازہ تازہ شیو بنایا تھا اور چہرے پر کریم بھی ملی تھی، جس کے باعث چہرہ خوب چمک رہا تھا۔ بالوں میں بھی تیل یا کریم لگا کر انہیں عمدہ طریقے سے سیٹ کیا گیا تھا۔ اس نے جب ماجدہ سے گفتگو شروع کی تو اس کا لب ولہجہ بھی بہت بدلا ہوا تھا۔ آج اس میں رعونت، دھمکی اور تلخی کے بجائے نرمی، مہربانی اور شگفتگی گھلی ہوئی تھی۔

''ہاں بھئی ماجدہ بیگم، تو پھر تم نے کیا طے کیا؟'' اس نے نرم نرم نظروں سے ماجدہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اسی مہینے میں دوسرے مکان کا بندوبست ہو جائے گا اور میں آپ کا مکان خالی کر دوں گی۔'' ماجدہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سکون کے ساتھ جواب دیا۔

''اور قرضے کی رقم کا کیا ہوگا؟'' عرفان نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں کوئی تندی نہیں تھی۔

''میں آپ کو پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ میں کسی کی قرض دار نہیں ہوں۔'' ماجدہ نے برافروختگی کے ساتھ کہا۔ ''اور مجھے معلوم ہے کہ عزیز ہر ماہ پابندی سے کرایہ ادا کرتے تھے۔''

''دیکھو ماجدہ، اگر تم چاہو تو ہم اس معاملے کو سلجھا سکتے ہیں۔'' اچانک عرفان کی آواز ایک ہلکی سرگوشی میں تبدیل ہوگئی۔ ''مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ عزیز کس قسم کا آدمی تھا اور کیا دھندا کرتا تھا۔ اگر تم اس بات کے لیے تیار ہو کہ میں ہفتے میں ایک آدھ بار دو گھڑی تمہارے ساتھ وقت گزار لیا کروں، تو میں سارا قرضہ بھی معاف کر دوں گا اور تمہیں مکان سے بھی نہیں نکالوں گا۔ تم بغیر کرائے کے اس مکان میں رہ سکتی ہو اور میں تمہیں خرچے کے لیے کچھ رقم بھی دوں گا۔ چاہو تو کہیں کوئی کام وغیرہ بھی کر سکتی ہو۔''

ماجدہ کا دماغ سن ہونے لگا۔ عرفان اسے داشتہ بنا کر رکھنا چاہتا تھا اور اسے یہ بات کہنے کی جرأت اس وجہ سے ہوئی تھی کیونکہ ماجدہ کا ''شوہر'' عزیز ایک آبرو باختہ آدمی تھا۔ تو ایک آبرو باختہ آدمی کی بیوی سے بھی آبرو باختگی کی امید رکھنا کوئی ایسی غلط بات تو نہیں تھی۔

ماجدہ نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اس نے عرفان کو بُری طرح دھتکارنے اور ذلیل کر کے وہاں سے بھگانے کے بجائے اس کے ساتھ مختلف انداز میں پیش آنے کا فیصلہ کیا۔

فیاض اور عزیز نے تو اسے دھوکا دیا تھا لیکن عرفان اس معاملے میں اسے دھوکا نہیں دے رہا تھا، وہ کھل کر بات کر رہا تھا۔

ماجدہ نے کافی دیر کے توقف کے بعد اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''آپ جو چاہتے ہیں وہ ممکن نہیں ہے۔ میں دو بچوں کی ماں ہوں۔ میرے سامنے میری بیٹی کا مستقبل ہے۔ میں ذلت کی زندگی نہیں گزار سکتی۔''

عرفان خاموش ہوگیا۔ وہ خالی خالی نظروں سے ماجدہ کے چہرے کو تک رہا تھا۔ کچھ دیر تک گہری خاموشی طاری رہی۔

''میں..... میں تو تمہاری مدد کرنا چاہتا تھا۔'' عرفان نے کمزور اور تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

''اگر آپ کے دل میں واقعی ایسا کچھ ہے تو اس کا صرف ایک راستہ ہے۔'' ماجدہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''آپ میرے ساتھ نکاح کر لیجیے۔''

''نکاح؟'' عرفان کو جیسے کرنٹ لگ گیا۔ ''نکاح؟ مگر میں تو جوان بچوں کا باپ ہوں اور میری بیوی ایک بہت بدمزاج عورت ہے۔ اس کے عذاب سے بچنے کے لیے تو میں کچھ اچھا وقت گزارنا چاہتا ہوں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''آپ یہ اچھا وقت ضرور گزار سکتے ہیں لیکن صرف میرے ساتھ نکاح کر کے..... میں آپ سے اپنے بچوں کی کفالت کا مطالبہ نہیں کروں گی، وہ آپ کے بچے نہیں ہیں۔ میں خود کہیں کوئی کام تلاش کرلوں گی لیکن میں یہ ذلت کی زندگی گوارا نہیں کرسکتی۔''

''میں تو تمہاری مدد کرنا چاہتا تھا۔'' عرفان نے افسردگی کے ساتھ کہا۔ ''تمہاری بھی اور اپنی بھی.....''

''تو پھر وہی راستہ اپنایئے جو ہم دونوں کے لیے مفید ہے۔'' ماجدہ نے کہا۔

عرفان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔

لیکن اس نے دوبارہ آنے میں دیر نہیں لگائی۔ اگلے ہی دن وہ ماجدہ کے پاس پھر موجود تھا۔

''میں نے فیصلہ کرلیا ہے ماجدہ۔'' اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''میں تمہارے ساتھ نکاح کروں گا لیکن ایک بات یاد رہے، میرے گھر والوں کو اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہونا چاہیے۔''

''میں آپ کے گھر والوں کو بالکل نہیں جانتی۔'' ماجدہ نے کہا۔ ''میں ان لوگوں سے کبھی نہیں ملی لہٰذا مجھ سے یہ بات کہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔''

اگلے ہفتے شام کو عرفان ایک قاضی اور چند آدمیوں کو لے کر آیا، جنہوں نے گواہوں کے فرائض انجام دیئے۔ قاضی نے عرفان اور ماجدہ کا نکاح پڑھایا۔ دونوں کی یہ دوسری شادی تھی۔ نکاح نامے میں کوئی شرط نہیں رکھی گئی تھی، نہ عرفان نے کوئی اضافی ذمہ داری قبول کی تھی۔

نکاح کے وقت ماجدہ کے دل کی عجیب حالت تھی۔ وہ قسمت کی اس ستم ظریفی پر غور کر رہی تھی۔ اس کا آج تک کوئی نکاح نہیں ہوا تھا، باوجود یکہ وہ دو بچوں کی ماں تھی۔ وہ اپنی زندگی میں کبھی ایجاب وقبول کے مراحل سے نہیں گزری تھی۔ کسی نے بھی شریعت کی رُو سے اسے اپنی بیوی بنانے کا اعلان نہیں کیا تھا، بس اپنے بچے اس کی گود میں ڈال دیئے تھے۔ آج پہلی بار اس کا باقاعدہ نکاح ہو رہا تھا۔ ایک مرد چار آدمیوں کی موجودگی میں ایک قاضی کے سامنے اسے اپنی بیوی کی حیثیت سے قبول کر رہا تھا۔ ماجدہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ خوشی کے آنسو ہیں یا غم کے..... غم اور خوشی کی ایک ایسی ملی جلی کیفیت تھی جسے ماجدہ کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی۔

ماجدہ کو عرفان سے کوئی محبت نہیں تھی۔ فی الحقیقت اس نے ہاشم کے سوا آج تک کسی

مرد سے محبت نہیں کی تھی۔ شریف الدین، اللہ بخش اور عبدالستار اس کی مجبوری تھے۔ ان سب لوگوں کو وقت اور تقدیر نے اس کے اوپر مسلط کر دیا تھا اور وہ ان کے ہاتھوں کھلونا بننے کے لیے مجبور تھی۔ فیاض کے ساتھ اس کا جو معاملہ تھا، وہ خود کو زندہ رکھنے کے لیے ایک سمجھوتے کا معاملہ تھا۔ عزیز نے بھی اس پر زبردستی قبضہ کیا تھا..... جتنے بھی مرد اس کی زندگی میں آئے تھے، ان میں سے کسی کے ساتھ اس کا محبت کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔

اور اب عرفان کے ساتھ اس کی شادی بھی خود کو زندہ رکھنے کے لیے ایک سمجھوتے کی ہی شکل تھی۔ جسے ماجدہ نے بہت سوچ سمجھ کر قبول کیا تھا۔

عرفان نے اس رات ماجدہ کو کچھ رقم بھی دی، اور یہ کہا کہ وہ اسے ہر ماہ اتنی رقم ضرور دیتا رہے گا جس سے وہ آرام کے ساتھ اپنے گھریلو اخراجات پورے کرسکے۔

''میں خود بھی کوئی کام تلاش کروں گی۔'' ماجدہ نے کہا۔ ''کوئی ایسا کام جو میں گھر بیٹھے کرسکوں۔''

عرفان نے ماجدہ کو ایک بوتیک سے متعارف کرا دیا، جو عورتوں کے لیے ملبوسات تیار کرتا تھا۔ ماجدہ کو اس بوتیک سے تھوڑا بہت کام ملنے لگا جسے وہ گھر بیٹھ کر کرتی تھی۔ اس نے سلائی کی ایک پرانی مشین بھی خرید لی تھی۔

عرفان نے ماجدہ کو کوئی تکلیف نہیں دی۔ وہ ماجدہ کے پاس آکر بہت خوش ہوتا تھا اور اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہتا تھا۔ اس نے ماجدہ کو کھل کر یہ بتایا کہ اس کے اپنے گھر میں اس کے لیے زندگی اتنی خوشگوار نہیں ہے، کیونکہ گھر والوں کا زیادہ تر زور مختلف قسم کے مطالبات پر رہتا ہے۔

ماجدہ نے ثمینہ کو علاقے کے ایک اسکول میں داخل کروا دیا تھا۔ وہ خود تو اسکول نہ جاسکی تھی مگر اپنی بیٹی کو ضرور پڑھانا چاہتی تھی۔

زندگی نے رفتہ رفتہ ایک مقررہ اور سادہ سا راستہ بنالیا تھا۔ بوتیک کے کام سے ماجدہ کو اچھے خاصے پیسے مل جاتے تھے اور عرفان بھی اس کو پابندی سے پیسے دیتا تھا۔ مکان کا کوئی کرایہ نہیں دینا پڑتا تھا۔ ماجدہ اپنے بچوں کے ساتھ آرام اور سکون کے ساتھ رہ رہی تھی۔ دونوں بچے اس کی توجہ کا مرکز اور اس کے لیے جینے کا سب سے بڑا سہارا تھے۔ عرفان کو وہ اس حد تک اپنا محسن سمجھتی تھی کہ اس نے اسے جینے کا ایک انداز دیا تھا۔ عرفان عام طور سے ہفتے میں دو دن آتا تھا۔ وہ دوپہر کے بعد آجاتا تھا اور پھر رات گئے تک اس کے ساتھ رہتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ثمینہ بھی عرفان سے کافی مانوس ہوگئی تھی۔ وہ اسے ''انکل'' کہتی تھی۔

اس روز بھی عرفان دوپہر کے بعد آ گیا تھا اور ماجدہ اور بچوں کے ساتھ بیٹھا ہوا ٹی وی پر کرکٹ میچ دیکھ رہا تھا۔ ماجدہ کو کرکٹ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن وہ محض عرفان کی خاطر اس کے ساتھ ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتی تھی۔

اچانک دروازے پر کسی نے بڑے زور زور سے دستک دینا شروع کر دی۔ یہ عام انداز کی دستک نہیں تھی، بلکہ اس سے بہت مختلف، قدرے جارحانہ اور گستاخانہ انداز کی دستک معلوم ہوتی تھی۔

''میں دیکھتی ہوں۔'' ماجدہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''شاید بوتیک سے آدمی آیا ہو، کپڑے لینے کے لیے..... میں نے کل ہی تیار کر لیے تھے۔''

ماجدہ اٹھ کر دروازے کی طرف چلی۔ اسی اثنا میں دستک دینے والا کچھ زیادہ ہی بے تابی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ وہ مسلسل دروازہ پیٹے جا رہا تھا۔

ماجدہ پریشان ہوگئی۔ نہ جانے کون تھا جو اس قدر شور مچائے جا رہا تھا۔

ماجدہ نے جلدی سے دروازہ کھولا اور ابھی وہ پوری طرح سے دروازہ کھولنے بھی نہیں پائی تھی کہ یکبارگی کسی نے زور سے دھکا دے کر پورا دروازہ وا کر دیا۔

دروازے پر ایک چھوٹا سا جلوس موجود تھا، سب سے آگے ایک عورت تھی۔

یہ ایک موٹی، بے ڈول اور بے ہنگم قسم کی گہری سانولی رنگت کی عورت تھی۔ اس کی تنگ پیشانی پر ستر بل پڑے ہوئے تھے اور اس کا چہرہ غیظ و غضب کے عالم میں تپ رہا تھا۔

اس عورت کے پیچھے دو نوجوان آدمی تھے اور ایک نوجوان لڑکی تھی۔

''کون ہیں آپ؟'' ماجدہ نے سخت گھبراہٹ اور خوف کے عالم میں کہا۔ ''کون..... کون ہیں آپ لوگ؟ کس سے ملنا ہے آپ کو؟''

''پرے ہٹ۔'' موٹی عورت نے ماجدہ کو زور سے ایک طرف دھکا دیتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی وہ سب لوگ ایک دوسرے کے آگے پیچھے گھر میں گھستے چلے آئے۔

''ارے..... ارے..... یہ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں؟'' ماجدہ نے کہا۔ ''اس طرح گھر میں کیوں گھسے چلے آ رہے ہیں؟''

''تُو ماجدہ ہے نا؟'' اچانک عورت نے رک کر اور بڑی کینہ توز نظروں سے ماجدہ کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' ماجدہ نے سہم کر کہا۔ ''مگر آپ کون ہیں اور اس طرح کیوں میرے گھر میں گھسی چلی آ رہی ہیں؟''

''یہ تیرے باپ کا گھر نہیں ہے کنجر کی اولاد۔'' عورت بڑی بھیانک اور تیز آواز میں چیخی۔ ''یہ ہمارا گھر ہے، ہم مالک ہیں اس گھر کے..... کہاں ہے وہ بڈھا؟ نکال اسے باہر..... کہاں چھپا کر رکھا ہوا ہے اسے؟ نکل..... باہر نکل..... اوئے عرفان.....'' عورت اِدھر اُدھر دیکھ کر چیخنے لگی۔

ماجدہ دم بخود رہ گئی۔ نہ جانے کیا قیامت برپا ہونے والی تھی۔

''وہ رہے ابا جی.....'' نوجوان لڑکی نے عرفان کو دیکھتے ہی زور زور سے چلاتے ہوئے کہا۔

''کیا ہے؟ کیا ہے؟'' عرفان کی زبان لڑکھڑا رہی تھی اور اس کے چہرے کا رنگ ایک دم اُڑ گیا تھا۔ ''تم لوگ..... تم لوگ یہاں.....؟''

''ہاں..... ہاں ہم یہاں۔'' موٹی عورت زور سے چیخی۔ ''کیوں؟ دم نکل گیا نا ہم لوگوں کو دیکھ کر؟ تُو نے سمجھا تھا کہ تُو اسی طرح اس فاحشہ کے ساتھ گل چھرے اُڑاتا رہے گا اور ہم تجھے چھوڑ دیں گے؟ ارے شرم کر..... ارے شرم کر بے غیرت..... ذرا اپنی جوان اولادوں کی طرف تو دیکھ..... یہ تیری عمر ہے گل چھرے اُڑانے کی؟ ارے ڈوب مر چلو بھر پانی میں.....''

ماجدہ کی سمجھ میں ساری بات تو اسی لمحے آ گئی تھی جب اس لڑکی نے عرفان کو دیکھ کر ''ابا جی'' کہا تھا اور اب اس عورت کے چیخنے کے بعد تو سب کچھ بالکل واضح ہوگیا۔ خوف و دہشت کی ایک سرد لہر اس کے سارے وجود میں سرایت کر گئی۔ تو یہ قصہ تھا۔ عرفان کی چوری پکڑی گئی تھی۔

''میں نے..... میں نے..... کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔'' عرفان نے کمزور آواز میں اپنی مدافعت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ماجدہ سے شادی کی ہے اور مجھے ایسا کرنے کا حق حاصل ہے۔''

''ذرا تو لحاظ کریں ابا جی۔'' دونوں نوجوانوں میں سے ایک غصے کے عالم میں دھاڑا۔ ''آپ اپنا حق بہت پہلے استعمال کر چکے ہیں۔ آپ کو اب ایسی حرکت کرتے ہوئے ہم لوگوں کا ذرا خیال نہیں آیا۔''

''یہاں کھڑے ہو کر مت چیخو۔'' عرفان نے نرم اور شکستہ لہجے میں کہا۔ ''اندر کمرے میں آ جاؤ، بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔''

''ہاں ہاں چلو۔'' عورت نے جارحانہ انداز میں آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ''اندر چلو.....

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اندر چل کر بات کرتے ہیں۔"

وہ سب لوگ اندر آ کر کمرے میں بیٹھ گئے۔ ماجدہ دروازے میں کھڑی تھی۔ کسی نے اس سے اندر آنے کے لیے نہیں کہا۔ عرفان کی حالت اس وقت کسی مار کھائے ہوئے جانور کی سی ہو رہی تھی۔ وہ بُری طرح سہما ہوا، پریشان اور افسردہ نظر آ رہا تھا۔

"آپ کو اس عمر میں دوسری شادی کی کیا سوجھی ابا جی؟" دوسرے نوجوان نے بڑے ہی تحقیر آمیز انداز میں اپنے باپ سے سوال کیا۔ "آپ کی اولادیں اب اولادوں والی ہو رہی ہیں اور آپ ہیں کہ اپنی دوسری شادی رچا کر بیٹھے ہیں۔"

"یہ نہیں چلے گا۔" عورت نے برہمی کے ساتھ کہا۔ "ایسا بالکل نہیں چلے گا۔ تمہیں ابھی اور اسی وقت اس عورت کو چھوڑنا ہوگا۔"

"دیکھو۔" عرفان نے بڑی لجاجت کے ساتھ کہا۔ "دیکھو..... کیا تم لوگوں کو اس عورت سے کبھی کوئی شکایت ہوئی؟" عرفان نے بڑے ہی خوشامدانہ اور معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"وہ نہ تم لوگوں کے لینے میں نہ دینے میں، تم لوگوں کو تمہارے سارے حقوق مل رہے ہیں، میں نے کوئی کمی کی؟ تم....."

"بکواس بند کرو اور اسے فوراً طلاق دو۔" عورت نے عرفان کی بات کاٹتے ہوئے چلا کر کہا۔ "تم نے میری اجازت کے بغیر دوسرا نکاح کیا ہے۔ یہ جرم ہے۔ ارے میں تمہیں جیل بھجوا دوں گی۔ تم ہو کس ہوا میں؟ ہماری زندگیوں میں آگ لگا کر عیش کرنا چاہتے ہو؟ میں تو تمہاری جان نکال لوں گی۔"

"یہ لیجیے ابا جی....." اچانک بڑے لڑکے نے اپنی جیب میں سے ایک کاغذ نکال کر عرفان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس پر دستخط کر دیجیے۔"

"کیا ہے یہ؟" عرفان نے ایک دم بدک کر کہا۔

"یہ طلاق نامہ ہے ابا جی۔" لڑکے نے کہا۔ "آپ اس پر دستخط کر دیجیے۔ ہم سب لوگ اس طلاق کے گواہ ہیں۔"

"ابھی تم لوگ یہاں سے جاؤ۔" عرفان نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔ "میں گھر آؤں گا پھر بات کریں گے، ابھی جاؤ..... جاؤ یہاں سے....."

"ہم میں سے کوئی بھی یہاں سے اس وقت تک نہیں جائے گا جب تک کہ تم اس طلاق نامے پر دستخط نہیں کر دو گے۔" عورت نے دھاڑ کر کہا۔ "یہاں سے ہم نہیں جائیں گے، اس

عورت کی لاش جائے گی۔" اس نے ماجدہ کی طرف نفرت بھری نظروں سے دیکھا۔

"یہ دیکھ رہے ہیں ابا جی۔" اچانک دوسرے لڑکے نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھیلے میں سے ایک بوتل نکالی۔ "اس بوتل میں تیزاب ہے ابا جی..... اگر آپ نے ابھی اور اسی وقت اس عورت کو طلاق نہیں دی تو میں یہ تیزاب اس کے چہرے پر ڈال دوں گا۔ پھر چاہے مجھے ساری عمر جیل میں سڑنا پڑے، مگر میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔"

"نہیں..... نہیں..... میرا کوئی قصور نہیں ہے۔" ماجدہ نے شدید خوف و دہشت کے عالم میں لرزتی ہوئی آواز میں کہا اور وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن موٹی عورت اور دوسرے لڑکے نے اسے دبوچ لیا۔

"بھاگتی کہاں ہے؟ دوسروں کے مردوں کو پھنساتی ہے آوارہ عورت....." عرفان کی بیوی دانت پیس رہی تھی۔

"خبردار..... رک جاؤ....." عرفان ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "ایسی کوئی حرکت نہ کرنا۔"

"تو پھر ابا جی..... آپ کو ابھی اور اسی وقت فیصلہ کرنا ہوگا۔" لڑکی نے کہا۔ "اگر آپ اس عورت کو بچانا چاہتے ہیں تو اسے فوراً طلاق دے دیجیے۔"

"تمیز سے بات کرو۔" عرفان نے کہا۔ "یہ تم نے کیا عورت عورت لگا رکھی ہے؟ یہ تمہاری ماں ہے۔"

"میری ماں یہ ہے۔" لڑکی نے اپنی ماں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔ "ہر راہ چلتی عورت میری ماں نہیں ہو سکتی ابا جی..... چلیے دستخط کیجیے۔"

لڑکے نے قلم اپنے باپ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "خاندان بھر میں اپنا تماشا مت بنائیے ابا جی۔" اس نے کہا۔ "ابھی ہم نے کسی کو بتایا نہیں ہے، اگر بتا دیا تو آپ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے اور اس عورت کا چہرہ تو بھتنی جیسا ہو جائے گا۔"

عرفان نے قلم ہاتھ میں پکڑا اور آہستہ سے کاغذ پر دستخط کر دیئے۔ اسی کے ساتھ ان لوگوں نے ماجدہ کو چھوڑ دیا۔ ماجدہ نیم جاں سی ہو کر ایک صوفے پر گر گئی۔ لڑکے نے دستخط شدہ طلاق نامہ اپنے باپ کے ہاتھ سے لے کر فوراً اپنے قبضے میں کر لیا۔

"چلیے ابا جی۔" اس نے اپنے باپ کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کہا۔ "اب آپ کو یہاں رکنے کی ضرورت نہیں ہے، یہ عورت اب آپ کے لیے غیر ہو چکی ہے۔"

عرفان نے چور نظروں سے ماجدہ کی طرف دیکھا، جیسے وہ نظروں ہی نظروں میں اس سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رحم کی بھیک مانگ رہا ہو.....اور پھر وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ خاموشی سے وہاں سے چلا گیا۔

ماجدہ کو اس ساری سنگین اور دل شکن صورتِ حال کو سمجھنے میں کچھ وقت لگا اور جب اس نے یہ سب کچھ اچھی طرح سمجھ لیا تو ایک بار پھر اس کی نا امیدی اور مایوسی کی کوئی حد نہیں رہی۔ زندگی نے ایک بار پھر اس سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ اول تو اس کے پاس تھا ہی کیا، بس عرفان کی صورت میں اسے ایک ایسا آدمی مل گیا تھا جو اسے جزوی سہارا دے سکتا تھا اور کسی بُرے وقت میں اس کی مدد کر سکتا تھا اور آج یہ ادھورا سہارا بھی اس سے چھن گیا تھا۔ عرفان کے ساتھ اس کی شادی کو صرف چھ ماہ کا عرصہ گزرا تھا، اور یہی وہ مدت تھی جو اس نے کراچی سے نکلنے کے بعد اب تک سب سے زیادہ سکون اور اطمینان کے ساتھ گزاری تھی۔ جب وہ اپنے آپ کو ایک آزاد اور اپنی مرضی کا مالک انسان سمجھ سکتی تھی.....اور آج یہ سب کچھ بیک وقت ختم ہو گیا تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے اس نے کوئی خواب دیکھا تھا اور اچانک آنکھ کھل جانے پر اس تلخ حقیقت کا انکشاف ہوا کہ وہ سب کچھ تو محض ایک خواب تھا۔

اسے عرفان سے کوئی خاص شکایت نہیں تھی۔ عرفان کے بارے میں اسے پہلے ہی سے اندازہ تھا کہ وہ اپنے گھر والوں سے، خاص طور سے اپنی بیوی سے بہت ڈرتا ہے اور اسے سخت ناپسند بھی کرتا ہے۔ اپنے گھریلو حالات سے تنگ آ کر ہی اس نے دوسری شادی کی تھی لیکن وہ اپنے اندر اتنی ہمت نہ پیدا کر سکا کہ اس شادی کو قائم رکھتا۔

''جہنم میں جائے۔'' ماجدہ نے انتہائی گہرے غم و غصے کے ساتھ دل ہی دل میں کہا۔ ''مجھے اب اسے بھی اپنی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکال کر پھینک دینا ہوگا.....شریف الدین، اللہ بخش، عبدالستار، فیاض اور عزیز، اس فہرست میں ایک اور اضافہ سہی۔''

☆======☆======☆

اگلے روز دوپہر کے بعد کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ماجدہ کو یہ دستک جانی پہچانی لگی۔ تاہم اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ عرفان ہوگا۔ مگر جب اس نے دروازہ کھولا تو وہاں عرفان کو کھڑے پایا۔

عرفان کو دیکھ کر ماجدہ کو ایسا لگا جیسے صرف ایک ہی رات میں عرفان کی عمر میں کئی سال کا اضافہ ہو گیا ہو۔ اس کے چہرے پر اچانک سن رسیدگی کے گہرے اثرات نمودار ہو گئے تھے۔ اس نے شیو نہیں بنایا تھا اور اس کے چہرے پر بالوں کی سفید سفید کھونٹیاں اُگی ہوئی، اس کے بڑھاپے کی نشاندہی کر رہی تھیں۔

ماجدہ نے کچھ کہے سنے بغیر دروازہ کھول دیا اور عرفان تھکے تھکے قدموں سے اندر آ گیا۔ وہ سیدھا کمرے میں جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ماجدہ اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ماجدہ نے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ تھوڑے توقف کے بعد عرفان نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک لفافہ نکالا اور اسے ماجدہ کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ دس ہزار روپے ہیں۔'' عرفان نے نیم مردہ آواز میں کہا۔ ''یہ تمہارے مہر کی رقم ہے جو میں تمہیں ادا کر رہا ہوں۔''

ماجدہ نے خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور لفافہ لے لیا۔

''جو کچھ ہوا، مجھے اس پر سخت افسوس اور شرمندگی ہے۔'' عرفان نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ ''میں اگر ان لوگوں کی بات نہ مانتا تو وہ تمہارا خدا جانے کیا حشر کر ڈالتے۔''

''خیر، اب تو یہ قصہ ختم ہو چکا ہے۔'' ماجدہ نے سرد لہجے میں کہا۔ ''میں ایک ماہ کے اندر اندر یہ مکان بھی چھوڑ دوں گی۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' عرفان نے بدستور کمزور آواز میں کہا۔ ''مکان کو تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرائے پر اٹھانا ہی ہے اور کوئی نہ کوئی کرایہ دار اس میں رہے گا، تو تم اس میں کرائے دار کی طرح رہتی رہو، تمہاری طرف سے کرایہ میں خود ادا کرتا رہوں گا۔ کسی کو یہ بات بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ بولتے بولتے رک گیا اور پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ ''جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ اب تم اس مکان میں اسی طرح رہتی رہو جس طرح اب تک رہتی چلی آئی ہو۔ میں..... میں..... بہت شرمندہ ہوں۔''

ماجدہ کو اس وقت عرفان ایک قابلِ رحم انسان معلوم ہوا اور اسے عرفان پر ترس آیا۔ عرفان کے مقابلے میں دیہی علاقوں کے وہ جاگیردار اور زمیندار کتنے خوش قسمت تھے کہ وہ ایک سے زیادہ بیویاں بھی رکھتے تھے، داشتائیں بھی رکھتے تھے اور خریدی ہوئی یا سودوں میں جیتی ہوئی باندیاں بھی رکھتے تھے۔ ان کی بیویاں اور ان کی اولادیں اس ساری صورتِ حال کو قبول کرتی تھیں۔

''مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔'' ماجدہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''میں آپ کی مجبوری کو سمجھتی ہوں اور آپ کا شکریہ کہ آپ نے طلاق دینے کے بعد بھی میرا اتنا خیال کیا۔''

''میں کبھی کبھار تم سے ملنے کے لیے آتا رہوں گا۔'' عرفان نے آہستہ سے کہا۔ ''مجھے غلط مت سمجھنا، میں تم کو طلاق دے چکا ہوں۔ میں بس ایک دوست کی طرح تم سے ملوں گا۔''

''میری طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے۔'' ماجدہ نے کہا۔ ''لیکن آپ کے گھر والے شاید اس بات کو پسند نہیں کریں گے اور میرے اور آپ کے دونوں کے لیے مشکلات پیدا کریں گے، اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ آپ یہاں آنے سے گریز کریں۔''

''بس، کبھی کبھار..... تھوڑی سی دیر کے لیے.....'' عرفان نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

عرفان کچھ دیر رک کر چلا گیا۔ ماجدہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ یہاں دوبارہ آئے۔ اس کے بیٹے نے ماجدہ کے چہرے پر تیزاب پھینکنے کی جو دھمکی دی تھی، اس کے باعث ماجدہ شدید خوف و دہشت کا شکار تھی۔ وہ اب عرفان سے ہر قسم کا تعلق ختم کر لینا چاہتی تھی اور اس مکان کو بھی چھوڑ دینا چاہتی تھی۔ اگرچہ عرفان نے اسے بغیر کرائے کے رہنے کی پیش کش کی تھی، لیکن وہ اس میں اپنے لیے خطرہ محسوس کرتی تھی۔ اسے اب آمدنی کے ذرائع کو زیادہ وسیع کرنے کی ضرورت تھی۔

بوتیک سے اسے اچھا خاصا کام مل جاتا تھا۔ ان لوگوں کے پاس کام کی کمی نہیں تھی اور وہ ماجدہ کو اس سے زیادہ کام بھی دے سکتے تھے لیکن ابھی تک ماجدہ نے زیادہ کام لینے کی

کوشش اس لیے نہیں کی تھی کیونکہ عرفان اس کی ساری ضروریات پوری کرتا تھا، لیکن اب یہ سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بوتیک والوں سے بات کر کے زیادہ کام حاصل کرے گی تاکہ کچھ زیادہ آمدنی حاصل ہو سکے۔

ماجدہ نے بوتیک والوں کو بتایا کہ وہ اب زیادہ کام کرنا چاہتی ہے، تو وہ لوگ فوراً ہی خوش ہو کر اس کے لیے تیار ہو گئے۔ انہیں خود اچھے کام کی ضرورت تھی۔ انہوں نے ماجدہ کو دیئے جانے والے کام میں اضافہ کر دیا۔

کچھ دنوں کے بعد ماجدہ پر ایک نیا انکشاف یہ ہوا کہ وہ ایک بار پھر ماں بننے والی ہے..... اور یہ انکشاف اس کے لیے خاصا پریشان کن تھا۔ ابھی تو وسیم ہی بہت چھوٹا تھا۔ سال بھر کا..... اور اب ایک نئے مہمان کی آمد تھی، جس کے باپ سے ماجدہ کی باقاعدہ شادی ہوئی تھی اور اس کو جنم دیتے وقت ماجدہ کو کسی سے کچھ چھپانے یا جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں تھی۔ عرفان کے بیوی بچوں کو بھی یہ بات معلوم تھی کہ عرفان نے ماجدہ کے ساتھ نکاح کیا ہے۔

دن گزرتے گئے اور ماجدہ کی زیادہ تر توجہ اپنے کام پر رہی۔ وہ زیادہ سے زیادہ کام کر رہی تھی تاکہ زیادہ سے زیادہ آمدنی حاصل کر سکے۔ عنقریب اخراجات میں اور اضافہ ہونے والا تھا۔ اسے آنے والے وقت کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا تھا۔

ایک ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ اس دوران ماجدہ کو عرفان کی کوئی خیر خبر نہیں ملی، لیکن ایک ماہ کے بعد ایک دن وہ اچانک آ موجود ہوا۔ ماجدہ کو اسے دیکھ کر دکھ ہوا۔ وہ بہت دبلا اور کمزور ہو گیا تھا اور اس کے چہرے سے اداسی اور پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا۔

''میں تمہارے پاس آنا چاہتا تھا لیکن میں پچھلے دنوں کافی بیمار رہا۔'' اس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اب ذرا طبیعت سنبھلی ہے تو فوراً ہی تم سے ملنے چلا آیا ہوں، کیسی ہو تم؟''

ماجدہ نے گہری سنجیدگی کے ساتھ اسے بتایا کہ اس کا پاؤں بھاری ہو گیا ہے۔

''کیا؟'' عرفان ایک دم اچھل پڑا۔ اس کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار نمودار ہوئے جن میں خوشی کی جھلک کو بھی محسوس کیا جا سکتا تھا۔ ''واقعی۔''

''جی ہاں۔'' ماجدہ نے کہا۔

''کہیں..... کہیں..... رجسٹریشن کروایا؟ کسی ڈاکٹرنی سے مشورہ کیا؟'' عرفان نے پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ڈاکٹرنی نے ہی تو اس بات کی تصدیق کی ہے۔'' ماجدہ نے کہا۔''اگلے مہینے باقاعدہ رجسٹریشن کروالوں گی۔''

''یہی تو وہ بات تھی جس سے میرے گھر والے پریشان اور خوفزدہ تھے۔'' عرفان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔''لیکن یہ بہت اچھا ہوا۔ اب ان لوگوں کو پتہ چل جائے گا کہ میں ابھی ایسا گیا گزرا نہیں ہوں، میں اس عمر میں بھی باپ بن سکتا ہوں۔'' عرفان کی آواز میں مردانہ غرور کی جھلک تھی۔

اس ملاقات کے کوئی پندرہ دن کے بعد عرفان پھر ماجدہ کے پاس آیا۔ آج وہ پہلے کے مقابلے میں کافی بہتر نظر آرہا تھا۔

اس نے ماجدہ کی خیر خیریت پوچھی اور اس کے بعد بولا۔''میں نے یہ مکان، جس میں تم رہ رہی ہو، تمہیں گفٹ کر دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ تمہیں ابھی میرے ساتھ رجسٹرار کے آفس میں چلنا ہوگا۔ وہاں دستاویز پر دستخط ہوں گے اور اس کے ساتھ ہی تم اس مکان کی مالک بن جاؤ گی۔ یہ میرا اپنے ہونے والے بچے کے لیے ایک تحفہ ہے۔ آگے حالات خدا جانے کیا ہوں۔ میں کچھ اور کرسکوں یا نہ کرسکوں، ابھی جو کچھ کرسکتا ہوں وہ کر رہا ہوں۔ یہ مکان اب تمہارا ہوا۔ ایک بار تمہارے نام منتقل ہو جانے کے بعد پھر کوئی مائی کا لعل تم سے اسے واپس نہیں لے سکتا۔''

ماجدہ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے عرفان کا وہ لالچی اور فریبی روپ موجود تھا جو خود کو عزیز مرحوم کا قرض خواہ بتا کر اسے بلیک میل کرنا چاہتا تھا اور یہ آج کا عرفان تھا..... وہ کس قدر تیزی کے ساتھ بدل گیا تھا۔

عرفان ماجدہ کو اپنے ساتھ ٹیکسی میں بٹھا کر رجسٹرار آفس لے گیا۔ وہاں اس کا وکیل دستاویز سمیت موجود تھا۔ ضروری قانونی کارروائی کے ذریعے عرفان نے اپنا وہ مکان، جس کا وہ بلاشرکت غیرے مالک تھا، ماجدہ کو گفٹ کر دیا۔ ماجدہ کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔

''مبارک ہو۔'' قانونی کارروائی کی تکمیل کے بعد وکیل حشمت اللہ نے ماجدہ سے کہا۔ ''یہ مکان آپ کا ہوا۔ اگر اس سلسلے میں آپ کو کبھی بھی کوئی مشکل پیش آئے تو آپ بلا تکلف میرے دفتر چلی آیئے۔ میں آپ کو اپنا کارڈ دے رہا ہوں۔'' اس نے اپنا کارڈ ماجدہ کو دے دیا جسے ماجدہ نے سنبھال کر رکھ لیا۔

''یہ مکان اب تمہاری ملکیت ہے۔'' عرفان نے اس سے کہا۔''تم اگر چاہو تو اس میں رہو اور جی چاہے تو اس کو بیچ دو اور رقم کو جس طرح چاہو استعمال کرو، کوئی تمہیں ایسا کرنے سے روک نہیں سکتا۔''

''آپ نے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ میں مرتے دم تک اس کا شکریہ ادا نہیں کر سکتی۔'' ماجدہ بڑی مشکل سے الفاظ تلاش کر پائی۔

''میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا ہے۔'' عرفان نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔''خدا نے مجھے بہت کچھ دیا ہے، میں اس میں سے اگر تھوڑا سا اپنے ہونے والے بچے کو دے دوں گا تو میرے مال میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔ جہاں تک میرے گھر والوں کا تعلق ہے، میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ تمہارے ہونے والے بچے کو کبھی اس کا حق حاصل نہیں کرنے دیں گے۔ اس لیے میں پہلے ہی اس کو اس کا حق دے رہا ہوں۔''

عرفان ماجدہ کو اس کے گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ ماجدہ کی زندگی میں ایک غیر معمولی انقلاب برپا ہو چکا تھا۔ اس نے مردوں کے بہت سے روپ دیکھے تھے، ان میں عرفان کا روپ بڑی متضاد خصوصیات کا حامل تھا۔

عرفان چلا گیا اور پھر مہینوں تک اس نے اپنی صورت نہیں دکھائی۔ ماجدہ حسبِ معمول بوتیک کے لیے کام کر رہی تھی اور اپنے بچوں کو پال رہی تھی۔ کچھ نیک دل پڑوسی عورتیں اس کا خیال رکھتی تھیں۔ وہی ماجدہ کو اپنے ساتھ معائنے کے لیے زچہ خانے لے جاتی تھیں۔ رات کو ایک عورت ماجدہ کے گھر میں سوتی تھی۔

ماجدہ نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ اس کا اپنا کوئی نہیں تھا، جو اس کے پاس ہوتا، بس نیک دل اور ہمدرد پڑوسی عورتوں نے اس کی دیکھ بھال کی۔ ماجدہ جب گھر واپس آگئی تو عرفان اس سے ملنے اور اپنے بچے کو دیکھنے کے لیے آیا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ ماجدہ نے بیٹے کو جنم دیا ہے۔ ماجدہ نے اپنے نومولود بیٹے کا نام فہیم رکھا۔

ماجدہ کی زندگی سے مزید ایک سال کا عرصہ یوں کھسک کر غائب ہو گیا کہ اس کو خبر بھی نہیں ہوئی۔ اسے لاہور آئے ہوئے تقریباً چار سال ہو چکے تھے۔ جب وہ لاہور آئی تو اس کے ساتھ صرف ثمینہ تھی لیکن اب وہ مزید دو بچوں کی ماں تھی۔

ثمینہ اب خاصی سمجھدار ہو چکی تھی۔ ماجدہ نے اس کے باپ کے بارے میں اسے یہ بتایا تھا کہ اس کا نام شریف الدین تھا اور وہ مر چکا ہے اور اس کے بعد اس کی شادی عزیز سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئی تھی اور عزیز بھی مر گیا، جس کا بیٹا وسیم ہے، پھر اس کی شادی عرفان سے ہوئی جس نے بعد میں اس کو طلاق دے دی اور فہیم عرفان کا بیٹا ہے۔ ماجدہ کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ثمینہ کو یہ باور کرا سکے کہ وہ تینوں بہن بھائی کسی ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔ اس میں سخت ذہنی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی تھیں اور ماجدہ اپنے بچوں کو ان ساری الجھنوں سے دور ہی رکھنا چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے ثمینہ سے سچ بولا۔

اس تین سال کے عرصے میں ماجدہ کی زندگی میں ایک قسم کا ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ وہ اب کسی کی پابند، باندی نہیں تھی۔ اس کی زندگی میں اب کوئی مرد موجود نہیں تھا اور وہ اس کی ضرورت بھی نہیں محسوس کرتی تھی۔ وہ اب صرف اپنے بچوں کے لیے جینا چاہتی تھی جن میں سے کسی کو بھی باپ کی شفقت کا کوئی تجربہ نہیں تھا اور جنہوں نے آنکھ کھول کر صرف ماں کو دیکھا تھا۔ تین بچے..... تینوں الگ الگ مردوں کی اولاد..... لیکن ایک ہی ماں کے جگر کے ٹکڑے..... ماں کی محبت کے یکساں حقدار..... ماجدہ بوتیک کے لیے کام کرتی تھی، گھر کے سارے کام کرتی تھی اور بچوں کو سنبھالتی تھی۔ زندگی بہت مصروف تھی اور اب ثمینہ بھی چھوٹے بھائیوں کو سنبھالنے میں ماں کی کافی مدد کر دیتی تھی۔

اس روز ماجدہ کچھ تیار شدہ کام لے کر بوتیک گئی۔ وہ کام مالکن کے حوالے کر کے آ رہی تھی کہ اس نے بوتیک کے ایک کونے سے کچھ بنگالی کے الفاظ سنے۔ اسے ایسا لگا جیسے کوئی دو افراد بنگالی میں باتیں کر رہے ہیں۔ لاہور کی فضا میں شاذ و نادر ہی کوئی بنگالی بولنے والا شخص ملتا تھا۔ ماجدہ کو قدرتی طور پر ان لوگوں سے دلچسپی پیدا ہوئی اور وہ ان کی طرف بڑھی۔ شلوار قمیص میں ملبوس ایک جوان عورت اپنے ساتھی مرد سے ایک ڈریس کے بارے میں گفتگو کر رہی تھی جسے وہ ناقدانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

ماجدہ نے اس بنگالی بولنے والی عورت کو دیکھا اور اسے ایسا لگا جیسے اس نے اس کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ اس کے خدوخال میں کچھ شناسائی کی سی جھلک نظر آ رہی تھی۔ ماجدہ نے پہلے تو اسے اپنا وہم سمجھا لیکن تب مرد نے دوران گفتگو عورت سے بنگالی میں کہا۔ ''نہیں میمونہ..... اس کا کپڑا زیادہ اچھا نہیں ہے۔ وہ ادھر والا ڈریس دیکھو۔'' اس نے ایک دوسرے ڈریس کی طرف اشارہ کیا۔

''میمونہ!'' یکبارگی ماجدہ کے دماغ نے ایک زور دار جھٹکا لیا۔ بنگلہ دیش میں کسی نامعلوم مقام کے ایک قید خانے جیسے مکان کا منظر ماضی کے دھندلکوں سے نکل کر اس کے

سامنے آ گیا..... میمونہ، فردوسی اور وہ خود..... نو سال کی تین اغوا شدہ لڑکیاں اور ان کے سروں پر مسلط امینہ، شاہ میاں اور فرید..... ان تینوں افراد کی منحوس شکلیں اپنی تمام تر شیطنت کے ساتھ اس کے ذہن میں ابھر آئیں۔

وہ جلدی سے آگے بڑھ کر ان دونوں کے پاس پہنچ گئی۔ ''آپ کا نام میمونہ ہے؟'' اس نے بغیر کسی تمہید کے میمونہ سے مخاطب ہو کر بنگالی میں پوچھا۔

وہ دونوں فوراً ہی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان کے چہروں پر استعجاب کے ساتھ خوشی کے بھی آثار تھے کہ ان کا کوئی ہم زبان ان سے گفتگو کر رہا تھا۔

''جی ہاں۔'' میمونہ نے جواب دیا اور بڑے غور سے ماجدہ کی شکل دیکھنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ماجدہ کے چہرے میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

''آپ..... آپ کون ہیں؟''

''میں..... میں..... میں ماجدہ ہوں۔'' ماجدہ نے جلدی سے کہا۔

کہنے کو تو ماجدہ نے بڑی آسانی سے کہہ دیا کہ ''میں ماجدہ ہوں۔'' لیکن فوراً ہی اس کو یہ خیال آیا کہ میمونہ کے ساتھ موجود یہ مرد خدا جانے کون ہے..... اور میمونہ نے اپنے بارے میں اسے کیا بتایا ہے۔ میمونہ ایک اغوا شدہ لڑکی تھی اور پاکستان میں لائے جانے کے بعد اسے اور فردوسی کو فوری طور پر غائب کر دیا گیا تھا یعنی انہیں وہیں فروخت کر دیا گیا تھا جبکہ ماجدہ کو کراچی لا کر بیچا گیا تھا۔ اس کے بعد میمونہ کے ساتھ کیا ہوا؟ یہ آدمی کون تھا؟ ہو سکتا ہے اس کا شوہر ہو اور میمونہ نے اپنے بارے میں اسے کوئی اور ہی کہانی سنائی ہو..... خدا جانے.....

''ماجدہ..... ماجدہ..... مادھو پور والی ماجدہ جسے کھلنا سے اغوا کیا گیا تھا؟'' میمونہ کی آواز فرطِ جذبات سے کانپ رہی تھی اور اس کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ ابھر آیا تھا۔

''ہاں..... ہاں..... وہی۔'' ماجدہ لپک کر میمونہ کے گلے لگ گئی اور ان دونوں کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو بہنے لگے۔ میمونہ کے ساتھ موجود مرد حیرت کے عالم میں یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

ان دونوں عورتوں نے ایک دوسرے کو آج سے تقریباً سولہ سال پہلے دیکھا تھا، جب ماجدہ کی عمر صرف نو سال تھی۔ اتنا طویل عرصہ گزرنے کے باوجود ان دونوں نے قرائن اور قیاس سے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔

''تم..... اُف ماجدہ.....'' میمونہ نے روتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''ہائے، تم کتنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بڑی ہوگئی ہو۔ میں تم کو کبھی نہ پہچان پاتی اگر تم نے خود اپنا نام نہ بتایا ہوتا۔ تم..... یہاں لاہور میں کب سے ہو؟''

''تقریباً چار سال سے۔'' ماجدہ نے جواب دیا۔

''اور اس سے پہلے؟'' میمونہ نے بے تابی کے ساتھ پوچھا۔ ''اس سے پہلے تم کہاں تھیں؟''

''یہ..... یہ کچھ ٹھیک نہیں ہو رہا ہے۔'' میمونہ کے ساتھی مرد نے آہستہ سے کہا۔ ''لوگ ہمیں حیرت اور تجسس کے ساتھ دیکھ رہے ہیں۔ تفصیلی باتوں کے لیے کوئی اور بندوبست کرنا ہوگا۔''

''ہاں..... یہ ٹھیک ہے۔'' میمونہ نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا اور ماجدہ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''ماجدہ..... یہ میرے شوہر ہیں ڈاکٹر ظہیر احمد۔'' ظہیر احمد نے آہستہ سے گردن ہلائی۔ ماجدہ نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ تینوں بوتیک سے باہر نکل آئے۔

''سنو ماجدہ۔'' میمونہ نے کہا۔ ''میں تو ابھی اور اسی وقت تمہارے بارے میں سب کچھ جان لینا چاہتی ہوں اور تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دینا چاہتی ہوں، لیکن اس وقت مجھے اور ظہیر کو ایک اہم ڈیوٹی پر ہسپتال جانا ہے۔ تم ہمارے ساتھ گاڑی میں بیٹھو۔ ہم تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دیں گے۔ اس طرح ہم تمہارا گھر بھی دیکھ لیں گے۔ تم کل کسی وقت مجھے یہاں بوتیک میں ہی مل جاؤ۔ میں تمہیں اپنے ساتھ اپنے گھر لے چلوں گی اور پھر ہم اطمینان سے باتیں کریں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' ماجدہ نے کہا۔ ''میں تمہیں اپنا گھر دکھا دیتی ہوں اور کل صبح دس بجے میں بوتیک پر آ جاؤں گی۔ ہاں پھر تمہارے گھر چلیں گے۔ پھر تم بھی کسی دن میرے گھر آ جانا۔''

ڈاکٹر ظہیر کی کار بوتیک کے باہر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ تینوں کار کے پاس پہنچے اور ڈاکٹر ظہیر نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ میمونہ اور ماجدہ پیچھے بیٹھ گئیں۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

ماجدہ کا گھر وہاں سے بہت زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ ظہیر کو راستہ بتاتی گئی اور وہ لوگ جلد ہی وہاں پہنچ گئے۔ میمونہ نے آہستہ سے ماجدہ کا ہاتھ دبایا۔ ''کل صبح دس بجے!''

''ہاں، کل صبح دس بجے۔'' ماجدہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

ہیجان اور اضطراب کے عالم میں ماجدہ کو اس رات ٹھیک سے نیند بھی نہیں آئی۔ میمونہ سے اچانک ملاقات نے اس کے دل و دماغ میں ایک تلاطم برپا کر دیا تھا۔ ماضی کے سارے بھولے بسرے دریچے ایک دم کھل گئے تھے۔ اگلے دن وہ ٹھیک دس بجے بوتیک پہنچ گئی۔ تقریباً اسی وقت میمونہ بھی وہاں آ گئی اور اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے آئی۔ وہ گھر میں اکیلی تھی۔

''جلدی سے بتاؤ میمونہ۔'' ماجدہ نے اضطراب کے عالم میں کہا۔ ''پہلے تم بتاؤ۔ اس وقت تم دونوں کہاں غائب ہوگئی تھیں اور پھر تمہارے ساتھ کیا ہوا؟''

''چلو، پہلے میں ہی سہی۔'' میمونہ نے کہا۔ اور اس نے اپنی داستان بیان کرنی شروع کی۔

''اس رات امینہ نے میمونہ اور فردوسی کو سوتے سے جگایا اور انہیں خاموشی سے کمرے سے باہر نکال لائی۔ ماجدہ کو اسی طرح سوتا چھوڑ دیا گیا۔ گھر کے باہر ایک گاڑی کھڑی ہوئی تھی جس میں کچھ آدمی پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ میمونہ اور فردوسی کو گاڑی میں بٹھا دیا گیا اور گاڑی وہاں سے روانہ ہوگئی۔ انہیں پچھلی سیٹ پر اس طرح بٹھایا گیا تھا کہ ایک ایک آدمی ان کے دونوں طرف موجود تھا۔ وہ دونوں سخت خوفزدہ تھیں اور رو رہی تھیں انہیں کچھ خبر نہیں تھی کہ اب ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جانے والا ہے۔ ماجدہ کی عدم موجودگی انہیں اور بھی زیادہ ہراساں کر رہی تھی۔

گاڑی میں اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے علاوہ دو اور آدمی بیٹھے ہوئے تھے اور پچھلی سیٹ پر بھی دو آدمی تھے۔ یہ دونوں آدمی اس طرح بیٹھے تھے کہ دونوں لڑکیاں ان کے درمیان میں بیٹھی تھیں۔ اب تک جو مختلف لوگ ان لڑکیوں کے ساتھ رہے تھے، اب ان میں سے کوئی بھی یہاں موجود نہ تھا۔ نہ امینہ تھی، نہ شاہ میاں اور نہ ممدو۔ وہ سب کے سب لوگ غائب ہو چکے تھے اور یہ پانچ اجنبی ایک بڑی سی گاڑی میں انہیں نہ جانے کہاں لے جا رہے تھے۔

امینہ، شاہ میاں، اور ممدو اگرچہ ان کے اپنے نہیں تھے، لیکن اتنے دنوں تک ساتھ رہنے کے باعث شناسائی کا ایک عنصر ضرور پیدا ہو چکا تھا۔ ان کی شکلیں ان لڑکیوں کے لیے جانی پہچانی تھیں اور وہ ان سے اپنی زبان میں بات کر سکتی تھیں۔ لیکن اب وہ جن لوگوں کے ساتھ جا رہی تھیں وہ ان کے لیے بالکل اجنبی تھے۔ ان لوگوں نے ان دونوں لڑکیوں سے ابھی تک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کوئی بات بھی نہیں کی تھی۔ اور لڑکیاں نہیں جانتی تھیں کہ وہ کون سی زبان بولتے ہیں۔

''ماجدہ نہ جانے کہاں رہ گئی۔'' میمونہ نے بھرائی ہوئی آواز میں فردوسی سے کہا۔ ''یہ لوگ صرف ہم دونوں کو لے کر جا رہے ہیں۔ ماجدہ کو ہمارے ساتھ کیوں نہیں بھیجا جا رہا ہے۔''

''معلوم نہیں۔'' فردوسی نے سخت مضطرب اور پُرتشویش لہجے میں کہا۔ ''اب تک تو ہم تینوں ساتھ تھے۔ اب پتہ نہیں ماجدہ کہاں رہ گئی..... تم..... ان لوگوں سے پوچھو..... تم ان کی زبان سمجھ سکتی ہو۔''

''معلوم نہیں۔'' میمونہ نے کہا۔ ''میں ہندی اور اردو تو سمجھ سکتی ہوں، لیکن یہ لوگ کوئی اور زبان بولتے ہیں۔ ابھی یہ آپس میں جس زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ ہندی یا اردو نہیں تھی۔ مجھے نہیں معلوم یہ کون سی زبان تھی۔''

''شاید..... یہ لوگ ہماری زبان سمجھ سکتے ہوں۔'' فردوسی نے خیال ظاہر کیا۔ ''ہم پہلے ان سے ہندی میں کیوں نہ بات کریں۔''

''یہ ہماری باتیں سن رہے ہیں لیکن سمجھ نہیں رہے۔'' میمونہ نے کہا۔ ''تم ان کے چہروں کو دیکھو کچھ نہیں سمجھ رہے ہیں۔ میں ان سے ہندی میں بات کر کے دیکھتی ہوں۔ تم اسے اردو کہہ لو۔ پاکستان میں تو ہندی کو اردو کہتے ہیں۔''

اس کے بعد میمونہ نے اپنے برابر بیٹھے ہوئے مرد سے مخاطب ہو کر اردو میں بولی۔

''ہمارے ساتھ ماجدہ بھی تھی..... وہ کہاں ہے؟''

''کون ماجدہ؟ اس شخص نے فوراً اردو میں جواب دیا اور میمونہ اور فردوسی۔ دونوں کو بہت اطمینان ہوا کہ وہ شخص اردو سمجھ سکتا تھا اور بول بھی سکتا تھا۔

''ماجدہ ہمارے ساتھ تھی۔'' میمونہ نے کہا۔ ''وہ بنگلہ دیش سے ہمارے ساتھ آئی تھی۔ ہم سب لوگ ساتھ تھے۔ مگر اب وہ ہمارے ساتھ نہیں ہے۔ وہ کہاں ہے؟ پلیز ہمیں اس کے بارے میں بتاؤ۔''

میمونہ ٹھہر ٹھہر کر اور سنبھل سنبھل کر اردو بول رہی تھی۔ اگرچہ اسے الفاظ تلاش کرنے اور جملے بنانے میں دقت پیش آ رہی تھی، تاہم وہ کوشش کر کے چھوٹے چھوٹے اور صحیح جملوں میں اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کی جدوجہد کر رہی تھی۔

''ماجدہ جہاں بھی ہوگی۔ خیریت سے ہوگی۔'' اس شخص نے اردو میں جواب دیا۔ جسے

میمونہ نے پوری طرح سمجھا۔ ''تم لوگوں کو اس کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جلد ہی وہ بھی تمہارے پاس آ جائے گی۔''

''لیکن ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' میمونہ نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے تشویش کے ساتھ کہا۔ ''امینہ چاچی..... شاہ میاں..... ممدو..... وہ سب کہاں ہیں؟ وہ ہمارے ساتھ کیوں نہیں ہیں؟''

''آ جائیں گے، آ جائیں گے۔'' ایک اور شخص نے اسے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ ''وہ تم کو چھوڑ کر بھلا کہاں جا سکتے ہیں۔''

میمونہ نے اب تک ہونے والی ساری گفتگو کی تفصیل بنگالی زبان میں فردوسی کو بتا دی۔

''مجھے لگتا ہے۔ اب ہم لوگ ماجدہ سے شاید ہی کبھی مل سکیں..... فردوسی نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''شاید ہمارے راستے الگ الگ کر دیئے گئے ہیں۔''

گزشتہ کچھ دنوں کے اندر پیش آنے والے واقعات نے ان دونوں بچیوں کے ذاتی تجربات و مشاہدات میں زبردست اضافہ کیا تھا اور وہ اچانک ہی اپنی عمر سے بڑی ہو گئی تھیں۔ ان کا معصوم اور سادہ لوح بچپن محض چند دن کے اندر اندر ان سے کافی دور چلا گیا تھا۔ ان کی سوچنے سمجھنے کی قوت میں یکبارگی بہت اضافہ ہو گیا تھا اور وہ دنیا کو ایک بالکل نئے زاویہ نگاہ سے دیکھنے لگی تھیں۔

ان کے ساتھ موجود مردوں نے ان سے مزید کوئی بات نہیں کی۔ وہ لوگ آپس میں ہی باتیں کر رہے تھے، لیکن ان کی زبان ہندی یا اردو نہیں تھی اور جس زبان میں وہ باتیں کر رہے تھے میمونہ اس سے بالکل واقف نہیں تھی اور فردوسی تو ہندی یا اردو سے بھی واقف نہیں تھی۔

ان کے چاروں طرف رات کا گہرا سناٹا اور تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ جس سڑک پر ان لوگوں کی گاڑی جا رہی تھی وہ اگرچہ ایک تنگ سی پختہ سڑک تھی، لیکن اس پر روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا اور وہ لوگ یہ سفر گاڑی کی تیز ہیڈ لائٹس میں ہی جاری رکھے ہوئے تھے۔

''ہماری قسمتوں میں بھی شاید خدا نے اتنا اندھیرا بھر دیا ہے جتنا کہ اس وقت ہمارے چاروں طرف ہے۔'' فردوسی نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''اس اندھیرے میں ہم نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتے پھریں گے۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''خدا رحم کرنے والا ہے۔'' میمونہ نے آہستہ سے کہا۔ ''وہ ضرور ہم پر رحم کرے گا.....''

''ہمارے مولوی صاحب کہتے تھے کہ خدا ان لوگوں کو سزا دیتا ہے جو گناہ کرتے ہیں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فردوسی نے جیسے اپنے خیالوں میں ڈوب کر کہا۔ ''میں نے تو کوئی گناہ نہیں کیا۔ میں تو جھوٹ بھی نہیں بولتی۔ کسی سے لڑائی بھی نہیں کرتی۔ پھر خدا مجھے کیوں سزا دے رہا ہے؟ کیا تم نے کبھی کوئی گناہ کیا ہے؟''

''معلوم نہیں۔'' میمونہ نے پُر خیال انداز میں جواب دیا۔ ''شاید کبھی کیا ہو۔ مجھے یاد نہیں آ رہا ہے۔''

دونوں کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئیں۔ دونوں اپنے اپنے الجھے ہوئے خیالات میں گم تھیں۔

انہیں اندھیرے میں بستی اور ویرانے کا کوئی اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ ان کی نظروں کے ساتھ صرف ایک تنگ، نیم پختہ سڑک تھی جس پر ان کی گاڑی بھاگی چلی جا رہی تھی اور صرف گاڑی کی روشنی میں ہی وہ اس سڑک کے سامنے والے حصے کو دیکھ لیتی تھیں جو تیزی کے ساتھ آگے کی جانب بھاگتا ہوا لگ رہا تھا۔ روشنی کی ایک چوڑی پٹی تھی۔ جو چاروں طرف پھیلے ہوئے گھور اندھیرے کے سمندر میں ایک متحرک روشن جزیرے کی حیثیت رکھتی تھی۔ روشنی کے اس جزیرے کے علاوہ اور جو کچھ بھی تھا۔ وہ صرف گاڑھے اندھیرے میں گم تھا۔ وہ دور دور تک روشنی کا کوئی نقطہ نظر نہیں آتا تھا۔ انہیں کچھ نہیں معلوم تھا کہ آس پاس کوئی آبادی ہے یا نہیں ہے۔''

وہ دونوں سوتے سے اٹھ کر آئی تھیں۔ کچی نیند سے اٹھی تھیں، لیکن اب نیند ان کی آنکھوں سے دور تھی۔ وہ چوکنی اور ہوشیار تھیں۔ ان دونوں کے ساتھ ایک ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا جو ان کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ گاڑی چلی جا رہی تھی اور انہیں وقت اور فاصلے کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔

اچانک رات کے گہرے سناٹے میں انہیں کسی پرندے کی آواز سنائی دی۔ چند لمحوں کے بعد اس کے جواب میں کسی دوسری طرف سے ایسی ہی ایک اور آواز بلند ہوئی۔ دونوں آوازیں گہرے سناٹے کو چیرتی چلی گئی تھیں۔ پھر آہستہ آہستہ کچھ اور پرندوں کی آوازوں کا بھی شور بلند ہونے لگا۔ پرندے ایک نئی صبح کی نوید دے رہے تھے۔ آس پاس ایک نئی زندگی طلوع ہو رہی تھی۔ فردوسی اور میمونہ کو ان آوازوں سے ایک نئی زندگی کا سراغ تو ضرور مل رہا تھا، لیکن رات کے اندھیرے میں ابھی تک کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔

پھر آہستہ آہستہ آسمان کے اس حصے پر جو انہیں گاڑی کے اندر اپنی نشستوں پر سے نظر آ

رہا تھا، سیاہی میں کمی ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ آسمان کا رنگ گہرے سیاہ کے بجائے ملگجا ہوتا جا رہا تھا..... پھر دھیرے دھیرے سپیدۂ سحری اس حد تک نمودار ہو گیا کہ اب وہ دونوں اپنے ارد گرد کے مناظر کو صاف طور پر دیکھ سکتی تھیں جو کہ ابھی ایک سرمئی غبار آلود چادر سی لپیٹے ہوئے لگ رہے تھے۔ ان کے دونوں طرف اونچے نیچے ٹیلے، جھاڑیاں اور درخت تھے اور ان درختوں کے پیچھے کہیں کہیں سے جھانکتے ہوئے کھیت نظر آ رہے تھے۔ کھیت ہرے بھرے تھے۔

اجالا آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا تھا اور آس پاس کے مناظر زیادہ صاف اور روشن ہوتے جا رہے تھے۔ اب کھیتوں کے دوسری طرف، دور کہیں کہیں دھواں اٹھتا بھی نظر آ رہا تھا، جو اس بات کی علامت تھا کہ وہاں انسانوں کی بستیوں میں زندگی کی سرگرمیوں کا آغاز ہو چکا ہے۔

بڑھتے ہوئے اجالے کے ساتھ ہی ان کی گاڑی ایک کچی سڑک کی جانب مڑ گئی۔ اب وہ اس سڑک کے دونوں کناروں پر دور دور تک پھیلی ہوئی انسانی آبادیوں کو دیکھ سکتی تھیں۔ سب سے پہلی آبادی جو انہیں نظر آئی وہ پھٹے پرانے خیموں پر مشتمل تھی۔ ان خیموں کے آگے انسانوں کے علاوہ جانور بھی نظر آ رہے تھے۔ کسی خیمے کے آگے عورتیں چولہے جلا کر کچھ پکانے میں مصروف تھیں۔ کسی خیمے کے آگے کوئی شخص کسی اور کام میں مصروف تھا۔ پھر بنجاروں کی یہ بستی پیچھے رہ گئی اور کچے پکے مکانوں والے گاؤں نظر آنے لگے۔

انہیں کئی گاؤں نظر آئے جنہیں وہ لوگ پیچھے چھوڑتے ہوئے آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔ بہت دیر کے بعد جب ہر طرف تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی منظر ایک دم بدل گیا۔ اب وہ جس بستی تک آ پہنچے تھے وہ کوئی گاؤں نہیں تھا۔ بڑی آبادی والا ایک شہر تھا۔ یہاں مختلف سمتوں میں جاتی ہوئی بہت سی سڑکیں نظر آ رہی تھیں جن میں جا بجا گلیاں تھیں اور سڑک کے کنارے اور گلیوں کے اندر مکانات تھے۔ سڑکوں پر اور گلیوں میں لوگ نظر آ رہے تھے۔ چہل پہل تھی۔ دکانیں کھلی ہوئی تھیں اور دکان دار اور خریدار، دونوں ہی اپنے اپنے کام میں پوری طرح مصروف نظر آ رہے تھے۔

ان کی گاڑی شہر کے ایک ایسے علاقے میں داخل ہو گئی جو بہت سی پُر پیچ گلیوں سے بھرا ہوا تھا۔ سڑک پر اور گلیوں میں بہت ساری دکانیں تھیں۔ لیکن عجیب بات تھی۔ یہاں کوئی دکان کھلی ہوئی نظر نہیں آ رہی تھی۔ حد یہ ہے کہ کسی دودھ والے کی دکان بھی کھلی ہوئی نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دکھائی دے رہی تھی۔ بازار میں بالکل سناٹا تھا۔ جبکہ اس کے برخلاف وہ اب تک شہر کے جن دوسرے حصوں سے گزر کر آئی تھیں۔ وہاں زندگی کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ وہ کافی کھلی تھیں اور لوگ اِدھر سے اُدھر آ جا رہے تھے۔ سواریاں چل رہی تھیں۔ اسکول جانے والے بچے، لڑکے اور لڑکیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ تو پھر شہر کے اس حصے میں ایسا سناٹا کیوں تھا۔

گاڑی ایک دومنزلہ مکان کے دروازے پر جا کر رک گئی۔ یہاں جتنے بھی مکان تھے وہ تقریباً سب کے سب دومنزلہ تھے اور ہر مکان کی بالائی منزل پر ایک گیلری ضرور موجود تھی۔ گیلریوں کے پیچھے بعض دروازوں پر پڑے ہوئے پردے بھی صاف نظر آ رہے تھے۔

گاڑی جس دروازے پر رکی تھی۔ وہ اندر سے بند نہیں تھا۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے آدمیوں میں سے ایک آدمی نیچے اترا اور اس نے دروازہ کھول دیا اس دروازے کے فوراً پیچھے سیڑھیاں تھیں اور جہاں سیڑھیاں ختم ہوتی تھیں وہاں ایک اور دروازہ تھا۔ وہ آدمی سیڑھیاں چڑھ کر اس دروازے تک پہنچا اور اس نے دستک دی۔ کئی بار زور زور سے دستک دینے کے بعد اندر سے دروازہ کھلا۔ فردوسی اپنی نشست پر سے اس منظر کو زیادہ واضح طور پر دیکھ سکتی تھی۔ دروازے کے پیچھے سے کوئی عمر رسیدہ عورت نمودار ہوئی تھی۔ اس عورت اور اس آدمی کے درمیان کچھ باتیں ہوئی تھیں اور پھر وہ عورت اس آدمی کے ساتھ نیچے آ گئی۔ تب ان دونوں لڑکیوں نے اس عورت کو دیکھا۔ وہ ایک ڈھلتی ہوئی عمر کی، بھاری بدن کی، لیکن خوبصورت عورت تھی۔ اس کا رنگ بھی بہت گورا تھا۔ اس عورت نے گاڑی کے قریب آ کر ان دونوں لڑکیوں کو غور سے دیکھا اور پھر ان مردوں سے اپنی زبان میں کچھ باتیں کرنے لگی جو میمونہ کے لیے ناقابلِ فہم تھیں۔

لڑکیوں کو گاڑی میں سے اتار دیا گیا۔ عورت نے انہیں اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

''جاؤ۔'' ان میں سے ایک آدمی نے اردو میں کہا۔ ''یہ الماس آپا ہیں۔ تمہارا بہت خیال رکھیں گی۔ ان کے ساتھ جاؤ۔ یہاں تم بہت آرام سے رہو گی۔''

''ہم لوگ اپنے گھر جانا چاہتے ہیں۔'' میمونہ نے رک رک کر اردو میں کہا۔ ''ہمیں ہمارے گھر بھیج دیجیے۔'' وہ رونے لگی اس کو روتا دیکھ کر فردوسی بھی رونے لگی۔ وہ ان لوگوں کی گفتگو کو نہ پورے طور سے نہیں سمجھ سکی تھی، لیکن دکھ کے اظہار کے لیے اور اس کو سمجھنے کے لیے ہمیشہ الفاظ کی ضرورت نہیں ہوتی۔

''ابھی تم کچھ دن میرے پاس رہو۔'' الماس نے نرمی سے کہا۔ ''پھر تمہیں تمہارے گھر

بھی بھجوا دیں گے۔ آؤ..... اب میرے ساتھ اندر آؤ.....''

اس نے دونوں لڑکیوں کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ دیا اور انہیں اوپر کی طرف لے جانے لگی۔ آدمیوں میں سے کوئی بھی ان کے ساتھ نہیں آیا..... وہ لوگ واپس چلے گئے اور الماس ان دونوں کو لے کر اوپر آ گئی..... اوپر آ کر اس نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔

دونوں لڑکیوں نے محسوس کیا کہ سارے مکان کے اندر اتنا گہرا سناٹا تھا جیسے یہاں کوئی بھی نہیں رہتا اور مکان بالکل خالی ہو۔

''وہ سامنے غسل خانہ ہے۔'' الماس نے ان دونوں سے کہا۔ ''تمہیں ہاتھ منہ دھونا ہو تو جلدی جلدی دھولو۔ پھر آرام کرو۔''

دونوں لڑکیاں باری باری جب غسل خانے سے نکل کر آئیں تو الماس انہیں ایک چھوٹے سے کمرے میں لے آئی۔ یہاں تک آنے کے دوران انہوں نے کئی کمروں کے کھلے ہوئے دروازوں سے کچھ لوگوں کو اندر سوتے ہوئے دیکھا۔ شاید وہ عورتیں تھیں۔

دونوں لڑکیوں کو ایسا لگ رہا تھا کہ الماس پوری طرح سے بیدار اور ہوشیار نہیں ہے۔ اس کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی معلوم ہوتی تھی اور وہ مضمحل لگ رہی تھی۔

وہ دونوں لڑکیوں کو اپنے ساتھ ایک چھوٹے سے کمرے میں لے آئی۔ جہاں زمین پر فرش بچھا ہوا تھا۔ یہاں کوئی چارپائی وغیرہ نہیں تھی۔ ایک طرف کچھ تکیے رکھے ہوئے تھے۔

''اب ہم تم دونوں یہاں لیٹ کر سو جاؤ۔'' اس نے ان سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''لمبا سفر کر کے آ رہی ہو۔ تھک گئی ہو گی۔ کچھ دیر آرام کر لو۔''

اس کے ساتھ ہی وہ کمرے سے باہر نکل گئی اور اس نے دروازہ باہر سے بند کر دیا۔

لڑکیوں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ اس نے باہر سے دروازے کو کنڈی لگا دی ہے۔

فردوسی اس کی باتیں نہیں سمجھ سکتی تھی۔ میمونہ نے اس کو بتایا کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔

''ناشتہ، چائے، کچھ نہیں؟'' فردوسی نے کہا۔ ''پتہ نہیں کیسے لوگ ہیں۔ کیا ہمیں بھوکا رکھیں گے؟''

''بھوکا نہیں رکھیں گے۔'' میمونہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''شاید وہ عورت دوبارہ سونے کے لیے چلی گئی ہے۔ تم نے دیکھا نہیں وہ کس قدر سوئی ہوئی لگ رہی تھی۔''

''اور ہم سے بھی کہہ کر گئی ہے کہ ہم آرام کریں۔'' فردوسی نے کہا۔

ان دونوں نے سونے کی کوشش کی، لیکن انہیں ایک پل کے لیے بھی نیند نہیں آئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دونوں سخت پریشان تھیں اور اس نئی افتاد کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر رہی تھیں جوان پر اچانک آن پڑی تھی۔

نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ کمرے کے باہر بالکل سناٹا تھا۔ کوئی ہلکی سی آواز بھی نہیں سنائی دے رہی تھی۔ شاید سونے والے ابھی تک سو رہے تھے اور ان میں سے کوئی بھی بیدار نہیں ہوا تھا۔

اس کمرے میں ایک کھڑکی تھی جس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ فردوسی نے اٹھ کر کھڑکی کا پردہ سرکایا۔ کھڑکی کے پٹ کھلے ہوئے تھے لیکن اس میں لوہے کی مضبوط سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ کھڑکی سے باہر سڑک کے کنارے دوسرے مکانات دکھائی دے رہے تھے۔ یہ دو منزلہ تھے اور ان سب میں گیلریاں تھیں۔ لیکن یہ سب گیلریاں بھی سنسان پڑی ہوئی تھیں کہیں کوئی شخص نظر نہیں آ رہا تھا۔ بعض مکانوں کے نچلے حصوں میں دکانیں تھیں۔ مگر وہ بند تھیں۔

''خدا جانے یہ کیسی گلی ہے۔'' فردوسی نے میمونہ سے مخاطب ہو کر کہا جو اٹھ کر اس کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی۔ ''ایسا لگتا ہے یہاں کوئی رہتا ہی نہیں ہے۔''

لیکن کچھ ہی دیر کے بعد انہیں معلوم ہو گیا کہ یہاں تو بہت لوگ رہتے ہیں۔ کسی نے کمرے کا دروازہ باہر سے کھولا۔ ایک عورت اندر آئی۔ وہ الماس نہیں تھی، بلکہ ایک خوبصورت نوجوان لڑکی تھی۔ وہ ان دونوں کی طرف دیکھ کر بڑے خوش گوار انداز میں مسکرائی۔

''آؤ..... اب چل کر کھانا کھا لو.....'' اس نے ان دونوں سے اردو میں کہا۔ میمونہ اس کی بات سمجھ رہی تھی۔ دونوں لڑکیاں اس کے ساتھ کمرے سے باہر آ گئیں۔ وہ لڑکی انہیں اپنے ساتھ ایک دوسرے کمرے میں لے آئی۔ یہاں الماس موجود تھی اور اس کے علاوہ چند اور عورتیں اور لڑکیاں بھی موجود تھیں۔ الماس اس وقت بالکل بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔ وہ بہت اچھے کپڑوں میں ملبوس، بڑی چاق و چوبند نظر آ رہی تھی۔ دونوں لڑکیوں کو دیکھ کر وہ مسکرائی۔

''اچھا تو تم میں سے فردوسی کون ہے اور میمونہ کون ہے۔'' اس نے پوچھا۔

اس کی بات سمجھنے والی صرف میمونہ تھی۔ اس نے اس کے سوال کا جواب دیا۔

کمرے میں ایک بڑی سی میز بچھی ہوئی تھی جس کے گرد کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ذرا دیر میں میز پر کھانا آ گیا۔ بہت سا کھانا تھا۔ کئی چیزیں تھیں۔ الماس نے دونوں لڑکیوں کو کھانے کی میز پر بلا لیا۔ دونوں لڑکیاں بہت بھوکی تھیں۔

''خوب اچھی طرح کھاؤ۔'' الماس نے ان دونوں سے کہا۔ ''یہاں کسی چیز کی کمی نہیں

ہے۔ تم لوگ تو بہت بھوکی ہو گی۔''

وہاں جو دوسری عورتیں موجود تھیں، وہ ان دونوں کو بڑی متجسس اور گہری نظروں سے دیکھ رہی تھیں اور آپس میں ان کے بارے میں شاید باتیں بھی کر رہی تھیں۔ ان کی زبان میمونہ کے لیے ناقابلِ فہم تھی۔

''لو یہ کباب کھاؤ۔'' اچانک ان خوبصورت اور جوان عورتوں میں سے ایک نے کبابوں کی پلیٹ میمونہ کی طرف بڑھاتے ہوئے اردو میں کہا۔ میمونہ اس کی بات فوراً سمجھ گئی۔ فردوسی نے بھی انداز سے اس کی بات سمجھ لی۔

کھانا بہت اچھا تھا اور وافر مقدار میں تھا لیکن دونوں لڑکیاں پریشان تھیں۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے تاہم ان دوسری عورتوں کے رویے میں انہیں اب تک کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی تھی جو انہیں خوفزدہ کرنے کا سبب بن سکے۔ ان سب لوگوں کا رویہ ان کے ساتھ مہربانی کا تھا۔

''تم دونوں بنگلہ دیش میں کہاں کی رہنے والی ہو؟'' کھانے کے بعد الماس نے ان سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ''ہمیں اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔''

''فردوسی اردو نہیں بول سکتی۔'' میمونہ نے الفاظ کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھاگتے ہوئے کہا۔ ''وہ آپ لوگوں سے بات نہیں کر سکتی۔ اس کے بارے میں بھی میں ہی آپ لوگوں کو بتاؤں گی۔''

''ہاں..... بتاؤ۔'' الماس نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ اور میمونہ اپنی اردو دانی کی تمام تر صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے، ان لوگوں کو اپنے اور فردوسی کے بارے میں بتانے لگی۔ وہ ساری عورتیں ان دونوں کے گرد جمع تھیں اور میمونہ کی باتوں کو بڑی توجہ اور دلچسپی کے ساتھ سن رہی تھیں۔ اپنے وطن سے نکلنے کے بعد پہلی بار انہیں کوئی ایسے لوگ ملے تھے جو ان سے براہِ راست ان کے بارے میں پوچھ رہے تھے اور ان کی ذات میں دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے۔ میمونہ کے لیے اتنے تسلسل کے ساتھ اردو بولنا کافی دشوار تھا۔ وہ بار بار الفاظ کی تلاش میں بھاگتے بھاگتے تھک جاتی تھی، لیکن پھر کسی نہ کسی طرح اپنا مافی الضمیر بیان کرنے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔ الماس سمیت ساری عورتوں میں سے کوئی بھی اس کی کچی اور خامیوں سے بھرپور زبان کا مذاق نہیں اڑا رہی تھی۔ ان سب کے چہروں پر سنجیدگی تھی اور وہ بڑی توجہ سے اس کی باتیں سن رہی تھیں۔ میمونہ نے اپنی تیسری ساتھی ماجدہ کا بھی ذکر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیا اور بتایا کہ اسے اور فردوسی کو اب ماجدہ کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہے۔

''ہم لوگ اپنے گھر واپس جانا چاہتے ہیں۔'' اپنی بات ختم کرنے کے بعد میمونہ نے رحم طلب نظروں سے الماس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ اچھے لوگ ہیں۔ ہمیں ہمارے گھر واپس پہنچوا دیجیے۔''

''تمہارا گھر تو اب بہت پیچھے رہ گیا ہے بیٹی!'' الماس نے قدرے توقف کے بعد بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس سے کہا۔ ''کچھ دنوں میں تم اس جگہ کو اپنا گھر سمجھنے لگو گی۔ اس کے لیے ابھی سے کوشش شروع کر دو۔''

میمونہ اس کی بات کا مطلب پوری طرح سے نہیں سمجھ سکی۔ لیکن اس نے مزید کچھ نہیں کہا۔

''اب تم لوگ اپنے کمرے میں جاؤ اور آرام کرو۔'' الماس نے ان سے کہا۔ ''اور گھبراؤ مت۔ یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

ایک لڑکی نے جس کا نام، جیسا کہ انہیں بعد میں معلوم ہوا، گلنار تھا، انہیں دوبارہ اسی کمرے میں پہنچا دیا۔

''یہ..... کون سی جگہ ہے؟'' میمونہ نے ہمت کر کے گلنار سے پوچھا۔ ''اور تم لوگ آپس میں کون سی زبان بولتی ہو؟ یہ اردو تو نہیں ہے۔''

''یہ اردو نہیں، یہ پنجابی ہے۔'' گلنار نے مسکرا کر کہا۔ ''تم اردو تو اچھی خاصی بول لیتی ہو۔ ہمارے ساتھ رہو گی تو پنجابی بھی سیکھ جاؤ گی۔ یہاں کی زبان پنجابی ہی ہے۔ مگر سارے ہی لوگ اردو پوری طرح سمجھتے اور بول سکتے ہیں۔''

پنجابی..... میمونہ کو اسکول کی درسی کتاب میں پاکستان کے بارے میں پڑھی ہوئی معلومات یاد آ گئیں۔ پاکستان میں چار صوبے ہیں جن میں سب سے بڑا صوبہ پنجاب ہے، جہاں پنجابی زبان بولی جاتی ہے..... تو اب وہ پنجاب میں تھی، پنجابی زبان بولنے والوں کے صوبے میں۔ مگر یہ لوگ تو اردو بھی اتنی ہی اچھی طرح بولتے تھے۔

گلنار کے جانے کے بعد وہ دونوں فرش پر لیٹ گئیں۔ پیٹ بھر کر کھانا کھا لینے کے بعد ان پر غنودگی طاری ہو رہی تھی اور آنکھیں خود بخود بند ہوئی جا رہی تھیں۔ پھر وہ بڑی دیر تک سوتی رہیں۔

پہلے فردوسی کی آنکھ کھلی اور اس کا پہلا احساس یہ تھا کہ دن کی پُراسرار خاموشی غائب ہو

چکی ہے اور نیچے گلی سے طرح طرح کے شور کی ملی جلی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ یہ کچھ عجیب قسم کی آوازیں تھیں۔ ان میں کچھ طبلوں کی آوازیں بھی شامل معلوم ہوتی تھیں۔ اس نے میمونہ کو بھی جگا دیا اور پھر وہ دونوں آ کر کھڑکی میں کھڑی ہو گئیں۔ باہر کا منظر تو اب بالکل ہی بدل چکا تھا۔ گلی میں بہت سے لوگ چل پھر رہے تھے۔ جتنی بھی دکانیں تھیں۔ وہ سب کھل چکی تھیں اور ان میں دکان دار اور گاہک موجود تھے۔ ان کے بالکل سامنے جو مکان تھا اس کی بالائی منزل کی گیلری میں دو نوجوان عورتیں کھڑی ہوئی تھیں جو خوب بنی ٹھنی تھیں۔ آس پاس کی کئی گیلریوں میں ایسی ہی بنی ٹھنی عورتیں نظر آ رہی تھیں اور ان کے پیچھے موجود کمروں میں سے طبلے کی بے ترتیب آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ نیچے سے گزرنے والے لوگ گیلریوں میں کھڑی ہوئی عورتوں کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے اور اشارے کر رہے تھے۔ عورتیں بھی جواباً مسکرا رہی تھیں۔

فردوسی اور میمونہ کے لیے یہ سب کچھ بہت ہی حیرت انگیز اور نیا تھا۔ وہ کم سن لڑکیاں تھیں اور عورت کے اس روپ سے واقف نہیں تھیں۔ ان کے گاؤں میں اس قسم کی کوئی جگہ وجود نہیں رکھتی تھی۔ لیکن وہ اس قسم کے معاملات سے بالکل نابلد بھی نہیں تھیں اور انہوں نے اس قسم کی جگہوں کے بارے میں سن رکھا تھا۔ دونوں ہی کے گاؤں میں بعض ایسی عورتیں موجود تھیں جن کے بارے میں کچھ ایسی باتیں مشہور تھیں جو ناپسندیدہ تھیں۔ لڑکیوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ ان باتوں کا تعلق مردوں سے تھا۔ اب وہ اس قسم کی بہت سی عورتوں کو یہ ''ناپسندیدہ'' حرکات کرتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ وہ اب عمر کے اس حصے میں تھیں جہاں ہر لڑکی جنسی معاملات کے بارے میں ابتدائی آگاہی حاصل کر لیتی ہے۔

میمونہ نے فردوسی سے پوچھا۔ ''یہ عورتیں گیلریوں میں کھڑی ہوئی کیا کر رہی ہیں؟''

''یہ عورتیں شاید گانے بجانے کا کام کرتی ہیں۔'' فردوسی نے کہا۔

اس وقت گلنار ان کے کمرے میں داخل ہوئی۔ گلنار کا حلیہ اس وقت اس قدر بدلا ہوا تھا کہ وہ ایک نظر میں اسے پہچان بھی نہ سکیں۔ اس نے بہت عمدہ اور خوب بھڑکیلا لباس پہن رکھا تھا اور بہت میک اَپ کر رکھا تھا۔ اس کے بال بالکل نئے طریقے سے بنے ہوئے تھے جو بہت اچھے لگ رہے تھے۔ دونوں لڑکیاں گلنار کی اس خوبصورتی کو دیکھ کر دنگ رہ گئیں۔ انہیں گلنار کا یہ نیا روپ بہت اچھا لگا۔ مگر اس کے ساتھ ہی ان کے دلوں میں گلنار کی طرف سے ایک خوف آمیز تجسس بھی تھا۔ گلنار نے یہ سب کچھ کیوں کیا تھا؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''میں تمہیں کیسی لگ رہی ہوں؟'' گلنار نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔ اس کی بات صرف میمونہ سمجھ سکتی تھی۔

''بہت اچھی۔'' میمونہ نے آہستہ سے جواب دیا اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کے علاوہ اور کیا کہے۔

ذرا سی دیر کے بعد انہوں نے دیکھا کہ صرف گلنار ہی نہیں بلکہ دوسری عورتیں بھی بالکل نئے حلیے میں نظر آ رہی تھیں۔ وہ سب کی سب بہت اچھے اچھے کپڑوں میں ملبوس تھیں اور انہوں نے بہت سے زیور بھی پہن رکھے تھے۔

جیسے جیسے شام ڈھلتی گئی۔ ویسے ویسے اس جگہ کی رونق میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ یہ سارا منظر نامہ ہی بالکل بدل گیا۔ اب تو یہ جگہ پہچانی نہیں جاتی تھی۔

کوٹھے پر مردوں کی آمد شروع ہو گئی اور پھر دوسرے کمرے سے طبلے کی تھاپ، گھنگروؤں کی جھنکار اور عورتوں کے گانے کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ آوازیں صرف الماس کے کوٹھے پر ہی نہیں گونج رہی تھیں، بلکہ آس پاس کے تقریباً تمام کوٹھوں سے یہ آوازیں آ رہی تھیں۔

دونوں لڑکیاں دم بخود یہ منظر دیکھ رہی تھیں اور اس صورتِ حال کی ساری باریکیوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

وہ رات ان دونوں بچیوں کی زندگی کی ایک یادگار رات تھی۔ اس رات انہوں نے ایک ہی جست میں بہت لمبا سفر طے کر لیا۔ وہ ان بہت سارے معاشرتی اسرار و رموز سے واقف ہو گئیں جن کے بارے میں اب تک ان کا علم نہ ہونے کے برابر تھا۔ کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے اندر جو عورت چھپی بیٹھی تھی، وہ خود ہی انہیں سب کچھ بتا رہی تھی۔

ایک ہی رات میں ان کے مشاہدے اور تجربے میں زبردست اضافہ ہو چکا تھا۔

رات کو نہ جانے کب تک کیا کچھ ہوتا رہا۔ الماس نے آ کر ان دونوں سے کہا تھا کہ وہ سو جائیں۔ وہ دونوں اس کمرے میں تھیں اور الماس نے ان کو سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ وہ بلا ضرورت اپنے کمرے سے باہر نہ نکلیں۔

اگلے دن وہ دونوں صبح کو اگرچہ خاصی دیر سے بیدار ہوئیں مگر اس رات بھی سارے گھر میں ہی نہیں، سارے علاقے میں سناٹا تھا، ایسا ہی سناٹا جیسا کل اس وقت تھا جس دن انہیں یہاں لایا گیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ منہ دھونے کے لیے کمرے سے نکلیں تو انہوں نے دیکھا کہ

زینے کی طرف کھلنے والے دروازے میں ایک بڑا سا تالہ لگا ہوا تھا۔ انہیں کئی جگہ زمین پر گرے ہوئے اور مسلے ہوئے پھول اور ہار بھی نظر آئے۔

دونوں واپس اپنے کمرے میں آ گئیں اور پھر جاگتی رہیں، یہاں تک کہ دوپہر ہو گئی اور دوپہر سے ذرا پہلے ہی گھر میں کاروبارِ زندگی شروع ہو گیا۔

چند روز میں ہی لڑکیوں کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا کہ وہ کس جگہ آن پہنچی ہیں اور یہاں کیا دھندہ ہوتا ہے۔ انہیں اب یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ یہاں سے بھاگ بھی نہیں سکتی تھیں۔ اول تو یہ تقریباً ناممکن تھا۔ گھر میں عورتوں کے علاوہ دو مرد بھی رہتے تھے جو کوٹھے کی پوری طرح نگرانی کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ اگر وہ بھاگنے میں کامیاب ہو بھی جاتیں تو کہاں جاتیں؟ ان کے لیے یہ ایک اجنبی جگہ تھی جہاں کے لوگ اجنبی زبانیں بولتے تھے۔ وہ کسی سے ٹھیک سے بات بھی نہیں کر سکتی تھیں۔

اس روز دوپہر کے کھانے کے بعد الماس نے ان دونوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''بنگالی لوگ تو گانے بجانے کے بہت شوقین ہوتے ہیں۔ تم دونوں کو گانا آتا ہے؟''

''مجھے زیادہ نہیں، لیکن فردوسی کو بہت اچھا گانا آتا ہے۔'' میمونہ نے کہا۔ ''لیکن وہ صرف بنگالی زبان کے گانے ہی گا سکتی ہے۔''

''ہاں ہاں تو کیا ہوا؟'' الماس نے جلد ہی کہا۔ ''اس سے کہو کہ ہمیں بنگلہ زبان کا کوئی گانا سنائے۔''

فردوسی کو بنگالی کے بہت سے گیت آتے تھے جنہیں وہ اپنے وطن میں دوسری لڑکیوں کے ساتھ مل کر گایا کرتی تھی۔ قدرت نے اس کو بہت اچھا گلا دیا تھا۔ میمونہ نے الماس کی بات اس تک پہنچا دی اور فردوسی نے گانا شروع کر دیا۔ وہ ایک ایسے مانجھی کا گیت تھا جو اپنی کشتی میں اپنے گاؤں سے بہت دور چلا آیا ہے اور اپنی محبوبہ کو یاد کر کے اداس ہو رہا ہے اور جلد واپسی کی آرزو کر رہا ہے۔ گیت کے بول تو وہاں موجود لوگوں میں سے کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے لیکن فردوسی کی آواز اور بے حد خوبصورت نغمگی نے ایک سماں باندھ دیا۔ سب عورتیں دم بخود فردوسی کا گیت سن رہی تھیں۔

''واہ واہ..... واہ.....'' گیت کے ختم ہونے پر الماس نے نہایت پُرمسرت لہجے میں کہا۔ ''ہمارے کوٹھے پر آج تک کوئی بنگالی گیت نہیں گایا گیا۔ فردوسی وہ پہلی لڑکی ہے جس نے بنگالی گیت سنایا اور ہمارا جی خوش کر دیا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس سے اگلے ہی دن استاد محبوب خاں نے دونوں بنگالی لڑکیوں کو گانا سکھانا شروع کر دیا۔ دن میں کئی کئی گھنٹے ان سے ریاض کروایا جاتا۔ وہ گانا بھی سیکھ رہی تھیں زبانیں بھی سمجھتی جا رہی تھیں۔

ایک ہی نغمے کے بعد فردوسی کو خوب سجا بنا کر شام کے وقت گانے کی محفل میں شریک کیا گیا۔ اس نے بنگالی میں دو گیت گائے۔ سازندوں نے بھی اس کا خوب ساتھ دیا اور تماش بینوں نے کافی رقم لٹائی۔ الماس کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔

ایک ہفتے کے بعد میمونہ کو بھی اس محفل میں شامل کر دیا گیا تھا۔ آواز تو اس کی بھی بہت اچھی تھی اور استاد نے مشق کرا کے اسے بھی اچھا خاصہ گانا سکھا دیا تھا۔ اب وہ دونوں ہی لڑکیاں شام کو تماشائیوں کے سامنے بنگالی گانے گاتیں۔ وہ اب سازوں کے ساتھ بہت اچھا گا سکتی تھیں۔ حاضرین ان کے گانے سے بہت محظوظ ہوتے تھے۔ یہ ان کے لیے ایک بالکل نئی چیز تھی۔

''جلد ہی تم دونوں کو ناچ سکھانے کا بھی بندوبست کر دوں گی۔'' ایک رات الماس نے ان دونوں سے کہا۔ میمونہ تو پہلے ہی اس کی بات سمجھ لیتی تھی۔ اب تو فردوسی بھی اردو اور پنجابی کے کافی الفاظ سیکھ گئی تھی۔

چند دنوں کے بعد ایک استاد دونوں بچیوں کو ناچ سکھانے کے لیے آنے لگا۔ اب انہیں موسیقی کے ساتھ رقص کی بھی تعلیم دی جا رہی تھی۔

انہیں وہاں رہتے ہوئے کوئی دو ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس عرصے کے دوران وہ اس ماحول کی عادی ہو گئی تھیں اور ان کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اسی فضا اور اسی زندگی کا ایک حصہ بن جاتیں۔ اپنے تمام تر صدمات، محرومیوں اور دکھ درد کے باوجود وہ خود بخود، میکانکی انداز میں اس نئی زندگی میں ڈھلتی جا رہی تھیں۔ انہوں نے ابھی تماش بینوں کے سامنے آ کر ناچنا شروع نہیں کیا تھا۔ وہ ابھی ناچ کی تعلیم حاصل کر رہی تھیں اور اس کی مشق کرتی رہتی تھیں۔ انہیں یہاں رہنے سہنے کی، کھانے پینے کی کوئی تکلیف نہیں تھی۔ یہاں بے حد عمدہ، مہنگے اور لذیذ کھانے کھائے جاتے تھے اور ان دونوں کو بھی ان میں برابر کا شریک کیا جاتا تھا۔ اتنے اچھے کھانے اور اتنی وافر مقدار میں انہوں نے اس سے پہلے کبھی نہیں کھائے تھے۔ پھل وغیرہ بھی کافی آتے تھے۔ ان کے لیے نئے نئے اور عمدہ لباس تیار کروائے گئے تھے۔ اتنے قیمتی کپڑے تو انہوں نے پہلے کبھی نہیں پہنے تھے۔

دو ماہ کے بعد ایک دن وہاں دو عورتیں، ایک آدمی کے ساتھ آئیں۔ ان میں سے ایک عورت تو تقریباً الماس کی ہم عمر تھی اور دوسری کوئی بیس بائیس برس کی جوان عورت تھی۔ ایک آدمی بھی ان کے ساتھ آیا تھا۔ وہ درمیانہ عمر کا بہت مضبوط قد کاٹھ کا آدمی تھا۔ الماس نے ان تینوں کو میمونہ اور فردوسی سے بھی ملوایا۔ کوٹھے کے دیگر لوگ تو ان آنے والوں کو پہلے سے ہی جانتے تھے۔

''یہ الماس آپا کی بہن ہیں۔'' گلنار نے فردوسی اور میمونہ کو بتایا۔ ''ان کا نام گوہر ہے اور ان کے ساتھ ان کی بیٹی زمرد ہے..... یہ لوگ لاہور میں رہتے ہیں۔ چند روز کے لیے یہاں مہمان ہیں۔''

''اور ان کے ساتھ جو آدمی ہے وہ کون ہے؟'' میمونہ نے گلنار سے پوچھا۔

''یہ الماس آپا اور گوہر آپا کا بھائی ہے۔'' گلنار نے جواب دیا۔ ''اس کا نام دولت خاں ہے۔ یہ زمرد کا ماموں ہے۔''

''اور زمرد کا باپ؟'' فردوسی کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ فردوسی اب اتنی اردو تو بول سکتی تھی۔

''باپ؟'' گلنار زور سے ہنسی۔ ''باپ کا کیا معلوم؟ کیا پتہ کہاں ہوگا۔''

گوہر اور زمرد نے دونوں لڑکیوں سے موسیقی کی دھن پر بنگالی گانے سنے اور ان گانوں کا ایک لفظ بھی سمجھے بغیر محض آواز، دھن، ترنم اور نغمگی کی بنیاد پر انہیں بے حد پسند کیا۔ دونوں ماں بیٹیاں بار بار ان سے گانے کی فرمائش کرتی تھیں اور ان کے گانوں کے غیر معمولی سحر میں گرفتار ہو کر جیسے ساری دنیا سے بے خبر ہو جاتی تھیں۔

''اب تم لوگ لاہور جانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' الماس نے اس روز میمونہ اور فردوسی سے کہا۔ ''میری بہن کو تم دونوں بہت پسند آ گئی ہو اور وہ تم کو اپنے ساتھ لاہور لے جانا چاہتی ہیں۔''

''بڑی خوش قسمت ہو تم دونوں کہ تمہیں لاہور جانے کا موقع مل رہا ہے۔'' گلنار نے کہا جو کہ الماس کے ساتھ موجود تھی۔ ''لاہور تو شہروں کا شہر ہے اور لوگ لاہور جانے کے لیے ترستے ہیں۔''

میمونہ نے لاہور کا نام سنا اور پڑھا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ لاہور پاکستان کا دوسرا سب سے بڑا شہر ہے اور پاکستان کے صوبے پنجاب میں واقع ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''لاہور تمہارے اس شہر سے بہت زیادہ بڑا شہر ہے۔'' زمرد نے ہنستے ہوئے میمونہ سے کہا۔ جس کے ساتھ اردو میں اس کی بات چیت ہو جاتی تھی۔ ''لاہور میں جو ہمارا علاقہ ہے، وہاں اور بھی کئی بنگالی لڑکیاں ہیں۔''

میمونہ اب اس بات کو اچھی طرح سمجھتی تھی کہ ان لوگوں کا علاقہ کون سا ہوگا اور اس کی کیا خصوصیت ہوگی۔

گلنار نے چپکے سے میمونہ کو بتایا کہ الماس آپا بھاری رقم کے عوض ان دونوں کو اپنی بہن گوہر کے حوالے کر رہی ہیں اور اب یہ دونوں لاہور میں گوہر کے کوٹھے پر رہیں گی۔

وہ دونوں اب بہت کچھ سمجھ چکی تھیں اور مزید سمجھتی جا رہی تھیں۔ انہیں ان کے وطن سے پکڑے جانے کے بعد سے اب تک، نہ معلوم کتنے لوگ ان کے بدلے میں کتنی کتنی رقم حاصل کر چکے تھے اور نہ جانے کتنے لوگ کتنی مزید رقم حاصل کرنے والے تھے۔ امینہ اور شاہ میاں سے لے کر گوہر تک کتنے لوگ تھے جو مال تجارت کی طرح ان کا سودا کرتے چلے آئے تھے۔

گوہر، زمرد اور دولت خاں نے وہاں چند روز قیام کیا اور اس کے بعد یہ وہاں سے لاہور کے لیے روانہ ہو گئے۔

''دیکھو گوہر آپا کو اپنی ماں کی جگہ سمجھنا۔''

الماس نے دونوں لڑکیوں کو رخصت کرتے وقت انہیں نصیحت کی۔ ''ان کے ساتھ رہو گی تو عیش کرو گی۔ تمہیں دنیا کی ہر نعمت ملے گی۔ شہزادیوں کی طرح زندگی گزارو گی۔''

دونوں لڑکیوں کا اپنے گھر واپس جانے کا خواب آہستہ آہستہ دھندلا پڑتا جا رہا تھا۔ امید کے ستارے ایک ایک کر کے ڈوبتے جا رہے تھے۔ زندگی نے ان کو ایسی اجنبی شاہراہوں پر دھکیل دیا تھا جن کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھیں۔

لاہور میں گوہر کا بالا خانہ، پنجاب کے ایک چھوٹے شہر کے الماس کے بالا خانے کے مقابلے میں کافی بڑا تھا۔ یہاں لڑکیوں کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ گوہر یہاں گوہر آپا کہلاتی تھی اور اس قلم رو کی اس طرح حاکم تھی جس طرح اس کی بہن الماس اپنے بالا خانے کی قلم رو کی حاکم تھی۔

میمونہ اور فردوسی جب لاہور میں گوہر کے بالا خانے پر پہنچیں تو وہاں ایک حیرت انگیز خوشی بھی ان کی منتظر تھی۔

گوہر کے بالا خانے میں ایک درمیانہ عمر کی ایسی عورت موجود تھی جو بنگالی بہت اچھی

طرح بول سکتی تھی۔ اس عورت کا نام ناصرہ تھا اور بنگلہ دیش بننے سے پہلے وہ ڈھاکہ کے محلہ میر پور میں رہتی تھی۔ ناصرہ کے والدین کا تعلق ہندوستان کے صوبے بہار سے تھا اور اس کا خانہ ان تقسیم ملک کے وقت ہجرت کر کے ڈھاکہ آ گیا تھا۔ ناصرہ ڈھاکہ میں ہی پیدا ہوئی تھی۔ اس کا شوہر منیر رکشہ چلاتا تھا۔ 1971ء کے ہنگاموں کے دوران منیر اور اس کا بیٹا مارے گئے۔ دور کے ایک رشتے دار غلام حسین نے ناصرہ کی مدد کی اور وہ اسے اپنے ساتھ لے کر کراچی آ گیا جہاں اس کے کچھ رشتے دار موجود تھے۔ منیر اور ناصرہ ان لوگوں کے ساتھ رہنے لگے لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد منیر کا اچانک بیماری سے انتقال ہو گیا۔ ناصرہ نے ایک فیکٹری میں نوکری کر لی۔ وہاں ایک سپروائزر اسے شادی کا جھانسہ دے کر لاہور لے آیا اور پھر اسے جسم فروشی کے بازار میں فروخت کر کے غائب ہو گیا۔ تب سے ناصرہ اس دنیا کا ایک حصہ بن گئی تھی۔ اس کی مادری زبان تو اردو تھی، لیکن وہ بہترین بنگالی بولتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ پنجابی بھی بہت اچھی طرح بولتی تھی۔

میمونہ اور فردوسی کو پاکستان کی سرزمین پر ایک پہلی ایسی ہستی ملی تھی جو ان کی زبان بول سکتی تھی۔ فردوسی کے لیے تو یہ بہت ہی زیادہ اطمینان کی بات تھی۔ اسے تو جیسے نئے سرے سے زبان مل گئی تھی۔

ان دونوں لڑکیوں کے لیے اب ناصرہ کی مدد سے کسی بھی شخص سے گفتگو کرنا بہت آسان ہو گیا تھا۔ ویسے وہ دونوں اردو اور پنجابی بھی بڑی تیزی کے ساتھ سیکھ رہی تھیں۔ میمونہ تو پہلے سے تھوڑی بہت اردو جانتی تھی اور اب اس میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

گوہر کے کوٹھے پر پہنچنے کے بعد دونوں لڑکیوں کی رقص اور موسیقی کی تعلیم کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ یہاں دوسرے لوگ تھے، لیکن کاروبار وہی تھا۔ کاروبار کے تقاضے اور ضروریات وہی تھیں۔ صرف چہرے بدلے ہوئے تھے۔ باقی تو سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا کہ اس سے پہلے والے شہر میں تھا۔

دونوں لڑکیاں محفلوں میں گانے گاتی تھیں۔ اگرچہ وہ زیادہ تر تو بنگالی گیت ہی گاتی تھیں لیکن اب انہوں نے اردو اور پنجابی کے بھی کئی گانے سیکھ لیے تھے اور انہیں بڑی عمدگی کے ساتھ گاتی تھیں۔

چند ماہ کے بعد گوہر نے ان سے تماش بینوں کے ساتھ رقص بھی کروانا شروع کر دیا۔ وہ رقص میں اچھی خاصی مہارت حاصل کر چکی تھیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیکھتے ہی دیکھتے ایک سال کا عرصہ گزر گیا۔ وہ دونوں اب گوہر کے کوٹھے کا ایک حصہ بن چکی تھیں اور وہ وقت اب زیادہ دور نہیں تھا جب انہیں گاہکوں کے بستر کی زینت بننے کا فریضہ بھی سونپا جانے والا تھا۔ دونوں لڑکیاں تیزی سے جوان ہو رہی تھیں اور کوٹھے پر آنے والے مردوں کی بھوکی اور متجسس نگاہوں نے ان کے جسموں کے نمایاں ہوتے ہوئے نشیب، فراز کو ٹٹولنا شروع کر دیا تھا۔

اس روز میمونہ محفل میں بنگالی کا ایک گیت گا رہی تھی اور اس نے حاضرین کو مسحور کر دیا تھا۔ وہ اس گیت کا مطلب تو نہیں سمجھ سکتے تھے، لیکن میمونہ کی آواز کی نغمگی اور گیت کی غنائیت ان کے دلوں کو چھو رہی تھی۔ اس روز حاضرین میں ایک ایسا شخص بھی تھا جو اس محفل میں پہلی بار آیا تھا اور اس گیت کو پورے طور سے سمجھ سکتا تھا۔ اس آدمی کا نام راحت علی تھا اور وہ ایک ریٹائرڈ سرکاری افسر تھا۔ میمونہ کو دیکھ کر اور اس کی زبان سے بنگالی کا گیت سن کر راحت علی کے دل کی عجیب کیفیت ہو گئی۔

راحت علی حکومتِ پاکستان کا ملازم تھا۔ 1971ء میں جب مشرقی پاکستان میں بغاوت رُونما ہوئی تو مغربی پاکستان سے بہت سے بنگالی مشرقی پاکستان چلے گئے۔ ان میں بہت سے سرکاری ملازمین بھی شامل تھے جنہوں نے بنگلہ دیش کی حکومت کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا اور وہ یہاں سے چلے گئے تھے۔ راحت علی اس وقت لاہور میں تھا اور اس نے یہیں رہنے کا فیصلہ کیا۔

اس کے ریٹائرمنٹ میں ابھی کئی سال باقی تھے۔ اس کی بیوی کا برسوں پہلے انتقال ہو گیا تھا اور وہ اپنی بیٹی شاہدہ کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی ماں ان لوگوں کے ساتھ رہتی تھی۔ شاہدہ کراچی میں پیدا ہوئی تھی اور اس کی ابتدائی تعلیم و تربیت کراچی میں ہوئی تھی۔ پھر راحت علی کا تبادلہ لاہور ہو گیا تھا اور وہ اپنے خاندان کے ساتھ لاہور آ گیا تھا۔

بیوی کے انتقال کے بعد راحت علی نے اپنی ماں کے اصرار کے باوجود دوسری شادی نہیں کی۔ اسے شاہدہ دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز تھی اور وہ اسے سوتیلی ماں کا دکھ نہیں دینا چاہتا تھا۔ راحت علی نے اپنی ساری محبتیں اپنی بیٹی کے لیے وقف کر دی تھیں۔

لیکن راحت علی کے صدمات کا عالم ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ شاہدہ کی عمر ابھی نو سال کی تھی کہ وہ مستقل بیمار رہنے لگی۔ تفصیلی میڈیکل چیک اَپ کے نتیجے میں یہ انکشاف ہوا کہ وہ خون کے سرطان میں مبتلا ہے۔

راحت علی نے لاہور سے لے کر اسلام آباد اور کراچی تک کے کتنے ہی بڑے بڑے ڈاکٹروں سے شاہدہ کا علاج کروایا۔ یہ سلسلہ کوئی ڈیڑھ سال تک جاری رہا۔ لیکن موت تو شاہدہ کا انتخاب کر چکی تھی اور اس نے اس کو نہیں چھوڑا۔ شاہدہ ایک دن چپکے سے اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ شاہدہ کی ناوقت موت کے باعث راحت علی کا دل دنیا سے اچاٹ ہو گیا۔ ایک دو بار اس نے سوچا کہ وہ بنگلہ دیش چلا جائے۔ جہاں اس کے عزیز اور دوست وغیرہ موجود تھے۔ لیکن جب شاہدہ بھی موجود نہیں تھی تو پھر کسی اور عزیز یا دوست سے کیا لینا۔ اس نے یہیں رہنے کا فیصلہ کیا۔

اپنا غم غلط کرنے کی غرض سے کبھی کبھار بھولے بھٹکے، وہ کسی کوٹھے پر رقص و سرود کی محفل میں چلا جاتا تھا اور کچھ دیر وہاں بیٹھ کر واپس چلا آتا تھا۔ اس دن بھی وہ اپنی غم ناک کیفیت میں گوہر کے کوٹھے پر آیا تھا اور یہاں اس نے ایک ایسا منظر دیکھا کہ حیرت اور بے چینی کے عالم میں اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

اس کی نظروں کے سامنے اس کی بیٹی شاہدہ موجود تھی اور اپنی بے حد میٹھی اور سریلی آواز میں ایک مقبول اور مشہور بنگالی گیت گا رہی تھی۔ وہی عمر، وہی شکل وصورت، ویسا ہی جسم اور قد و قامت اور حتیٰ کہ وہی آواز..... راحت علی کے سامنے اس کی مرحوم بیٹی کا مکمل عکس موجود تھا۔

راحت علی کو ایسا لگا جیسے اس کا دل پگھل کر آنکھوں کے راستے بہہ جائے گا۔ اس کی مرحوم بیٹی کی یہ تصویر کہاں سے آ گئی تھی؟

جب میمونہ نے گیت ختم کیا تو راحت علی جیسے خواب سے چونک پڑا۔ میمونہ جھک جھک کر حاضرین کو سلام کر رہی تھی اور لوگ اس پر روپے نچھاور کر رہے تھے۔

محفل کے اختتام پر راحت علی نے کوٹھے کی مالکہ گوہر کو الگ بلا کر اس سے بات کی وہ اس بنگالی لڑکی کے بارے میں جاننا چاہتا ہے۔

گوہر پہلے تو اس بارے میں کوئی بات کرنے کو ہی تیار نہیں ہوئی لیکن جب راحت علی اسے یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا کہ اس کا تعلق پولیس یا سی آئی ڈی وغیرہ سے نہیں ہے تو گوہر نے اسے صرف یہ بتایا کہ میمونہ ایک بنگلہ دیشی لڑکی ہے جسے کوئی شخص بنگلہ دیش سے لے کر آیا تھا اور یہاں بیچ گیا۔ گوہر نے اپنی بہن الماس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

''تم نے اس کو جتنے میں خریدا تھا میں اس سے زیادہ رقم دینے کے لیے تیار ہوں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

راحت علی نے گوہر سے کہا۔ ''اس لڑکی کو میرے ہاتھ بیچ دو۔''

''آپ کو انتظار کرنا پڑے گا صاحب جی.....'' گوہر نے شوخ اور معنی خیز نظروں سے راحت علی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کے جوان ہونے میں ابھی کچھ وقت لگے گا..... ویسے..... بہت زیادہ دیر بھی نہیں ہے.....''

''تم بالکل غلط سمجھ رہی ہو گوہر بیگم۔'' راحت علی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں اس لڑکی کو اپنی بیٹی بنا کر رکھنا چاہتا ہوں۔ یہ میری مرحوم بیٹی کی بالکل ہم شکل ہے۔ میری بیٹی جب مری تھی تو اس کی اتنی ہی عمر تھی جتنی کہ اس لڑکی کی عمر ہے۔ اس بیٹی کے علاوہ میری اور کوئی اولاد نہیں تھی.....''

گوہر کا رویہ ایک دم بدل گیا۔ ''آپ سچ کہہ رہے ہیں صاحب جی؟'' اس نے گہری متانت کے ساتھ کہا۔ ''آپ اس کو بیٹی بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔''

''ہاں گوہر بیگم۔'' راحت علی نے کہا۔ ''مجھے قسم ہے اپنے رب کی۔ میں اسے اپنی بیٹی کی طرح رکھوں گا۔''

''پھر لے جایئے صاحب جی.....'' گوہر نے کہا۔ ''ہم لوگ تو کنجر ہیں۔ ہمارے پاس تو جو بھی لڑکی رہے گی، وہ کنجری ہی بنے گی..... اور کچھ نہیں بن سکتی۔ آپ اسے شریفوں کی زندگی دینا چاہتے ہیں تو ضرور دیجیے۔ مگر صاحب جی..... میں نے..... میں نے اس کے لیے رقم ادا کی ہے.....''

''میں جانتا ہوں۔'' راحت علی نے کہا۔ ''بتاؤ تم اس لڑکی کے عوض کتنی رقم چاہتی ہو؟''

''صرف اتنی ہی، جتنی کہ میں نے اس کے عوض خود ادا کی ہے.....'' گوہر نے کہا۔ ''مجھے کوئی منافع نہیں چاہیے۔ اس پر میں نے اب تک جو کچھ خرچ کیا وہ بھی میں آپ سے نہیں لوں گی۔''

دونوں کے درمیان معاملہ بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ طے پا گیا۔ اس کے بعد گوہر نے راحت علی کو مشورہ دیا کہ وہ میمونہ سے خود بھی بات کر لے۔

''میں اس کے ساتھ زبردستی نہیں کرنا چاہتی۔'' گوہر نے کہا۔ ''اگر وہ خود بھی تیار ہوتی ہے تو لے جایئے۔''

راحت علی نے میمونہ کو اپنے بارے میں سب کچھ بتایا۔ دونوں میں بنگالی میں گفتگو ہوئی اور جب راحت علی نے اس کو یہ بتایا کہ وہ اسے اپنی بیٹی کی طرح رکھنا چاہتا ہے تو میمونہ

پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پہلی بار کوئی ایسا ملا تھا جس نے سچے دل کے ساتھ اس سے ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ وہ تو موم کی طرح پگھل گئی لیکن وہ فردوسی کے لیے پریشان تھی۔

''تم فردوسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتیں۔'' ناصرہ نے اسے سمجھایا جسے گوہر نے اس معاملے میں شریک کیا تھا۔

''تم اور فردوسی اپنے گھر واپس پہنچنے میں کامیاب بھی ہو جاؤ تو تمہارے خاندان والے تمہیں قبول نہیں کریں گے۔ تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں اچھی زندگی گزارنے کا ایک موقع مل رہا ہے۔ فردوسی کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔''

خود فردوسی نے بھی میمونہ سے کہا کہ وہ راحت علی کے ساتھ چلی جائے اور اس موقع کو ضائع نہ کرے۔ راحت علی نے رقم ادا کر دی اور میمونہ کو اپنے ساتھ گھر لے آیا۔ راحت علی کی ماں نے بھی میمونہ کو ایک بے سہارا لڑکی جان کر قبول کر لیا۔

میمونہ اپنے وطن میں اسکول میں پڑھتی تھی۔ راحت علی نے گھر پر ایک ٹیوٹر رکھ کر میمونہ کی تعلیم کا بندوبست کیا اور پھر کچھ عرصے کے بعد اسے ایک اسکول میں داخل کرا دیا۔ میمونہ ذہین اور ہوشیار لڑکی تھی۔ وہ تیزی سے تعلیمی مراحل طے کرنے لگی۔

راحت علی جب میمونہ کو اپنے گھر لے کر آیا تھا تو اس وقت اس نے اس کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دی تھی کہ اب اسے اپنے ماضی سے اپنا رشتہ توڑنا ہوگا۔

''اب تم میری بیٹی ہو۔'' اس نے کہا۔ ''اس جگہ کو ہمیشہ کے لیے بھول جاؤ جہاں سے میں تمہیں لے کر آیا ہوں۔ اس جگہ سے اور وہاں کے لوگوں سے اب تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ نہ تم وہاں کسی سے ملنے جاؤ گی اور نہ وہاں سے کوئی تم سے ملنے کے لیے یہاں آئے گا۔ اس جگہ کے بارے میں سب کچھ اس طرح بھول جاؤ جس طرح انسان کسی بُرے اور بھیانک خواب کو بھول جاتا ہے۔''

میمونہ کو اس جگہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن اسے فردوسی کا ساتھ چھوٹ جانے کا بہت ملال تھا۔ تاہم ایک نئی زندگی کے حصول کے لیے اسے کوئی قیمت تو ادا کرنی ہی تھی۔ ماجدہ کا ساتھ تو پاکستان کی سرحد میں آنے کے بعد ہی چھوٹ گیا تھا۔ اب فردوسی کا ساتھ بھی چھوٹ گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی بہت سے نئے رشتے بھی استوار ہونے لگے تھے۔ راحت علی اس سے اس قدر پیار کرتا تھا کہ اگر اس کی سگی بیٹی زندہ ہوتی تو شاید اس سے زیادہ پیار وہ اس سے بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اسکول میں بہت سی لڑکیاں میمونہ کی دوست بن گئی تھیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میمونہ نے میٹرک پاس کر کے انٹر میں داخلہ لے لیا۔ وہ نرسنگ کا کورس کرنا چاہتی تھی۔ اسے نرسنگ کے پیشے سے ہمیشہ سے دلچسپی رہی تھی۔ راحت علی نے اس کی خواہش کا احترام کیا اور اسے ایک اعلیٰ درجے کے نرسنگ انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ دلوا دیا۔ میمونہ نے بڑی کامیابی کے ساتھ نرسنگ کی ٹریننگ کی تکمیل کی اور اس کے فوراً ہی بعد اسے ایک بڑے ہسپتال میں ملازمت مل گئی۔

گزرنے والے ان طویل برسوں کے دوران میمونہ نے کبھی بھول کر بھی اس علاقے میں قدم نہیں رکھا جہاں سے راحت علی اسے لے کر آیا تھا۔ اسے فردوسی بہت یاد آتی تھی اور اس سے ملنے کے لیے اس کا جی بُری طرح تڑپتا تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ اب اس طرف کا رخ کرنا اس کے لیے بہت نقصان دہ ہوگا۔ فردوسی خود بھی اس سے ملنے کے لیے نہیں آسکتی تھی۔ راحت علی نے گوہر کو اچھی طرح سے سمجھا دیا تھا کہ کوٹھے کا کوئی بھی شخص کبھی بھی اس کے گھر کا رخ نہ کرے۔ میمونہ کو فردوسی کے علاوہ اگر وہاں کا کوئی اور شخص یاد آتا تھا تو وہ ناصرہ تھی، جس نے ان دونوں لڑکیوں کی بہت مدد کی تھی۔

جس ہسپتال میں میمونہ نے ملازمت کی، وہاں ظہیر احمد نامی ایک نوجوان ڈاکٹر کام کرتا تھا۔ ظہیر احمد کی ماں بنگالی اور باپ پنجابی تھا۔ ظہیر احمد بنگالی خوب بول لیتا تھا، بلکہ اس کی مادری زبان بنگالی ہی تھی اور وہ لاہور کے ان لوگوں میں ایک جانی پہچانی شخصیت تھا جن کا تعلق کسی نہ کسی طور پر بنگال سے تھا اور جو بنگالی بولتے تھے۔ ڈاکٹر ظہیر احمد اور راحت علی ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ بلکہ ہسپتال میں میمونہ کو نوکری دلانے میں ڈاکٹر ظہیر احمد نے بھی اس کی مدد کی تھی۔ ڈاکٹر ظہیر احمد، راحت علی کی منہ بولی بیٹی میمونہ سے بھی خوب واقف تھا۔

میمونہ نے جب ہسپتال میں کام کرنا شروع کیا تو رفتہ رفتہ وہ اور ڈاکٹر ظہیر احمد ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ ڈاکٹر ظہیر وہ پہلا نوجوان تھا جس نے میمونہ کے دل میں ایسے جذبات کو ابھارا تھا جن سے میمونہ پہلے کبھی واقف نہ تھی۔ ڈاکٹر ظہیر کی پُرشوق نگاہوں نے میمونہ سے وہ سب کچھ کہہ دیا جو میمونہ خود بھی سننا چاہتی تھی۔

ڈاکٹر ظہیر احمد کے والدین انتقال کر چکے تھے اور وہ اپنے کچھ رشتے داروں کے ساتھ رہتا تھا جو کافی عرصے سے اس پر یہ زور دے رہے تھے کہ وہ شادی کر لے۔ ڈاکٹر ظہیر احمد اب خود بھی اپنا گھر بسا لینا چاہتا تھا اور اس کے لیے میمونہ سے بہتر اور کوئی لڑکی نہیں ہو سکتی تھی۔ راحت علی کو تو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس کے لیے یہ بہت خوشی کی بات تھی

کہ اس کی منہ بولی بیٹی کو اتنا اچھا شوہر مل رہا تھا۔

ڈاکٹر ظہیر احمد اور میمونہ کی شادی ہوگئی۔ ڈاکٹر ظہیر احمد نے اپنے رشتے داروں کا گھر چھوڑ دیا اور ایک علیحدہ گھر لے کر میمونہ کے ساتھ رہنے لگا۔ میمونہ کی شادی کے کچھ ہی عرصے کے بعد راحت علی کی ماں کا انتقال ہوگیا تھا اور اب راحت علی بالکل اکیلا تھا۔

میمونہ اور اس کے شوہر دونوں نے راحت علی سے کہا کہ وہ ان کے ساتھ چل کر رہے۔ راحت علی اس کے لیے تیار نہیں تھا لیکن ان دونوں کے بہت زیادہ زور دینے پر بالآخر وہ تیار ہوگیا اور ان کے ساتھ ہی آکر رہنے لگا۔

راحت علی میمونہ کی شادی کے بعد کوئی تین سال تک زندہ رہا۔ اگرچہ وہ اپنی منہ بولی بیٹی اور داماد کے ساتھ رہتا تھا لیکن پھر بھی ایک یاس انگیز احساسِ تنہائی اس پر غالب رہتا تھا۔ وہ ہائی بلڈ پریشر اور ہائپر ٹینشن کا شکار ہوگیا۔ ظہیر احمد اور میمونہ نے اس کا بہترین علاج کروایا۔ ظہیر احمد تو خود ڈاکٹر تھا۔ لیکن راحت علی کا وقت آچکا تھا۔ وہ ایک روز دنیا سے رخصت ہوگیا۔

''ہماری ایک بیٹی ہے جواب پانچ سال کی ہے۔'' میمونہ نے اپنی طویل داستان کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تو تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ اب تم اپنے بارے میں بتاؤ۔ تم پر کیا گزری اور تم کہاں کہاں سے ہو کر یہاں پہنچیں۔''

یہ ایک بہت مشکل معاملہ تھا۔ ماجدہ، میمونہ کی طرح خوش قسمت نہیں تھی کہ اسے ایک شوہر مل جاتا جس کے ساتھ وہ زندگی گزار سکتی۔ وہ تو تین بچوں کی ماں تھی اور ان سب کے باپ الگ الگ تھے۔

اس نے اپنی داستان کو اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہوئے کراچی میں موسیٰ کالونی میں اپنے قیام اور شریف الدین کے ساتھ اپنے نکاح اور ثمینہ کی پیدائش کا ذکر کیا۔

''شریف الدین بیشتر زمین داروں کی طرح ایک اوباش زمین دار تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''کچھ عرصے تک مجھے استعمال کرنے کے بعد اس نے مجھے پرانے کپڑے کی طرح اتار پھینکا۔ اس نے مجھے طلاق دے دی اور مجھے کوئی رقم بھی ادا نہیں کی۔'' ماجدہ نے آگے کے واقعات مختصر اور محتاط انداز میں بیان کیے۔

''تب فیاض نامی ایک شخص نے مجھے سہارا دیا۔''

ماجدہ نے فیاض کے ساتھ اپنے تعلقات کے بارے میں زیادہ تفصیلات نہیں بتائیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''فیاض مجھے لے کر لاہور آ گیا۔'' اس نے کہا۔ ''اور اس نے مجھے اپنے ایک دوست عزیز کے حوالے کر دیا۔'' ماجدہ نے عزیز کے بارے میں بھی میمونہ کو بہت زیادہ تفصیلات نہیں بتائیں۔ اس نے عزیز کے ساتھ اپنی شادی اور وسیم کی پیدائش کے بارے میں بتایا۔

''عزیز کا کچھ لوگوں کے ساتھ جھگڑا ہو گیا۔'' اس نے مزید تفصیل بیان کی۔ ''عزیز کی موت واقع ہو گئی اور میں اپنے دونوں بچوں کے ساتھ ایک بار پھر تنہا اور بے سہارا رہ گئی۔''

عرفان کے ساتھ اپنی شادی کے بارے میں اس نے میمونہ کو پوری تفصیلات بتائیں۔

''عرفان سے میرا بیٹا فہیم پیدا ہوا۔'' اس نے کہا۔ ''اگرچہ عرفان نے اپنے گھر والوں کے دباؤ کے تحت مجھے طلاق دے دی لیکن اس نے وہ مکان میرے نام کر دیا جس میں مَیں اب رہ رہی ہوں، اپنے تین بچوں کے ساتھ جو سب الگ الگ باپوں کی اولاد ہیں۔''

ماجدہ نے اپنی داستانِ حیات بیان کرتے وقت اس وقت کا خاص خیال رکھا تھا کہ اس نے اپنے بارے میں جو کچھ اپنے بچوں کو بتایا ہے، اس سے کوئی انحراف نہ کرے۔

''کتنے دکھ سہے ہیں تم نے ماجدہ۔'' میمونہ نے غمگین آواز میں کہا۔ ''مگر خدا کا شکر ہے کہ اب تم ایک مطمئن زندگی گزار رہی ہو۔ ہم دونوں نے اتنی بہت سی باتیں کر لیں مگر ابھی بھی کتنا کچھ کہنا سننا باقی ہے۔ سولہ برسوں کے دکھ درد چند گھنٹوں میں تو بیان نہیں ہو سکتے۔''

''ہاں میمونہ۔'' ماجدہ نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اور اب میں چلوں گی۔''

''میں اب خود تمہارے گھر آؤں گی۔'' میمونہ نے کہا۔ ''بہت دیر کے لیے آؤں گی۔''

''سارے دن کے لیے آنا۔'' ماجدہ نے کہا۔ ''تم سے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔ سولہ برس کے بعد مجھے کوئی ایسا شخص ملا ہے جس کے ساتھ میں اپنے ماضی میں سفر کر سکتی ہوں، جو میرے درد کو سمجھ سکتا ہے۔'' ماجدہ کی آواز بھرانے لگی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''تم بھی میرے لیے میرے بچپن کا واحد حوالہ ہو۔'' میمونہ نے گلوگیر آواز میں کہا۔

''جب سے میرا وطن مجھ سے چھوٹا ہے، تب سے اب تک اس سرزمین سے تعلق رکھنے والے کسی شناسا سے میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ میں نہیں جانتی کہ میرے گھر والوں پر کیا بیتی اور اب وہ کس حال میں ہیں۔''

''تم ایک باعزت، صاف ستھری اور خوشحال زندگی گزار رہی ہو۔'' ماجدہ نے کہا۔ ''تم نے اپنے گھر والوں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہیں کی؟''

''کی..... بہت کی۔'' میمونہ نے کہا۔ ''میں نے اپنے گھر کے پتے پر کئی خط لکھے لیکن

وہاں سے کوئی جواب نہیں آیا۔ ویسے تو کچھ دوسرے عزیز رشتے دار بھی موجود ہیں، لیکن میں نے ان کو جان بوجھ کر کوئی خط نہیں لکھا کیونکہ میں اپنے والدین کو مشکل میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ معلوم نہیں میری گمشدگی کے بعد انہوں نے لوگوں کو میرے بارے میں کیا بتایا ہوگا..... وطن کی پہلی خوشبو آج میں سولہ سال کے بعد تمہارے وجود سے اٹھتی ہوئی محسوس کر رہی ہوں۔''

''میرا بھی اپنے دیس سے رابطہ ایسا ٹوٹا کہ پھر کبھی بحال نہ ہو سکا۔'' ماجدہ نے گہری اداسی کے ساتھ کہا۔ ''میری زندگی بھی یہاں ایسی نہیں گزری جس کے بارے میں جان کر میرے گھر والوں کو کوئی خوشی ہوتی..... اس لیے میں نے ان لوگوں سے کوئی رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔''

میمونہ سے رخصت ہو کر ماجدہ اپنے گھر آ گئی۔ اس وقت اس کا دل زخموں سے چور تھا۔ میمونہ سے اچانک اور غیر متوقع ملاقات نے ساری پرانی جراحتوں کو جگا دیا تھا۔ چشم زدن میں وہ آج سے سولہ برس پہلے کی اس حسین دنیا میں واپس پہنچ گئی تھی جہاں وہ خود تھی، اس کے والدین تھے، بھائی بہن تھے اور ہاشم تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے میمونہ، جس کے ساتھ اس نے اپنی زندگی کے محض چند ہی دن گزارے تھے، جو ایک لرزاں سائے کی طرح ذرا سی دیر کے لیے اس کی زندگی میں آئی تھی اور پھر غائب ہو گئی تھی، اس کی گزشتہ اور موجودہ زندگی کے درمیان کہکشاں جیسے ایک روشن لیکن دھول میں اٹے ہوئے ایک پل کا کام دے رہی تھی۔ کھلنا میں اپنا آخری دن..... ہاشم کا ہنستا مسکراتا، مانوس و آشنا چہرہ، جس میں جڑی ہوئی گہری سیاہ آنکھوں میں کیسی والہانہ اور دل میں تر از و ہو جانے والی چمک تھی، اس کے سامنے ایک بار پھر پوری آب و تاب کے ساتھ نمودار ہو رہا تھا۔ ہاشم کے ساتھ دیکھی ہوئی آخری فلم ''دیوداس'' کا آخری خون کے آنسو رلانے والا منظر ایک بار پھر اسے بڑی شدت کے ساتھ یاد آ رہا تھا۔

☆======☆======☆

بچے اس کے انتظار میں تھے۔ اسے خلافِ معمول کافی دیر ہو گئی تھی۔ ثمینہ دونوں چھوٹے بچوں کو سنبھالے ہوئے تھی جو ماں کے بغیر کافی بے چین ہو رہے تھے۔ ماجدہ نے بچوں کو دیکھا اور یکبارگی اسے وقت کے گزرنے، زندگی کے بدل جانے، زندگی کی نئی ترجیحات کے ابھر آنے کا احساس ہوا۔ پل کے نیچے سے بہت پانی بہہ چکا تھا..... تقریباً پچیس چھبیس سال کی عمر میں ہی وہ گویا اپنی ساری زندگی جی چکی تھی۔ اب اگر وہ زندہ تھی تو اپنے تینوں بچوں کے لیے، جن کے درمیان صرف اس کا اپنا وجود ہی ایک قدر مشترک کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حیثیت رکھتا تھا۔صرف اس کی اپنی ہی ذات تھی جو ان تینوں بچوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑے ہوئے تھی۔ان کے درمیان کسی مشترکہ باپ کا رشتہ موجود نہیں تھا۔

ثمینہ تقریباً نو سال کی ایک سمجھ دار بچی تھی، اسے معلوم تھا کہ اس کی ماں کو بنگلہ دیش سے اغوا کر کے لایا گیا تھا اور یہاں پاکستان میں اس کی تین شادیاں ہوئیں، نیز یہ کہ وہ اپنی ماں کی پہلی شادی کے بعد پیدا ہوئی تھی اور اس کے باپ کا نام شریف الدین ہے۔ماں نے اسے یہ بتایا تھا کہ شریف الدین اب مر چکا ہے۔دوسرے دونوں بچے ماں کے دوسرے شوہروں کی اولاد تھے، جن میں سے ایک شوہر مر چکا تھا اور دوسرے نے پہلی بیوی اور بچوں کے دباؤ کے تحت ماں کو طلاق دے دی تھی۔

ان تینوں ''شادیوں'' کے بیچ میں جو نشیب و فراز اور پیچ و خم تھے، ثمینہ ان سے پوری طرح واقف نہیں تھی، کیونکہ ماجدہ ثمینہ کو بہت سنبھال کر رکھنا چاہتی تھی۔وہ اس کے دل میں یہ احساس اجاگر نہیں ہونے دینا چاہتی تھی کہ وہ ایک ایسی عورت کی اولاد ہے جو بار بار مختلف مردوں کی ہوس کا نشانہ بنتی رہی ہے۔

ماجدہ نے اگرچہ ثمینہ کو اپنی بدنصیبیوں کی مکمل تفصیلات سے آگاہ نہیں کیا تھا لیکن نو سالہ ثمینہ بڑی حد تک اندازہ لگا سکتی تھی کہ اس کی ماں کو کھانا بنگلہ دیش سے اغوا ہونے کے بعد کیسے کیسے عذابوں سے گزرنا پڑا ہوگا اور اس پر ظلم و ستم کے کیا کیا پہاڑ نہ ٹوٹے ہوں گے۔ثمینہ کو اپنی ماں سے بہت گہری محبت تھی، وہ اپنی ماں کو ایک مظلوم لیکن بہت بہادر عورت سمجھتی تھی جس نے زندگی کی نامہربانیوں اور عذاب ناکیوں کا بڑی حوصلہ مندی کے ساتھ مقابلہ کیا تھا۔ثمینہ کو اپنے دونوں چھوٹے بھائی بھی بہت پیارے تھے جو اس کی ماں کی اولاد تھے اور ثمینہ کی طرح ان کے ذہن میں بھی باپ کا کوئی ہیولا موجود نہیں تھا..... جو کچھ تھی، وہ ماں تھی..... تینوں کی مشترکہ ماں..... تینوں کی امیدوں کا واحد مرکز..... بس، یہی ایک چھوٹا سا کنبہ تھا۔ثمینہ خود اس کی ماں اور دونوں چھوٹے بھائی..... ثمینہ کو اپنی یہ چھوٹی سی دنیا بہت عزیز تھی اور یہی چھوٹی سی دنیا اب ماجدہ کی بھی کل کائنات تھی۔طرح طرح کے المناک اور اذیت رساں راستوں سے گزرنے کے بعد زندگی نے اب ایک قدرے پُرسکون، واضح اور متعین شکل اختیار کر لی تھی۔اس کے پاس رہنے کے لیے ایک اپنا گھر تھا، روزگار تھا جس سے وہ کچھ پیسے بھی کما لیتی تھی، بچے تھے، اس کے جگر گوشے۔اپنی باقی تمام خواہشات کو اس نے آہستہ آہستہ تھپک تھپک کر سلا دیا تھا۔اس کی زندگی کی ترجیحات میں خود بخود تبدیلیاں ہوتی چلی گئی تھیں

اور اس نے ان تبدیلیوں کو اپنے نصیبے کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔

اس کا ماضی البتہ بلاشرکت غیرے اس کا اپنا تھا۔یہ اس کی اپنی خفیہ دنیا تھی، جس میں وہ ان لوگوں کے ساتھ رہتی تھی جن کا اس کے بچوں سے، اس کے موجودہ شب و روز سے کوئی تعلق نہیں تھا۔یہ گم گشتہ دنیا مادھوپور کی دنیا تھی، یہاں کی سرزمین میں وہ چہرے آباد تھے جن کے نقوش اور خدوخال ماجدہ کے صحیفہ زندگی کے اَن مٹ حروف کی طرح ہمیشہ قائم اور زندہ رہنے والے تھے۔

ماجدہ جب میمونہ سے رخصت ہو کر اپنے گھر میں داخل ہوئی تو وہ گویا اپنی پرانی اور خفیہ دنیا سے یکبارگی چھلانگ لگا کر اپنی نئی دنیا میں آ گئی، جہاں بچوں کی صورت میں امید، محبت اور مسرت کے روشن ستارے اس کے منتظر تھے۔

ثمینہ نے دونوں بھائیوں کو کھانا کھلا دیا تھا، لیکن اس نے خود نہیں کھایا تھا۔وہ ماں کے آنے کا انتظار کر رہی تھی، جس کے بغیر اسے کھانا اچھا نہیں لگتا تھا۔

ثمینہ نے جلدی جلدی کھانا گرم کیا اور جتنی دیر میں اس نے کھانا گرم کیا، اتنی دیر میں ماجدہ لباس تبدیل کر کے کھانے کے لیے تیار ہو گئی۔

ماجدہ نے ثمینہ کو میمونہ کے بارے میں بتایا۔اس کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ثمینہ کو میمونہ سے ملاقات کے بارے میں کچھ نہ بتائے۔میمونہ ایک آدھ روز میں خود اس کے گھر آنے والی تھی۔ویسے بھی ماجدہ نے اپنے اغوا کیے جانے کے بارے میں بتاتے ہوئے ثمینہ کو بتایا تھا کہ اس کے ساتھ میمونہ اور فردوسی نامی دو لڑکیاں اور بھی تھیں جنہیں پاکستان کی سرحد میں داخل ہونے کے بعد کہیں اور بھیج دیا گیا تھا اور پھر ماجدہ کو ان کے بارے میں کبھی کچھ نہیں معلوم ہو سکا تھا۔

''میمونہ بہت اچھی زندگی گزار رہی ہے۔'' ماجدہ نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔''وہ خود ایک نرس ہے اور اس کی شادی ایک ڈاکٹر سے ہوئی ہے۔کسی دن ہمارے گھر آئے گی۔اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھ سے ملنے ہمارے گھر ضرور آئے گی۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہوگی کہ وہ ہمارے گھر آئیں۔'' ثمینہ نے پُرشوق لہجے میں کہا۔''انہیں ضرور بلایئے امی، میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔''

اس رات ماجدہ کو بہت کم نیند آ سکی۔میمونہ سے ہونے والی اچانک ملاقات نے اسے ایک بار پھر ماضی کی گمشدہ دنیا میں پہنچا دیا تھا، جہاں وہ رات بھر بھٹکتی رہی، ہاشم کے ہاتھ میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہاتھ ڈالے ہوئے، نہ جانے کون کون سی بے خواب راہوں سے گزرتی رہی۔ ہاشم کے ساتھ دیکھی ہوئی آخری فلم دیوداس کی پاروتی اور دیوداس کی ستم زدہ صورتیں اس کی نظروں کے سامنے بار بار اُجاگر ہوتی رہیں۔

میمونہ نے ماجدہ کے پاس آنے میں دیر نہیں لگائی۔ وہ دو دن کے بعد ہی ماجدہ کے گھر آ گئی۔ وہ صبح کا وقت تھا اور ثمینہ اور وسیم اسکول جا چکے تھے۔ گھر میں ماجدہ اپنے چھوٹے بیٹے فہیم کے ساتھ اکیلی تھی جو ابھی اسکول نہیں جاتا تھا۔ ماجدہ کو گھر کے باہر کے جتنے بھی کام ہوتے تھے، انہیں وہ ثمینہ اور وسیم کی اسکول سے واپسی کے بعد ہی انجام دیتی تھی۔

میمونہ کو دیکھ کر ماجدہ بہت زیادہ خوش ہوئی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ میمونہ اتنی جلدی اس کے پاس آ جائے گی۔

''آج ہسپتال سے میرا آف ہے۔'' میمونہ نے خوشی سے چھلکتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں سارے دن کے لیے تمہارے پاس آئی ہوں۔ ظہیر کو میں نے بتا دیا ہے۔ اب میں تمہارے ساتھ سارا دن باتیں کروں گی۔ اف..... کتنی بہت سی باتیں ہیں جو میں تم سے کرنا چاہتی ہوں۔ ہمارے درمیان تقریباً سولہ برس کا فاصلہ حائل ہے۔ اس دن تو تم سے بہت مختصر سی باتیں ہوئی تھیں، اب ہمارے پاس باتیں کرنے کے لیے سارا دن ہے۔''

''تم نے بہت اچھا کیا میمونہ کہ تم سارے دن کے لیے میرے پاس آ گئیں۔'' ماجدہ نے گہری اپنائیت کے انداز میں کہا۔ ''جانتی ہو، میں نے اپنی بیٹی ثمینہ کو جب تمہارے بارے میں بتایا تو وہ بہت خوش ہوئی۔ وہ تم سے ملنا چاہتی ہے۔''

دونوں سہیلیاں کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں اور میمونہ اسے اپنی موجودہ زندگی کے بارے میں بتا رہی تھی۔

''ظہیر بہت محبت کرنے والے اور بہت وسیع القلب انسان ہیں۔'' میمونہ کہہ رہی تھی۔ ''میرے بابا راحت علی نے، جنہوں نے مجھے کوٹھے سے خرید کر میری پرورش کی تھی، ظہیر کو شادی سے پہلے ہی میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ بابا کہتے تھے کہ ایک بار سچ بول کر انسان زندگی بھر کے خوف، پشیمانی اور احساس جرم سے نجات پا جاتا ہے۔ ظہیر نے میرے بارے میں سب کچھ جاننے کے بعد ہی مجھے قبول کیا اور مجھ سے شادی کا فیصلہ کیا اور شادی کے بعد سے ہم لوگ مثالی زندگی گزار رہے ہیں۔''

''تم اپنی خوش قسمتی پر جتنا بھی ناز کیوں نہ کرو کم ہے میمونہ۔'' ماجدہ نے آہستہ سے کہا۔

''خدا کا شکر ہے کہ تمہاری زندگی برباد ہونے سے بچ گئی اور تم اپنا گھر آباد کر کے سکون سے رہ رہی ہو۔''

''اور اب میں تمہارے بارے میں جاننا چاہتی ہوں ماجدہ۔'' میمونہ نے کہا۔ ''اس روز تم نے مجھے مختصراً بتایا تھا کہ تمہاری تین شادیاں ہوئی تھیں اور تمہارے تینوں بچے الگ الگ شوہروں کی اولاد ہیں، اب ذرا مجھے ان حالات کے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔''

''میں نے اصل واقعات تو تقریباً تم کو سارے ہی بتا دیئے تھے۔'' ماجدہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''بہرحال، اب تم تفصیل جاننا چاہتی ہو تو میں تمہیں بتاتی ہوں۔''

ماجدہ نے میمونہ کو موسیٰ کالونی کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ ''ان لوگوں نے مجھے کراچی لا کر موسیٰ کالونی کے ایک گھر میں رکھا تھا۔'' ماجدہ نے میمونہ کو تفصیلات بتائیں۔ ''پھر میری لاعلمی میں مجھ سے نکاح نامے پر دستخط کروا کے ایک زمیندار سے میرا نکاح کرا دیا اور قیمت وصول کر لی۔ شناختی کارڈ کے فارم کے بہانے مجھ سے نکاح نامے پر دستخط لے لیے۔ وہ زمیندار مجھے بہاولنگر لے آیا۔ ثمینہ اسی کی بیٹی ہے.....''

آگے کے واقعات بیان کرنے میں اگرچہ ماجدہ نے خاصی تفصیل سے کام لیا لیکن اس نے اپنی کہانی کا اصل ڈھانچہ وہی رہنے دیا جو وہ اس سے پہلے بیان کر چکی تھی۔ وہ اس راز کو ہرگز اپنی زبان پر نہیں لانا چاہتی تھی کہ اس کا کوئی بھی بچہ کسی ایسے شخص کی اولاد ہے جس کے ساتھ اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ تو جو کچھ ہونا تھا، وہ ہو چکا تھا لیکن اب اسے اپنے بچوں کو بچانا تھا۔ ان کو ایک باعزت زندگی گزارنے کا حق ضرور ملنا چاہیے تھا۔

''عرفان ایک نیک دل انسان تھا۔'' ماجدہ نے اپنی طویل گفتگو ختم کرتے ہوئے کہا۔ ''بے شک، اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ اپنے بیوی بچوں کے خلاف کوئی مزاحمت کر سکتا اور اسی لیے اس نے ان کے دباؤ میں آ کر مجھے طلاق دے دی، لیکن ساتھ ہی اس نے یہ مکان میرے نام کر دیا اور اس طرح اپنے بیٹے کی بڑی حد تک مدد کی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس مکان کی قیمت میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔''

''تمہیں پاکستان میں رہتے ہوئے سولہ سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا۔ تم نے شناختی کارڈ تو بنوا لیا ہوگا؟'' میمونہ نے پوچھا۔ ''تم تو اب پاکستانی شہری ہو۔''

''مجھے نہیں معلوم کہ میں کہاں کی شہری ہوں۔'' ماجدہ نے گہری اداسی کے ساتھ جواب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیا۔ ''لیکن میرے پاس پاکستان کا شناختی کارڈ موجود ہے۔ عرفان نے جب مجھ سے شادی کی تھی تو اس وقت اس نے میرا شناختی کارڈ بنوا دیا تھا اور میرے دونوں بچوں کا رجسٹریشن بھی ہو گیا تھا۔ اس وقت میں نے پہلی بار شناختی کارڈ بنوانے کا فارم دیکھا تھا۔ عرفان نے سکندر اور شوکت کے برخلاف میرے ساتھ کوئی فریب نہیں کیا تھا۔ میرا شناختی کارڈ صرف میری ہی نہیں، عرفان کی بھی ضرورت تھا۔''

''کیا تمہیں مادھوپور میں اپنے گھر والوں کے بارے میں کچھ خبر ہے۔''

''نہیں۔'' ماجدہ نے ایک گہری اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ ظاہر ہے کہ وہ لوگ خود تو مجھ سے رابطہ نہیں کر سکتے اور میں نے خود ان سے رابطہ نہیں کیا۔ میں ان کو اپنے بارے میں کیا بتا سکتی تھی؟ تین تین شادیاں کرنے والی ایک عورت..... تین الگ الگ مردوں کی اولادیں پیدا کرنے والی عورت.....'' وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

''مگر اس میں تمہارا کیا قصور ہے ماجدہ؟'' میمونہ نے اس کو تسلی دیتے ہوئے، اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''یہ تو سب قسمت کے کھیل ہیں۔ اب ذرا یہی سوچو کہ اگر بابا راحت علی نے اس رات میرا گانا نہ سن لیا ہوتا تو میں اس وقت کہاں ہوتی؟ تم تو بہت خوش قسمت تھیں کہ کوٹھے پر پہنچنے سے بچ گئیں۔ میں تو کوٹھے پر پہنچ گئی تھی لیکن آخری منزل تک جانے سے پہلے ہی کسی نے مجھے نیچے اتار دیا۔ ہم لوگ اپنی مرضی سے تو اغوا نہیں ہوئے تھے ماجدہ..... ہم تو معاشرے کے جبر کا شکار ہوئے تھے اور پھر ہمارے ساتھ جو کچھ بھی ہوتا رہا، اس کے لیے ہم ذمہ دار نہیں ہیں۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو میمونہ..... میں واقعی کوٹھے پر جانے سے تو بال بال بچ گئی لیکن شاید تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ یہ دوسری اور تیسری اور چوتھی شادیاں کرنے والے مال دار وڈیرے، زمیندار اور جاگیردار کس قدر گھناؤنے لوگ ہوتے ہیں اور یہ اپنی خریدی ہوئی نوجوان بیویوں کا کیا حال کرتے ہیں اور ان کی خاندانی بیویاں اور ان کی اولادیں، ان خریدی ہوئی باندیوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتی ہیں۔ میں ان ساری منزلوں سے گزری ہوں میمونہ..... حقیقت یہ ہے کہ ایسی خریدی ہوئی بیوی کی زندگی طوائف سے بھی بدتر ہوتی ہے۔''

''بالکل یہی بات فردوسی بھی کہتی ہے۔'' میمونہ نے بہت ہلکی، مدھم آواز میں کہا۔

''فردوسی؟'' ماجدہ ایک دم جیسے خواب سے چونک پڑی۔ ''اف، دیکھو تو بھلا..... اس

روز جب تم سے ملاقات ہوئی تھی تو میں تم سے فردوسی کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی۔ اس کے بارے میں جاننے کا بھی مجھے بہت اشتیاق تھا لیکن ہماری گفتگو کے دوران اتنا وقت ہی نہیں ملا کہ میں تم سے فردوسی کے بارے میں پوچھ سکتی، تو اب ذرا اس کے بارے میں بھی تو بتاؤ وہ کہاں ہے؟ کیسی ہے؟ کیا تمہاری اس سے کبھی ملاقات ہوئی ہے؟'' ماجدہ نے ایک ہی سانس میں بہت سارے سوالات کر ڈالے۔ وہ فردوسی کے بارے میں جلد از جلد سب کچھ معلوم کر لینا چاہتی تھی۔''

''فردوسی اسلام آباد میں ہے۔'' میمونہ نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے نظریں جھکا کر بہت دھیمے لہجے میں کہا۔

''اسلام آباد میں؟'' ماجدہ نے سوالیہ انداز میں اس کی بات دہرائی۔ ''تو کیا..... اس کی بھی کہیں شادی ہو گئی ہے؟''

''نہیں۔'' میمونہ نے کہا۔ ''اس کی شادی نہیں ہوئی ہے، وہ اسلام آباد میں کاروبار کرتی ہے۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ وہ خود اپنا کوئی کام کرتی ہے۔ تمہاری اس سے ملاقات ہوتی رہتی ہے کیا؟''

''کوٹھے سے علیحدہ ہونے کے بعد میری اس سے ایک بار ملاقات ہوئی تھی، اسلام آباد میں۔'' میمونہ نے کہا۔ ''آج سے کوئی دو سال پہلے.....''

''اچھا مجھے اس کے بارے میں کچھ بتاؤ۔'' ماجدہ نے اشتیاق ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں، ابھی ہمارے پاس کافی وقت ہے۔'' میمونہ نے کہا۔ ''میں تم کو فردوسی کے بارے میں بتا سکتی ہوں۔'' اس نے بتانا شروع کیا۔

راحت علی جب میمونہ کو کوٹھے سے خرید کر اپنے گھر لے آیا تو اس کے ساتھ ہی میمونہ کی زندگی میں ایک زبردست انقلاب آ گیا۔

میمونہ کو یہ سب کچھ بہت اچھا لگا۔ اپنے گھر سے محروم اور دربدر ہو جانے کے بعد سے پہلی بار اسے قدرے سکون اور عافیت کا احساس ہوا۔ راحت علی کے گھر میں راحت علی کی ماں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ ماں بھی بنگالن تھی اور اس گھر میں بنگالی ہی بولی جاتی تھی۔ میمونہ کی اس خاندان میں شمولیت کے بعد سے بنگالی بولنے والے ایک اور رکن کا اضافہ ہو گیا۔

میمونہ راحت علی کو بابا اور اس کی ماں کو دادی کہنے لگی۔ یہ ہدایات اسے خود راحت علی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے دی تھیں۔

دادی کا رویہ بھی اس کے ساتھ ٹھیک ہی تھا۔ اگرچہ اس میں وہ وارفتگی اور بھرپور اپنائیت نہیں تھی جو بابا کے رویے میں تھی لیکن پھر بھی دادی نے اس کو ناپسند نہیں کیا تھا۔

میمونہ کا شوہر ڈاکٹر ظہیر ایک لائق ڈاکٹر تھا اور اسے اکثر ڈاکٹروں کی کانفرنسوں وغیرہ میں شرکت کے لیے دوسرے شہروں میں بھی جانا پڑتا تھا۔ اس قسم کے دوروں میں اکثر میمونہ بھی اس کے ساتھ ہوتی تھی۔ وہ ایسے اجتماعات میں شرکت کر کے بہت خوش ہوتی تھی کیونکہ اس طرح خود اس کے اپنے علم میں بھی بہت اضافہ ہوتا تھا۔

آج سے تقریباً دو سال پہلے ایسی ہی ایک کانفرنس میں میمونہ کو اپنے شوہر کے ساتھ اسلام آباد جانے کا موقع ملا۔ اسلام آباد میمونہ کے لیے کوئی نئی جگہ نہیں تھی۔ وہ اپنے شوہر ڈاکٹر ظہیر کے ساتھ کئی بار اسلام آباد آ چکی تھی، سیر و تفریح کی غرض سے بھی اور طبی کانفرنسوں میں شرکت کی غرض سے بھی۔

اس بار جس کانفرنس میں ڈاکٹر ظہیر کو شرکت کرنا تھی، وہ اسلام آباد کے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں منعقد ہو رہی تھی۔ کانفرنس کے مندوبین کے ٹھہرنے کا انتظام تو کہیں اور کیا گیا تھا لیکن کانفرنس کا انعقاد ہوٹل میں ہوتا تھا، میمونہ اپنے شوہر کے ساتھ اس کانفرنس میں شرکت کے لیے پہنچی کانفرنس کا پہلا سیشن تو عام سیشن تھا جس میں سارے ہی مدعوئین نے شرکت کی۔ اس کے بعد چند الگ الگ کمیٹیاں بنائی گئیں جنہیں اپنے اپنے اجلاسوں میں الگ الگ مسائل کا جائزہ لے کر اپنی سفارشات مرتب کرنی تھیں۔ یہ کمیٹیاں صرف ڈاکٹروں پر مشتمل تھیں۔ ڈاکٹر ظہیر بھی ایک کمیٹی میں شامل تھا۔ لنچ کے وقفے کے بعد کمیٹیوں کے اجلاس شروع ہو گئے اور میمونہ اب کافی دیر کے لیے تنہا رہ گئی تھی۔

''میں یہیں ہوٹل کی لابی میں بیٹھی رہوں گی۔'' اس نے اپنے شوہر سے کہا۔ ''میرے پاس پڑھنے کے لیے کچھ چیزیں موجود ہیں۔ میں اطمینان سے یہاں بیٹھ کر پڑھتی رہوں گی۔ تمہاری میٹنگ جب ختم ہو جائے تو تم مجھے لابی میں ہی تلاش کر لینا۔''

''ٹھیک ہے۔'' ڈاکٹر ظہیر نے کہا۔ ''تم یہاں ٹھہرو، میں اپنا کام ختم کر کے تمہیں دیکھ لوں گا۔''

ڈاکٹر ظہیر تو کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے چلا گیا اور میمونہ لابی میں ایک صوفے پر بیٹھ کر ایک میڈیکل جرنل کے مطالعے میں مصروف ہو گئی۔

میمونہ نے جریدے میں سے ایک مضمون ختم کرنے کے بعد جریدے کو بند کیا اور اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگی۔ اچانک ایک عورت نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا لی۔

وہ ایک نوجوان عورت تھی، تقریباً میمونہ ہی کی ہم عمر۔ وہ چست قسم کی جینز اور مختصر سے بلاؤز میں ملبوس تھی۔ اس کے بال کٹے ہوئے تھے اور وہ خاصا میک اَپ کیے ہوئے تھی۔ وہ کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی ایک آدمی سے باتیں کر رہی تھی۔ آدمی ایک ڈھیلے ڈھالے لیکن قیمتی شلوار قمیص سوٹ میں ملبوس تھا اور اس کے سر پر ایک ٹوپی تھی۔ اس عورت کے ساتھ وہ بالکل بے جوڑ لگ رہا تھا۔ میمونہ اس عورت کی طرف اس وجہ سے متوجہ ہوئی کہ اسے اس کے خدوخال کچھ جانے پہچانے سے لگے لیکن وہ فوری طور پر یاد نہ کر سکی کہ اس عورت کو کب اور کہاں دیکھا تھا۔ وہ ابھی غور کر ہی رہی تھی کہ اس عورت نے اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کی نظریں میمونہ کے چہرے پر جیسے جم کر رہ گئیں۔ وہ اسے غور سے دیکھنے لگی۔ دونوں عورتیں جو ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر تھیں، ایک دوسرے کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔ پھر اس عورت نے اپنے ساتھی مرد سے کچھ بات کی اور وہ وہاں سے چلا گیا۔ عورت تیزی سے میمونہ کی طرف بڑھی۔

''معاف کیجیے، کیا آپ کا نام میمونہ ہے؟'' اس عورت نے بڑی صاف ستھری اردو میں میمونہ سے سوال کیا اور جب وہ بولی تو اس کی آواز اور اس کے اردو لب و لہجے کے ایک خاص انداز نے میمونہ کے دماغ میں اچانک ایک شعلہ سا بھڑکا دیا۔

''فردوسی؟'' میمونہ نے اپنی جگہ سے تیزی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''تم..... فردوسی ہو نا؟'' اس کی زبان سے بے ساختہ بنگالی زبان میں یہ الفاظ ادا ہوئے۔

''ہاں..... ہاں.....'' اس عورت نے بے تابی کے ساتھ بنگالی میں کہا۔ ''میں فردوسی ہوں..... فردوسی۔'' اور وہ بے ساختہ میمونہ سے لپٹ گئی۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ میمونہ نے فردوسی کا ہاتھ پکڑ کر اسے صوفے پر اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔

''تم..... یہاں.....''

''میں یہاں اپنے شوہر ڈاکٹر ظہیر کے ساتھ آئی ہوئی ہوں۔'' میمونہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''وہ ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے ہوئے ہیں.....''

''ہاں، مجھے معلوم ہے کہ تمہاری شادی ایک ڈاکٹر سے ہوئی ہے۔'' فردوسی نے ایک دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''تم سے لاہور میں اگرچہ پھر کبھی ملاقات تو نہیں ہوئی تھی، لیکن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں تمہارے حالات سے بے خبر نہیں رہی۔ تمہارے بارے میں معلومات حاصل کرتی رہی۔ تم نے مجھے اپنی شادی میں بھی نہیں بلایا۔'' وہ آہستہ سے ہنسی۔ ''خیر..... اب بتاؤ، کیسی ہو؟ کیسی گزر رہی ہے؟''

میمونہ نے اسے مختصراً اپنے بارے میں بتایا۔ بتانے کے لیے کوئی بہت خاص بات تو تھی بھی نہیں.....

''اچھا، اب اپنے بارے میں بتاؤ۔'' میمونہ نے اپنی بات ختم کرنے کے بعد فردوسی سے پوچھا۔ ''تم کہاں..... میرا مطلب ہے..... کہاں رہتی ہو؟ یہاں اسلام آباد میں کیا کر رہی ہو؟''

''میں یہاں اسلام آباد میں عیاشی کے ایک بہت بڑے اڈے میں کام کرتی ہوں۔'' فردوسی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی بے باکی اور بے خوفی کے ساتھ کہا۔ ''اڈا ایک بہت شاندار کوٹھی میں واقع ہے اور یہاں کسی معمولی درجے کے آدمی کا گزر نہیں ہے۔ یہاں بڑے بڑے سرکاری افسران، حکام، سیاست داں، وزیر اور دولت مند لوگ آتے ہیں جو ایک رات میں ہزار ہا روپے شراب اور عورت پر لٹا دیتے ہیں۔ سب کو معلوم ہے کہ اس کوٹھی کی دیواروں کے اندر کیا ہوتا ہے لیکن کس مائی کے لال کی مجال ہے کہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ اور یہاں اسلام آباد میں یہ ایسا صرف ایک اڈا نہیں ہے۔ شریفوں اور رئیسوں کی اس بستی میں جا بجا عالی شان کوٹھیوں میں ایسے اڈے قائم ہیں، جہاں ہر قسم کا ملکی اور غیر ملکی مال دستیاب ہوتا ہے اور ہر قسم کے ملکی اور غیر ملکی ضرورت مند یہاں آ کر ماتھا ٹیکتے ہیں۔''

فردوسی بول رہی تھی۔ اس کے لہجے میں جیسے زہر گھلا ہوا تھا اور میمونہ بڑی حیرت کے ساتھ اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔

''مگر..... تم..... لاہور سے یہاں اسلام آباد کس طرح آ گئیں؟'' میمونہ نے متجسس انداز میں اس سے پوچھا۔

''بنگلہ دیش سے لاہور کے کوٹھے تک کا سفر تو میری مرضی کے خلاف تھا میمونہ۔'' فردوسی نے کہا۔ ''وہ تو ہم تینوں کی ہی مرضی کے خلاف تھا میری جان! مگر لاہور سے اسلام آباد تک کا یہ سفر میری مرضی کے خلاف نہیں تھا۔ بلکہ وہ میری مرضی کے مطابق تھا۔ میں تمہیں اس کے بارے میں بتاتی ہوں۔ مگر پہلے تم اپنے بارے میں بتاؤ۔ تم خوش تو ہو نا؟ اپنے شوہر کے ساتھ خوش ہو نا؟ زندگی اچھی گزر رہی ہے؟ کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟''

''نہیں فردوسی۔'' میمونہ نے جواب دیا۔ ''کوئی پریشانی نہیں ہے۔ میرا شوہر بہت اچھا آدمی ہے۔ ہماری ایک بچی ہے۔ ہم لوگ بڑی مطمئن اور خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔ اب تم اپنے بارے میں بتاؤ۔ میرے شوہر کانفرنس میں ہیں۔ انہیں کافی دیر لگے گی۔ اس دوران ہم اطمینان سے باتیں کر سکتے ہیں۔''

''ڈرتی ہو اپنے شوہر سے؟'' فردوسی نے ہنستے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''نہیں نہیں۔'' میمونہ نے گھبرا کر کہا۔ ''میں ان سے ڈرتی نہیں ہوں..... لیکن.....''

''خیر چھوڑو اس بات کو۔'' فردوسی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''میں مردوں کے مزاج کو بہت اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ تم میرے بارے میں جاننا چاہتی ہو تو سنو.....''

فردوسی نے اپنے بارے میں بتانا شروع کیا اور میمونہ توجہ اور محویت کے عالم میں اس کی داستان سننے لگی۔

فردوسی کو جب یہ معلوم ہوا کہ کوئی نیک دل بزرگ میمونہ کو اپنی بیٹی بنا کر گوہر کے کوٹھے سے ہمیشہ کے لیے لے جانا چاہتا ہے تو وہ ایک ملی جلی کیفیت کا شکار ہو گئی۔ اگر ایک طرف اسے اس بات کی خوشی تھی کہ اس کی سہیلی کی زندگی بن جائے گی تو اس کے ساتھ ہی اسے اس بات کا بہت گہرا دکھ بھی تھا کہ میمونہ یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلی جائے گی اور وہ بالکل اکیلی رہ جائے گی۔

میمونہ کے جانے کے بعد وہ بہت روئی۔ اسے اس بات کا بھی شدید ملال تھا کہ اب کبھی بھی میمونہ سے اس کی ملاقات نہیں ہو سکے گی۔ اس کو بتا دیا گیا تھا کہ نہ تو اب میمونہ کبھی یہاں اس سے ملنے آئے گی اور نہ وہ خود یا اس کوٹھے کا کوئی بھی شخص کبھی میمونہ سے مل سکے گا۔ یہ بڑی اذیت ناک صورتِ حال تھی۔ ماجدہ کا ساتھ تو پہلے ہی چھوٹ چکا تھا اور اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ اس سے ملاقات کی کوئی امید بھی نہیں تھی اور اب میمونہ بھی غائب ہو گئی۔ فردوسی اپنی تمام تر بدنصیبیوں کے ساتھ تنہا رہ گئی تھی۔ جب تک میمونہ اس کے ساتھ تھی، تب تک بیگانوں کے اس دیس میں یگانگت اور رفاقت کی ایک شمع اس کے لیے روشن تھی۔ مگر آج یہ شمع بھی اچانک گل ہو گئی تھی اور اسے اپنے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آ رہا تھا۔

اس موقعے پر ناصرہ نے اس کی بہت دلجوئی کی۔ ناصرہ اب وہ واحد عورت تھی جس کے ساتھ میمونہ بنگالی بول سکتی تھی۔ ناصرہ نے میمونہ کے دکھ کو کم کرنے میں بھی بڑا کردار ادا کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ وہ اب ایک بہت اچھی زندگی گزار سکے گی۔'' ناصرہ نے کہا۔''اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ تم سے کبھی مل سکے گی یا نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ خوش رہے گی۔ ہمارے لیے تو یہی بہت ہے کہ وہ خوش رہے.....''

ناصرہ کے بہت سمجھانے سے میمونہ کا دل کچھ ٹھہرا، اور اس نے معمولاتِ زندگی میں پہلے کی طرح حصہ لینا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا۔

فردوسی اب گانے کے ساتھ ساتھ باقاعدہ مجرے بھی کرنے لگی اور رفتہ رفتہ اس کے مجروں کی مقبولیت اور پسندیدگی میں اضافہ ہوتا گیا۔ گوہر اس کے کام سے بہت خوش تھی۔ فردوسی کی وجہ سے کوٹھے کی آمدنی میں اضافہ ہوا تھا۔ اور مزید اضافے کی امید تھی۔

پھر اس امید کے پورا ہونے کا وقت بھی آ گیا۔ فردوسی کا ابھرتا ہوا جسم ایک قیامت بن گیا اور اس قیامت کے لیے خریدار بولیاں لگانے لگے۔ گوہر کو فردوسی کے لیے کسی موٹی اسامی کی تلاش تھی اور اس نے وہ اسامی بآسانی تلاش کر لی۔

فردوسی کی طرح دلبر بھی ایک اغوا شدہ لڑکی تھی۔ دونوں تقریباً ایک ہی جیسی راہوں سے گزر کر یہاں تک پہنچی تھیں۔ ان کے درمیان کافی دوستی ہو گئی تھی اور وہ اپنے دکھ سکھ ایک دوسرے سے بیان کرتی رہتی تھی۔

دلبر ایک خوش شکل لڑکی تھی اور کمائی کا ایک بہت اچھا ذریعہ تھی۔ اس کے لیے گاہکوں کی کبھی کمی نہیں رہتی تھی۔

دلبر کے مستقل گاہکوں میں فیصل نامی ایک شخص بھی تھا۔ وہ درمیانہ عمر کا آدمی تھا اور کسی نیم سرکاری ادارے میں ملازم تھا جہاں تنخواہ کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ اوپر کی کمائی حاصل ہوتی تھی اور دلبر پر بھی کافی رقم خرچ کرتا تھا۔ دلبر اس سے بہت خوش رہتی تھی۔

پھر ایک دن فیصل نے دلبر کو شادی کی پیشکش کر دی۔ اس نے دلبر کو یقین دلایا کہ وہ اس سے بہت محبت کرتا ہے اور اسے یہاں سے نکال کر اپنی بیوی بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔

دلبر کے لیے یہ بات انتہائی مسرت آمیز تھی اور ناقابلِ یقین بھی..... اس نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ کوئی مرد اس سے شادی کی درخواست کرے گا۔

دلبر نے سب سے پہلے یہ بات فردوسی کو بتائی۔ یہ بتاتے ہوئے وہ خوشی سے بے قابو ہوئی جا رہی تھی۔''میری شادی ہو جائے گی فردوسی۔'' اس نے جیسے نشے میں ڈوب کر کہا۔ ''میرا بھی اپنا ایک الگ گھر ہو گا۔ میرا شوہر ہو گا۔ اُف میرے خدا..... کس قدر اچھا ہو گا یہ

سب..... میں تو ابھی سے سوچ سوچ کر پاگل ہوئی جا رہی ہوں۔''

''مگر..... گوہر آپا.....''

''میں نے انہیں کما کما کر بہت دے دیا ہے۔'' دلبر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''اب وہ مجھے جانے سے نہیں روک سکتیں۔ وہ مجھے زبردستی یہاں نہیں رکھ سکتیں۔''

گوہر نے اس کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کی، لیکن اس کو سمجھانے کی بہت کوشش کی۔

''وہ آدمی پہلے سے شادی شدہ ہے۔'' گوہر نے کہا۔''اس کے گھر والے اور خاص طور سے اس کی بیوی، تم کو کبھی بھی قبول نہیں کریں گے۔ اس بات کو اچھی طرح جان لو کہ وہاں تمہاری دو کوڑی کی بھی اوقات نہیں ہو گی۔''

''فیصل مجھے الگ گھر لے کر دے گا۔'' دلبر نے فخریہ انداز میں کہا۔''یہ بات تو طے ہو چکی ہے کہ میں اس کی پہلی بیوی کے ساتھ نہیں رہوں گی۔''

''الگ گھر میں رہو گی تب بھی تمہیں اس کی بیوی کا مقام کبھی بھی نہیں حاصل ہو سکے گا۔'' گوہر نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔''میں نے ایسے ایسے بہت سے تماشے دیکھے ہیں۔ طوائف تو ہمیشہ طوائف ہی رہتی ہے۔ عورت ایک بار طوائف بن جاتی ہے تو پھر اس کے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔''

''مجھے واپسی کا راستہ مل رہا ہے آپا۔'' دلبر نے اصرار کرتے ہوئے کہا اور پھر وہ فیصل کے ساتھ چلی گئی۔ فیصل نے گوہر کو کچھ رقم ادا کر کے اسے راضی کر لیا تھا۔

دلبر چلی گئی۔ فردوسی اس کے بارے میں سوچتی تھی اور اداس ہو جاتی تھی۔ اسے دلبر کے جانے کا غم نہیں تھا۔ بلکہ غم اس بات کا تھا کہ اس کی زندگی میں فیصل جیسا کوئی مرد کیوں نہیں آ جاتا جو اسے کوٹھے کی زندگی سے نجات دلا دے۔

فردوسی کی زندگی میں تو ایسا کوئی مرد نہیں آیا۔ البتہ کوئی چھ ماہ کے بعد دلبر ضرور کوٹھے پر واپس آ گئی۔

دلبر بھری دوپہر کو برقعے میں ملبوس ہانپتی کانپتی بدحواس کوٹھے پر اس وقت پہنچی جب سب لوگوں نے ابھی کھانا ختم کیا تھا۔ وہ سخت خوفزدہ اور گھبرائی ہوئی تھی اور اس کے چہرے پر جیسے خاک اُڑ رہی تھی۔ وہ آتے ہی گوہر سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''آپا مجھے معاف کر دو۔ مجھے بچا لو آپا۔ میں سخت مشکل میں ہوں آپا..... وہ لوگ مجھے پکڑ لیں گے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''جب تم اس کوٹھے پر ہو تو کس کی مجال ہے جو تمہیں پکڑ لے۔'' گوہر نے پُرعزم آواز میں کہا۔ ''مگر بتاؤ تو ہوا کیا ہے۔ تم نے تو فیصل کے ساتھ شادی کر لی تھی۔''

''نہیں آپا..... فیصل نے مجھے دھوکا دیا۔'' دلبر نے روتے ہوئے کہا۔ ''وہ ایک کمینہ اور لالچی آدمی ہے۔ وہ مجھے اپنے قبضے میں رکھ کر مجھ سے وہی دھندا کروانا چاہتا تھا جو میں یہاں کرتی رہی ہوں۔ وہ میرے جسم کی ساری کمائی خود کھانا چاہتا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ تمہاری کمائی دوسروں کے قبضے میں کیوں جائے، صرف ہم دونوں ہی اس کے حق دار کیوں نہ ہوں اور جب میں نے اس کی بات ماننے سے سختی کے ساتھ انکار کر دیا تو اس نے پولیس کے ساتھ مل کر میرے خلاف تھانے میں حدود آرڈیننس کے تحت مقدمہ درج کروا دیا۔ اس نے مجھ پر الزام لگایا کہ میں اس کی بیوی ہوں اور بدکاری کرتی ہوں۔ پولیس مجھے گرفتار کرنے آ گئی تھی کہ میں کسی طرح سے بچ کر بھاگ نکلی۔'' دلبر اپنی داستان بیان کر رہی تھی اور کوٹھے کے سب لوگ بڑے غور اور توجہ سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔

''میرا دنیا میں کہیں کوئی اور ٹھکانہ نہیں ہے آپا۔'' دلبر نے رو رو کر کہا۔ ''صرف تم ہی مجھے پناہ دے سکتی ہو۔ میں جیل نہیں جانا چاہتی آپا۔ فیصل کہتا ہے کہ وہ زندگی بھر کے لیے مجھے جیل میں سڑا دے گا۔''

''تم بالکل صحیح جگہ پر واپس آ گئی ہو دلبر۔'' گوہر نے متانت کے ساتھ کہا۔ ''میں نے تم کو منع کیا تھا کہ شادی وادی کے چکر میں مت پڑنا۔ یہ مرد ذات اعتبار کے قابل نہیں ہوتی۔ اس سے تو بس اپنے تلوے چٹواتی رہو۔ اگر اسے سر پر چڑھاؤ گی تو یہ تمہارا جینا حرام کر دے گا۔ مرد کے سر پر جب تک طوائف کی جوتی رہتی ہے تو وہ سیدھا رہتا ہے اور اگر وہ اس کی بیوی بننے کی کوشش کرتی ہے تو پھر اسے اس کی غلامی کرنی پڑتی ہے۔''

''مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی آپا۔'' دلبر نے روتے ہوئے کہا۔ ''خدا کے لیے میری مدد کرو آپا.....''

''فکر مت کرو۔'' گوہر نے اس کو تسلی دی۔ ''وہ حرام زادہ اب تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تم جس طرح پہلے یہاں رہتی تھیں اسی طرح رہو۔ اس کتے کی اولاد سے تو میں اچھی طرح نمٹ لوں گی۔''

گوہر کے اثر و رسوخ کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ بڑے بڑے سرکاری افسروں، سیاست دانوں اور امیر لوگوں تک اس کی رسائی تھی۔ اس نے دلبر کے خلاف مقدمہ وغیرہ سب ختم کروا

دیا اور فیصل کا دماغ بھی درست کروا دیا۔

''میں نے شادی کے شوق میں مبتلا ہونے والی بہت سی کوٹھے والیوں کو ایسے ہی انجام سے دوچار ہوتے دیکھا ہے۔'' گوہر نے دلبر کو سمجھایا۔ ''یاد رکھو بیٹی عورت کے لیے کوٹھے سے واپسی کے تمام راستے مردوں نے بند کر رکھے ہیں۔''

اس واقعے کے بعد سے فردوسی کے ذہن میں ایک بہت بڑی تبدیلی رُونما ہو گئی۔ اس نے شادی کے خواب دیکھنا اور کسی جیون ساتھی کا سہارا تلاش کرنا چھوڑ دیا۔ اس کے دل میں مردوں کے لیے اب کوئی نرم گوشہ موجود نہیں رہا۔ کسی کی بیوی بننے کی خواہش ختم ہو گئی۔ وہ اپنی آزاد زندگی اسی طرح جینا چاہتی تھی۔ جس طرح وہ جی رہی تھی۔

فردوسی کے پاس کبھی کبھی آنے والے گاہکوں میں اعجاز نامی ایک شخص بھی شامل تھا۔ اعجاز اسلام آباد میں رہتا تھا اور کبھی کبھار لاہور کا چکر بھی لگا لیتا تھا۔ وہ جب بھی لاہور آتا تھا۔ فردوسی کے ساتھ کچھ وقت ضرور گزارتا تھا۔ فردوسی اسے بہت پسند تھی۔ فردوسی کے لیے بھی وہ ایک اچھا اور دل پسند گاہک تھا۔

دونوں کے درمیان جب ذاتی تعلقات زیادہ مستحکم ہوئے تو اعجاز نے رفتہ رفتہ اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

اعجاز نے اسے بتایا کہ وہ دراصل اسلام آباد میں عیاشی کے ایک بہت بڑے اڈے میں کام کرتا ہے جو ایک شان دار کوٹھی میں واقع ہے اور اسلام آباد میں ایک بہت بڑے سرکاری افسر کی بیگم اسے چلاتی ہے۔

''اس اڈے میں کسی معمولی آدمی کا گزر نہیں ہے۔'' اعجاز نے اسے بتایا۔ ''یہاں صرف بہت بڑے بڑے لوگ ہی آتے ہیں جن میں سرکاری افسران، حکام، سیاست دان، وزیر اور غیر ملکی شامل ہیں۔ سب کو معلوم ہے کہ اس کوٹھی کی دیواروں کے پیچھے کیا ہوتا ہے، لیکن کس مائی کے لال کی مجال ہے جو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے اور یہاں اسلام آباد میں یہ ایسا صرف ایک ہی اڈہ نہیں ہے۔ شریفوں اور رئیسوں کی اس بستی میں جا بجا عالیشان کوٹھیوں میں ایسے اڈے قائم ہیں جہاں ہر قسم کا ملکی و غیر ملکی مال دستیاب ہے۔''

اعجاز کے بارے میں اس انکشاف سے فردوسی کو کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ وہ تو مرد کو ہر روپ میں دیکھنے کے تجربے سے گزر رہی تھی۔

کچھ دنوں کے بعد اعجاز نے فردوسی کو پیش کش کی کہ وہ اس کے ساتھ اسلام آباد چلے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اڈے کی مالک بیگم بہت بیمار ہے اور وہ سارے کام کو سنبھال نہیں پا رہی ہے۔'' اعجاز نے فردوسی سے کہا۔ ''اسے ایک ایسی نوجوان اور تجربہ کار لڑکی کی ضرورت ہے جو اڈا چلانے میں اس کی مدد کر سکے۔ اگر تم تیار ہو تو میرے ساتھ چلو۔ ہم مل کر اڈا چلائیں گے اور کافی پیسہ کمائیں گے۔ بیگم کو اس کا حصہ دے کر بھی ہمارے پاس بہت بچے گا.....'' اعجاز اسے کاروبار کی تفصیلات کے بارے میں بتانے لگا۔

فردوسی کو اعجاز کی یہ پیشکش اچھی لگی۔ یہاں تو وہ کوٹھے کی ایک عام لڑکی تھی اور..... اصل حکمرانی تو گوہر کی تھی۔ اعجاز اسے زیادہ آزادی و خودمختاری کے ساتھ کام کرنے کی پیشکش کر رہا تھا۔ یہ کوئی شادی بیاہ والا معاملہ نہیں تھا۔ سیدھا سیدھا ایک کاروباری معاملہ تھا لیکن فردوسی اپنے مفادات کا پورے طور سے تحفظ کر لینا چاہتی تھی۔

''میں تمہارے ساتھ اس صورت میں چلوں گی اگر تم اس بات پر پوری طرح راضی ہو کہ اگر میں کاروبار سے مطمئن نہ ہوئی تو پھر میں واپس اسی جگہ لاہور آ جاؤں گی اور تم مجھے نہیں روکو گے۔'' فردوسی نے کہا۔

''تم ہمارے ساتھ ایک آزاد پارٹنر کے طور پر کام کرو گی۔'' اعجاز نے کہا۔ ''اگر مطمئن نہ ہو تو کام چھوڑ دینا، لیکن مجھے یقین ہے کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ دھندے میں تو ایک دوسرے پر اعتماد کرنا اور مل جل کر کام کرنا ضروری ہوتا ہے۔''

فردوسی نے گوہر سے مشورہ کیا۔ گوہر نہیں چاہتی تھی کہ فردوسی جیسی کماؤ لڑکی اس کے کوٹھے سے چلی جائے۔ تاہم وہ اپنے تجربے سے جانتی تھی کہ اس قسم کے معاملات میں زبردستی کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ فردوسی کے اصرار پر اس نے اس کو اجازت دے دی۔

''آپا..... اگر وہاں کے حالات میری مرضی کے مطابق نہیں ہوئے تو میں واپس تمہارے پاس آ جاؤں گی۔'' فردوسی نے کہا۔ ''میں دلبر کی طرح کسی شادی وادی کے چکر میں نہیں پڑ رہی ہوں۔ میں اپنا کاروبار تبدیل نہیں کر رہی ہوں۔''

''میرے گھر کے دروازے تمہارے لیے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔'' گوہر نے کہا۔ ''جب چاہو واپس آ سکتی ہو۔''

فردوسی اعجاز کے ساتھ اسلام آباد آ گئی اور یہاں اس وسیع و عریض کوٹھی میں قائم عیاشی کے اس شان دار اڈے کو دیکھ کر اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ یہ جگہ تو اس کے تصور سے بھی کہیں زیادہ پُرشکوہ تھی۔

بیگم کو سب لوگ ''بیگم'' کہتے تھے۔ وہ ایک فربہ اندام اور پست قامت عورت تھی اور زمانہ دراز سے شوگر اور ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ تھی۔ ان دنوں اس کی بیماری کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ اس کا شوہر ایک بہت بڑا حاضر سروس سرکاری افسر تھا اور اپنی بیوی کے کاروبار کو مکمل تحفظ فراہم کرتا تھا۔

اعجاز ایک اچھا اور ''ایمان دار'' پارٹنر ثابت ہوا۔ فردوسی نے رفتہ رفتہ اڈے کا سارا کام سنبھال لیا۔ وہ اب یہاں کی منیجر تھی۔ کوئی سال بھر کے بعد بیگم کا انتقال ہو گیا۔ اس کی موت کے بعد اس کے شوہر نے اڈا بند نہیں کیا۔ بلکہ اعجاز اور فردوسی کی نگرانی میں اسے جاری رکھا۔ اس نے ان دونوں سے یہ بات طے کر لی کہ وہ بدستور بیگم کے حصے کی رقم اس کو دیتے رہیں گے اور اڈا چلاتے رہیں گے۔

گزرتے ہوئے برسوں کے ساتھ فردوسی کی طاقت اور دولت میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ وہ اب ایک بہت اہم شخصیت بن چکی تھی۔

''تو یہ ہوں میں.....'' فردوسی نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے مسکرا کر میمونہ کی طرف دیکھا۔ ''میری پیاری دوست میمونہ..... یہ ہے تمہاری فردوسی..... آج کی فردوسی۔''

''اوہ..... یہ سب کچھ کس قدر افسوس ناک ہے۔'' میمونہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ فردوسی سے اور کیا کہے۔

''جیسا بھی ہے، یہی میرا مقدر ہے میمونہ۔'' فردوسی نے کہا۔ ''اور اس کا انتخاب میں نے خود نہیں کیا ہے۔ میری زندگی بہت مختلف ہو سکتی تھی اگر مجھے بھی بابا راحت علی جیسا کوئی مہربان اور نیک دل بزرگ یا ڈاکٹر ظہیر جیسا شریف انسان مل جاتا۔ لیکن میری زندگی میں تو صرف بدکار، عیاش اور بے حیا مرد ہی آئے اور میں ایک بار ان موذیوں کے چنگل میں پھنس جانے کے بعد پھر وہاں سے نہیں نکل سکی اور جانتی ہو، اب میرے پاس دولت کی کس قدر فراوانی ہے؟ کتنے لوگ میرے ذریعے اسلام آباد کے اقتدار کے ایوانوں تک اپنی طرح طرح کی سفارشیں پہنچواتے ہیں؟ میرے ایک فون پر کتنے لوگوں کی قسمتیں بدل جاتی ہیں اور میں..... میں اس کام کی پوری پوری قیمت وصول کرتی ہوں..... کبھی مجھے بار بار بیچا اور خریدا گیا تھا۔ اب میں خود لڑکیاں خریدتی ہوں۔ بیگم مجھے سب کچھ سکھا کر مری ہے۔ اس عرصے کے دوران میں نے اپنے اڈے کے لیے کتنی ہی لڑکیاں خریدی ہیں۔ مہینے دو مہینے کے بعد میں پشاور کے قرب و جوار میں واقع افغان کیمپوں اور بستیوں کا چکر لگاتی ہوں۔ پھٹے پرانے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

غلیظ چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی یہ افغان لڑکیاں جب اپنے میلے کچیلے اور بدبودار جسموں کے ساتھ اسلام آباد آتی ہیں تو چند گھنٹوں کے اندر اندر ان کی کایا پلٹ جاتی ہے اور وہ پہچانی نہیں جاتیں۔ جو کل تک زمانے کی ٹھوکروں میں تھیں، وہ آج بڑے بڑے سورماؤں سے ناک رگڑواتی ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ تمہیں یہ سب کچھ بہت بُرا لگ رہا ہوگا۔ مجھے بھی بُرا لگتا ہے۔ لیکن میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ میرے موجودہ راستے کا آغاز تو اسی دن ہو گیا تھا جب مجھے میرے شہر جیسور کے نواحی گاؤں سے اغوا کیا گیا تھا۔ میں سمجھتی ہوں کہ مردوں کی ساری کمینگیوں اور رذالتوں کا جواب ہی کوٹھے والی عورتیں ہیں میمونہ، جوان مردوں سے اپنے تلوے چٹواتی ہیں اور انہیں جی بھر کر لوٹتی ہیں۔'' فردوسی کا لہجہ سخت ہو گیا تھا اور اس کی آواز میں جیسے شعلے لپکنے لگے تھے۔

''مگر وہ خود بھی تو لٹ چکی ہوتی ہیں فردوسی۔'' میمونہ نے گہری اداسی کے ساتھ کہا۔

''مرد کا تو کچھ بھی نقصان نہیں ہوتا لیکن عورت تو لٹ جاتی ہے۔ برباد ہو جاتی ہے۔''

''ٹھیک کہتی ہو.....'' فردوسی نے کہا۔ ''تو پھر راستہ کیا ہے؟ آخر جینے کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ تو تلاش کرنا ہی پڑتا ہے۔ کیا خودکشی کر لینی چاہیے؟ اپنے آپ کو ہلاک کر لینا چاہیے۔''

''نہیں نہیں.....'' میمونہ نے جلدی سے کہا۔ ''میں یہ تو نہیں کہتی۔''

''میں جب لاہور میں گوہر کے کوٹھے پر تھی تو وہاں زیادہ تر لڑکیاں ایسی تھیں جو خاندانی طوائف زادیاں نہیں تھیں۔'' فردوسی آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔ ''ان سب کو کوٹھے تک پہنچانے کا ذمہ دار کوئی نہ کوئی مرد تھا اور بعض اوقات سگے رشتہ دار بھی، وہ بھی، جن کے ساتھ خون کا رشتہ تھا۔ میں سندھ کے ایک گاؤں کی رہنے والی اس لڑکی حسنہ کو کبھی نہیں بھول سکوں گی جس کو اس کے گاؤں سے ڈاکو اغوا کر کے لے گئے اور بعد میں انہوں نے اس کو رہا کر دیا تھا۔ رہائی کے بعد حسنہ کو معلوم ہوا کہ ڈاکوؤں نے تو صرف اس کی عزت لوٹی تھی، اس کے خاندان والے تو اس کی جان لے لینا چاہتے تھے۔ جرگے نے اس کے قتل کا حکم صادر کر دیا تھا اور اس کے خاندان والوں نے اس حکم کو قبول کر لیا تھا۔ لیکن حسنہ مرنا نہیں چاہتی تھی۔ دوسری تمام مظلوم عورتوں کی طرح وہ بھی زندہ رہنا چاہتی تھی۔ وہ رات کے وقت گاؤں سے بھاگ نکلی اور نہ جانے کن کن راہوں سے گزرتی ہوئی لاہور آن پہنچی۔ اس کے پاس بچانے کے لیے صرف اپنی جان تھی جسے وہ ہر قیمت پر بچانا چاہتی تھی۔ باقی سب کچھ تو لٹ چکا تھا۔ وہ گوہر کے کوٹھے پر آ گئی۔ یہاں اس کی جان بھی محفوظ رہی اور اس کے زندہ رہنے کے اسباب بھی

فراہم ہو گئے۔ وہ آج بھی وہیں، اسی جگہ موجود ہے اور بے خوف زندگی گزار رہی ہے۔''

کچھ دیر تک خاموشی طاری رہی۔ فضا میں جیسے فردوسی کے لہجے کی تلخی گھلتی گئی تھی۔ میمونہ کا دل بہت بھاری ہو رہا تھا۔ آج ایک طویل عرصے کے بعد ایک بار پھر اس کے دل کے سارے زخم جیسے ہرے ہو گئے تھے۔

''وہ آدمی جو کچھ دیر پہلے میرے ساتھ کھڑا ہوا مجھ سے باتیں کر رہا تھا، جانتی ہو وہ کون ہے؟'' قدرے توقف کے بعد فردوسی نے کہا اور میمونہ کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے خود ہی اپنی بات جاری رکھی۔ ''وہ خلیجی ریاستوں کے مالدار شیوخ کو لڑکیاں سپلائی کرتا ہے۔ اس دھندے میں نہ جانے کتنے بڑے بڑے لوگ اس کے ساتھ شریک ہیں۔ وہ اب اس کام میں میری مدد بھی لینا چاہتا ہے۔ یہاں خوف نام کی کوئی چیز نہیں ہے میمونہ۔ نہ قانون کا خوف، نہ خدا کا خوف، نہ قیامت کا خوف، اور میں خود بھی ان بے خوف لوگوں کا ایک حصہ بن چکی ہوں۔''

میمونہ دم بخود تھی۔

''تمہارا کبھی اپنے گھر والوں سے کوئی رابطہ قائم ہوا؟'' میمونہ نے موضوع بدلتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''نہیں۔'' فردوسی نے جواب دیا۔ ''میں نے ان سے رابطہ قائم کرنے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی اور نہ کروں گی۔ وہ سب لوگ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے اور میں ان پر ظلم نہیں کرنا چاہتی۔ جتنا دکھ انہیں پہنچ چکا ہے، وہ اسی کے ساتھ زندہ رہیں تو اچھا ہے۔ اگر میں نے ان کو نیا دکھ دیا تو ان کے لیے ہر سانس عذاب بن جائے گی، وہ جیتے جی مر جائیں گے۔''

فردوسی ذرا دیر کے لیے رکی۔ ''جانتی ہو.....'' اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ''پچھلے سال میں ڈھاکا گئی تھی..... میں نے زندگی میں پہلی بار ڈھاکا دیکھا۔''

''ڈھاکا؟ تم ڈھاکا گئی تھیں؟'' میمونہ نے حیرت سے کہا۔ ''کس لیے؟ کیسے؟''

''ایک سرکاری افسر جعلی پاسپورٹ پر مجھے اپنی بیوی ظاہر کر کے سرکاری خرچے پر اپنے ساتھ ڈھاکا لے گیا تھا جہاں اسے کچھ دوسرے پاکستانی افسروں کے ساتھ ایک کانفرنس میں شریک ہونا تھا۔ میں چار دن ڈھاکا میں رہی۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ وہ خوشی اور اذیت کی کیسی عجیب و غریب کیفیت تھی جس میں میں مبتلا رہی۔''

''میں بخوبی اندازہ لگا سکتی ہوں۔'' میمونہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

''اچھا..... اب میرا ایک ضروری اپائنٹ منٹ ہے۔'' فردوسی نے اپنی کلائی پر بندھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قیمتی گھڑی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں اپنا کارڈ دے رہی ہوں۔ اگر تمہارا جی چاہے تو فون کر لینا۔ مجھے کہیں بلا لینا یا اگر ہمت کر سکو تو میرے گھر آ جانا..... تم سے دوبارہ ملاقات کر کے مجھے بہت خوشی ہوگی۔ شاید تم کو تو نہ ہو.....'' اس نے ہنستے ہوئے کہا اور اپنے پرس میں سے ایک کارڈ نکال کر میمونہ کو تھما دیا۔ اس کے بعد وہ وہاں سے چلی گئی۔

''ہم لوگ ایک دن مزید اسلام آباد میں رہے۔'' میمونہ نے اپنی گفتگو ختم کرتے ہوئے ماجدہ سے کہا۔ ''میں نے ظہیر کو فردوسی سے ملاقات کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا اور پھر ہم دونوں نے ہی فیصلہ کیا کہ ہم فردوسی سے کوئی رابطہ نہ رکھیں۔ چنانچہ میں نے اسے فون کیا اور نہ میں اس سے دوبارہ ملی۔ پھر کبھی فردوسی سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔''

ماجدہ بڑی دکھ بھری خاموشی اور ملال آمیز توجہ کے ساتھ میمونہ کی گفتگو سن رہی تھی۔ جب میمونہ نے اپنی بات ختم کی تو ماجدہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور خود میمونہ کی آنکھیں بھی بھیگ رہی تھیں۔

''ہم تین لڑکیاں.....'' ماجدہ نے بہت آہستہ سے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''ہماری اپنی چھوٹی چھوٹی دنیائیں تھیں..... کتنی خوبصورت اور پُرسکون، ہم لوگ کتنے خوش تھے..... مگر پھر ہم سے ہمارا سب کچھ چھین لیا گیا..... تقدیر نے ہمیں کہاں سے کہاں لا پھینکا..... کیسی دربدری ہے.....''

''میں اور تم تو پھر بھی خوش قسمت نکلے کہ ہمارے گھر آباد ہو گئے لیکن فردوسی..... ہائے، میں جب اس کے بارے میں سوچتی ہوں تو میرے دل پر ایسی گہری چوٹ لگتی ہے کہ کچھ نہ پوچھو..... انسان اپنے دل کو سمجھانے کے لیے کیسی کیسی باتیں سوچنے لگتا ہے۔''

باتوں باتوں میں کتنی دیر ہو گئی تھی۔ بچوں کے اسکول سے واپس آنے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ ابھی کھانا تیار کرنا تھا۔ ماجدہ کے ساتھ میمونہ بھی باورچی خانے میں آ گئی اور دونوں مل کر کھانے کی تیاری میں مصروف ہو گئیں۔ اس دوران بھی ان کے درمیان گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔

''یہ بتاؤ کہ یہ بوتیک والے تمہیں کچھ معقول پیسے بھی دیتے یا نہیں؟''

''بس، گزارا ہو جاتا ہے۔'' ماجدہ نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''محنت تو بہت کرنی پڑتی ہے لیکن سچ یہ ہے کہ معاوضہ محنت کے مطابق نہیں ہوتا.....''

''جبکہ تم لوگوں کے تیار کردہ ملبوسات پر یہ دکاندار اندھا دھند منافع کماتے ہیں۔''

میمونہ نے بے زاری کے ساتھ کہا۔ ''لیکن محنت کرنے والوں کو پیسہ دیتے ہوئے تو انہیں موت آتی ہے۔ تم نے کبھی خود اپنا کاروبار شروع کرنے کی کوشش نہیں کی؟''

''اپنا کاروبار شروع کرنے کے لیے پہلے تو پیسہ لگانے کی ضرورت ہوتی ہے۔'' ماجدہ نے کہا۔ ''اور میرے پاس اتنا پیسہ نہیں ہے۔ دو چار جوڑے تیار کرنے سے تو کام نہیں چلے گا نا..... اس کے لیے تو کافی تعداد میں جوڑے تیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''میں ظہیر سے بات کروں گی۔'' میمونہ نے کہا۔ ''اگر کوئی صورت نکل سکی تو اپنا کاروبار کرنے میں بہت زیادہ منافع ہے۔''

کچھ دیر کے بعد بچے اسکول سے آ گئے۔ ثمینہ، میمونہ آنٹی سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ سب سے زیادہ خوشی کی بات تو یہ تھی کہ میمونہ آنٹی بنگالی بولتی تھیں۔ ثمینہ کو اپنے گھر کے علاوہ اور کہیں بھی بنگالی بولنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ وہ بہت جلد میمونہ آنٹی سے بے تکلف ہو گئی۔

باتوں کا طویل سلسلہ تھا کہ کسی طرح ختم ہونے میں ہی نہیں آتا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے دوران بھی باتیں ہوتی رہیں، لیکن ماجدہ اور میمونہ دونوں ہی اب بہت سنبھل کر گفتگو کر رہی تھیں۔ گھر میں اب ثمینہ موجود تھی اور وہ اپنی زندگی کے بارے میں ہر بات ثمینہ کے سامنے نہیں کر سکتی تھی۔

میمونہ شام تک ماجدہ کے گھر میں رہی۔ اس نے تنہائی میں ماجدہ سے کہا۔ ''فردوسی کا پتہ اور فون نمبر میرے پاس موجود ہے۔ کیا تم اس سے ملنا یا بات کرنا پسند کرو گی۔''

''نہیں میمونہ۔'' ماجدہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا۔ ''اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی اپنی دنیا ہے جو ہماری دنیا سے بالکل الگ ہے۔ ہم اس سے مل کر اسے دکھ نہ دیں تو اچھا ہی ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' میمونہ نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔ ''اسی لیے میں نے اس سے کبھی رابطہ قائم نہیں کیا۔ خود اس نے بھی کبھی مجھ سے ملنے یا فون کرنے کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ میرے گھر کا پتہ اور فون نمبر اس کے پاس موجود ہے۔ ہم لوگ واقعی اب الگ الگ دنیاؤں سے تعلق رکھتے ہیں اور فردوسی خواہ کتنا ہی خوش نظر آنے کی کوشش کیوں نہ کرے، میں اس کے اندر کے دکھ کو بہت اچھی طرح سمجھتی ہوں۔''

میمونہ کو لینے کے لیے ڈاکٹر ظہیر شام کو خود ماجدہ کے گھر آیا تھا اور اس نے ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر شام کی چائے پی تھی۔ ایک طویل عرصے کے بعد ماجدہ کو ایسا لگ رہا تھا جیسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ اپنے خاندان کے لوگوں کے درمیان بیٹھی ہوئی ہے۔ اپنائیت اور یگانگت کا ایک ایسا احساس تھا جس کا پاکستان میں اپنے طویل قیام کے دوران اسے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔

چند روز کے بعد میمونہ ایک روز شام کو ماجدہ کے گھر آئی۔ اس بار اس کا شوہر ڈاکٹر ظہیر بھی ساتھ آیا تھا۔

''ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم لوگ کچھ مل جل کر کام کریں۔'' میمونہ نے تجویز پیش کی۔

''ظہیر نے کچھ جاننے والے دکانداروں سے بات کی ہے جو ہمارے تیار کردہ ملبوسات کو مناسب قیمت پر خریدنے کے لیے آمادہ ہیں۔ تم رقم کی فراہمی کی فکر مت کرو۔ رقم ہم لگائیں گے اور تم اپنی نگرانی میں ملبوسات تیار کرواؤ..... کاروبار میں جو بھی منافع ہوگا، اس میں سے تھوڑی تھوڑی کر کے تم یہ رقم ادا کرتی رہنا۔ ہم اس منافع میں سے اپنا کوئی حصہ نہیں لیں گے۔''

یہ ایک بے حد فراخدلانہ پیشکش تھی لیکن ماجدہ اس کے لیے اس طرح سے راضی نہیں ہوئی۔ اس نے میمونہ اور ظہیر کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ منافع میں سے اپنا حصہ لیں اور کاروبار میں پارٹنر کے طور پر شریک ہوں۔ بالآخر ان کے درمیان ایک سمجھوتہ طے پا گیا اور اس کے فوراً ہی بعد ان کے مشترکہ کاروبار کا آغاز ہو گیا۔

ظہیر اور میمونہ کی کوششوں اور ماجدہ کی ہنرمندی اور محنت کے نتیجے میں جلد ہی کام تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ ماجدہ نے اپنی مدد کے لیے دو عورتوں کی خدمات بھی حاصل کر لیں۔

ایک سال کے اندر ماجدہ نے اپنے کام میں کافی ترقی کر لی۔ جب اس نے دکانوں کے لیے خود مال سپلائی کرنا شروع کیا تو اسے اندازہ ہوا کہ اس طرح آمدنی میں کتنا زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس نے کاروبار شروع کیا تو کاروبار کے اسرار و رموز بھی اس پر منکشف ہونے لگے اور اسے میمونہ کی اس سچائی کا عملی طور پر بخوبی اندازہ ہوا کہ بوتیک والے اب تک اس کا کتنا استحصال کرتے رہے تھے۔

میمونہ اور ظہیر کے خاندان کے ساتھ ماجدہ کے بہترین خاندانی تعلقات قائم ہو چکے تھے، جن کو برابر استحکام حاصل ہوتا جا رہا تھا۔ دونوں خاندانوں کے بچے بھی ایک دوسرے سے بہت قریب تھے۔ یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے بنگالی بولتے تھے اور اس سے انہیں بہت خوشی حاصل ہوتی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ماجدہ کے حالات میں بڑی تیزی کے ساتھ تبدیلی آتی جا رہی تھی۔ اس کا کام خوب چل رہا تھا۔ اب اس نے ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا تھا،

جہاں ملبوسات کی تیاری کا کام کیا جاتا تھا۔ یہاں کئی عورتیں کام کرتی تھیں۔ مشینوں وغیرہ کا قسطوں پر بندوبست ہو گیا تھا اور ان کی قیمت تیزی کے ساتھ ادا کی جا رہی تھی۔ ماجدہ کا کافی وقت اپنے اس چھوٹے سے کارخانے میں گزرتا تھا، جہاں وہ اپنی نگرانی میں کام کرواتی تھی۔

گھر میں خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ تینوں بچے پڑھ رہے تھے۔ نیا کاروبار شروع کیے ہوئے پانچ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ ثمینہ اب تقریباً چودہ سال کی ہو چکی تھی۔

ماجدہ اب ایک باقاعدہ پاکستانی شہری تھی۔ اس کے پاس پاکستان کا شناختی کارڈ تھا اور اس کے بچوں کا بھی رجسٹریشن موجود تھا۔ غیر ملکی اور غیر قانونی تارک وطن ہونے کے عذاب سے وہ ہمیشہ کے لیے نجات پا چکی تھی۔ وہ خود پوری طرح محفوظ تھی اور اس کے بچوں کا مستقبل بھی مکمل طور پر محفوظ تھا۔ بچے بنگالی کے علاوہ اردو اور پنجابی بھی روانی کے ساتھ بولتے تھے۔ وہ تینوں انگریزی میڈیم کے اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ بچوں نے بنگلہ دیش کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس دور دراز واقع سرزمین کے بارے میں وہ صرف اپنی ماں سے ہی سنتے تھے۔ بچوں کے لیے پاکستان ہی سب کچھ تھا۔ انہوں نے تو یہاں کی فضاؤں میں آنکھ کھولی تھی۔ ان کے وجود کا پودا تو اس ملک کی سرزمین سے ابھرا تھا۔ انہوں نے بنگلہ دیش کبھی نہیں دیکھا تھا۔ انہیں اس سرزمین سے کوئی جذباتی وابستگی تھی اور نہ انہیں اپنی زندگی میں اس کی کوئی کمی محسوس ہوتی تھی۔

ثمینہ کی عمر اب تقریباً سترہ سال کی ہو چکی تھی اور وہ کالج میں پڑھ رہی تھی۔ وہ ہو بہو اپنی ماں کی تصویر تھی اور جب وہ اور ماجدہ ساتھ ساتھ ہوتیں تو دیکھنے والے ان کو چھوٹی بڑی بہنیں سمجھتے تھے۔ ماجدہ جب خود بھی اپنی بیٹی کو دیکھتی تو اس کے دل پر ایک سرشاری کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ کیسی طرح دار اور خوبصورت تھی اس کی نوجوان بیٹی! اسے اپنی بیٹی کے چہرے میں خود اپنا چہرہ نظر آتا، لیکن اپنے سے کہیں زیادہ دلکش اور حسین۔ وہ ثمینہ کے خدوخال میں اس کے باپ شریف الدین کی کوئی جھلک تلاش کرنے کی کوشش کرتی لیکن ثمینہ میں اپنے باپ کی کوئی شباہت موجود نہیں تھی۔ ماجدہ اس بات سے بہت خوش ہوتی تھی۔ ثمینہ اس کی پہلی اولاد تھی۔ ثمینہ کے وقت ماجدہ زندگی میں پہلی بار ماں بننے کے تجربے سے گزری تھی۔ اگرچہ اس وقت وہ بہت نامساعد حالات کا شکار تھی، لیکن اس کے باوجود وہ اس کی زندگی کا یادگار اور دلکش تجربہ تھا۔ پہلی بار ماں بننے کا تجربہ..... اپنے وجود سے ایک دوسرے تروتازہ اور نئے وجود کو تخلیق کرنے کا تجربہ..... اس وقت اس کی اس خوشی میں شریک ہونے والا خود اس کے اپنے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ لے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دے کے ایک تسلیم تھی جو زچگی کے تمام عرصے کے دوران اس کا خیال رکھتی رہی تھی۔

ثمینہ کے باپ شریف الدین کو ماجدہ نے ماضی کی کسی گندی نالی میں پھینک دیا تھا اور ہمیشہ کے لیے اس پر لعنت بھیج دی تھی۔ ثمینہ اس کے جگر کا ٹکڑا تھی اور کیسے کیسے نامساعد حالات میں اس نے ثمینہ کی پرورش کی تھی اور کس طرح وہ اس کو بچاتی اور اس کی حفاظت کرتی چلی آئی تھی۔ ثمینہ پر اس نے اپنے ماضی کی پرچھائیں بھی نہیں پڑنے دی تھی۔ اپنے باپ کے بارے میں ثمینہ کو بس یہی معلوم تھا کہ اس نے اس کی ماں کو طلاق دے دی تھی اور اب وہ اس دنیا میں موجود نہیں ہے، جبکہ خود ماجدہ کو اس کی کوئی خبر نہیں تھی کہ شریف الدین زندہ ہے یا جہنم رسید ہو چکا ہے، اور نہ ہی اسے اس بات سے کوئی دلچسپی تھی۔

ثمینہ لڑکی تھی اور ماجدہ حتی المقدور اپنی آنکھ کی پتلی کی طرح اس کی حفاظت کرتی تھی۔ وہ ہر وقت ڈرتی رہتی تھی کہ جو کچھ اس کے اپنے ساتھ ہوا تھا خدانہ کرے، کہیں ایسا ہی کچھ ثمینہ کے ساتھ بھی نہ ہو جائے۔ وہ ایک انجانے خوف کا شکار رہتی تھی۔

جہاں تک بیٹوں کا تعلق تھا۔ تو ان کے بارے میں اس طرح پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو لڑکے تھے اور لڑ بھڑ کر کسی نہ کسی طرح دنیا میں اپنے لیے جگہ بنا سکتے تھے۔ سارے عذاب تو لڑکی کے مقدر میں لکھے ہوتے ہیں۔ وہ اگر ایک بار کسی کے دھکا دینے سے کہیں پھسل کر گر پڑے تو پھر اس کے لیے اٹھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

☆======☆======☆

جینے کا حوصلہ تو ہر حال میں انسان کے اندر موجود ہوتا ہے اور انسان بڑے سے بڑے صدمے کو جھیل کر پھر بھی زندہ رہنے کی راہیں تلاش کر لیتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو شاید سارے ہی لوگ خودکشی کر لیں، لیکن ہر انسان کے دکھ اس کے اپنے دکھ ہوتے ہیں، جن کی شدت اور گہرائی کو صرف وہی محسوس کر سکتا ہے۔ پھر جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے، ویسے ویسے دکھوں کی اذیت ناکی میں کمی ہوتی جاتی ہے اور انسان ان کے ساتھ زندہ رہنے کا عادی ہو جاتا ہے۔

ماجدہ اب تک اپنے بہت سے پرانے دکھوں کے ساتھ زندہ تھی جن میں سب سے بڑا دکھ ہاشم سے جدائی کا تھا جو اپنے گھر والوں سے بچھڑ جانے کے عمومی غم کا غالب حصہ تھا۔

ماجدہ کی کاروباری سرگرمیوں میں اب اور بھی زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کے ملبوسات تیار کرنے کے چھوٹے سے کارخانے میں کئی عورتیں اور مرد کام کرتے تھے اور اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے معین جیسا ایک قابلِ اعتماد آدمی ملا ہوا تھا جو انتظامی امور میں اس کی پوری

طرح مدد کرتا تھا۔

اس روز رات کے وقت ماجدہ اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ اتفاق سے کیبل پر فلم دیوداس آ رہی تھی۔ یہ ہندوستان میں بننے والی نئی دیوداس تھی۔

فلم شروع ہوئی تو ماجدہ اس کے سحر میں گم ہو گئی۔ یہ صرف اس فلم کا سحر نہیں تھا بلکہ اس میں ماجدہ کی زندگی کا اپنا سب سے بڑا درد گھلا ہوا تھا، جو ایک بار پھر بڑی شدت کے ساتھ اس کے سارے وجود میں بہہ نکلا تھا۔

فلم کے شروع ہوتے ہی ماجدہ کی نظروں سے اس کی موجودہ دنیا اوجھل ہو گئی۔ وہ آج سے تقریباً ربع صدی پہلے کی اس دنیا میں واپس پہنچ گئی جب اس کی عمر صرف نو سال کی تھی۔ وہ ہاشم کے ساتھ تھی، اس شخص کے ساتھ جس کے لیے اپنے دل میں موجود محبت کی گہرائیوں کا اسے اس وقت تک ٹھیک سے اندازہ بھی نہیں تھا۔ اس محبت کی شدت اور گہرائی اور گیرائی کو تو اس نے پوری طرح اس وقت محسوس کرنا شروع کیا تھا جب وہ اور ہاشم اندوہ ناک حالات میں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے تھے۔

وہ اب کھلنا میں تھی۔ ہاشم اس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور پردۂ سیمیں پر دیوداس فلم چل رہی تھی۔ بلیک اینڈ وائٹ فلم کے مناظر تیزی سے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے چلے جا رہے تھے۔ ذرا ذرا دیر بعد ایک جھماکا سا ہوتا اور بلیک اینڈ وائٹ فلم چمکتی دمکتی رنگین فلم میں بدل جاتی لیکن درد کی لہریں اسی طرح برقرار رہتیں۔

اور پھر آخری سین آیا۔ دیوداس نے پاروتی کے شوہر کی حویلی کے دروازے کے باہر جان دے دی۔ اندر حویلی میں بدحواس پاروتی دیوداس کی شناخت ہو جانے کے بعد دیوانہ وار بھاگتی ہوئی پھاٹک کی طرف آ رہی تھی اور اس کا شوہر، سوتیلا بیٹا اور حویلی کے ملازمین اس کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پاروتی کی ساڑھی کا پلو زمین پر گھسٹتا چلا جاتا تھا اور حویلی کا پھاٹک بند کر دیا گیا۔

فلم ختم ہو گئی اور چینل سے اشتہارات آنے لگے لیکن ماجدہ کو اس کی خبر نہ ہوئی۔ اس کی نظروں کے سامنے دیوداس کا مردہ چہرہ تھا۔

اس رات پچیس سال پرانا درد دل میں اس قدر شدت کے ساتھ ابھرا کہ ماجدہ تڑپ تڑپ گئی۔ پچیس سال کی اس طویل مدت کے دوران ہاشم پر نہ جانے کیا گزری ہو گی۔ وہ کیسا ہو گا؟ کہاں ہو گا؟ اب تو اس کی بھی جوانی رخصت ہو چکی ہو گی۔ وہ بھی اب عمر کی درمیانی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

منزل میں ہوگا اور اگر وہ اتفاقاً سامنے آجائے؟ دونوں کا آمنا سامنا ہو جائے؟ تو پھر کیا ہوگا؟ ہونٹوں پر غمناک تبسم کی ایک ہلکی سی لرزش..... آنکھوں میں حیرت دیدار..... برسوں سے آنکھوں سے جوئے خوں کی طرح چپکے چپکے بہنے والا درد اپنے اظہار کے لیے کون سی شکل اختیار کرے گا؟ ان دید کے لمحوں میں کتنی صدیوں کی داستانیں سمٹ آئیں گی؟ احوال کی پُرسش کا کیا قرینہ ہوگا؟

اس کے اور ہاشم کے درمیان پچیس سالہ بلند و بالا ایک دیوار ہجراں حائل تھی، جس کے پیچھے محض ایک سایہ سا لرزتا تھا اور اگر یہی سایہ اچانک فروزاں ہو کر مطلع انوار بن کر اس کی آنکھوں کے سامنے آجائے تو پھر کیا ہوگا؟ کیا ہوگا؟

اچانک اس کے دل میں اضطراب کی ایک بہت تیز و تند لہر اٹھی۔ کاش..... کاش..... وہ ایک بار ہاشم کو دیکھ سکتی..... صرف ایک بار..... چند لمحوں کے لیے ہی سہی۔ اس کے بارے میں جان سکتی، اس سے پوچھ سکتی کہ اس نے اس کے بغیر زندگی کے یہ پچیس سال کس طرح گزارے اور خود اس کو یہ بتا سکتی کہ اس طویل عرصہ جدائی میں اس کے الم نصیب دل باوفا پر کیا گزری۔ کاش..... کاش..... زندگی اسے اتنی مہلت دے اور اسے اس کا موقع فراہم کر سکے۔

اس رات وہ بہت کم سو سکی۔ عمر رفتہ کے بچھڑے ہوئے درد بار بار ابھر کر اس کو جگا دیتے تھے۔ صبح اٹھی تو آنکھیں بوجھل اور سر بھاری ہو رہا تھا۔

''کیوں نہ ایک چکر بنگلہ دیش کا لگایا جائے؟'' اس کے دل میں خیال آیا۔ وہ اپنے گھر والوں کو خط لکھ کر اپنے بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہتی تھی۔ اگر خط ہی لکھنا ہوتا تو بہت پہلے لکھ سکتی تھی لیکن زندگی نے اسے جن پُر پیچ راستوں میں پھنسا دیا تھا، ان کے بارے میں وہ اپنے گھر والوں کو نہ تو بتا سکتی تھی اور نہ بتانا چاہتی تھی..... لیکن اب تو یہ ساری باتیں پرانی ہو چکی تھیں۔ برسوں سے وہ ایک باعزت اور جمی جمائی زندگی گزار رہی تھی۔ وہ اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ ساری دنیا کے سامنے اپنے آپ کو بلا جھجک پیش کر سکتی تھی۔

اس شام کو اس کی ملاقات میمونہ سے ہوئی۔ میمونہ اس کی وہ واحد رازداں تھی جو ہاشم کے ساتھ اس کے تعلق خاطر سے بخوبی واقف تھی۔ ماجدہ نے اپنی زندگی کے تقریباً تمام اہم رازوں میں میمونہ کو شریک کر لیا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' میمونہ نے ماجدہ کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا کچھ طبیعت خراب ہے؟ آج تم بہت بجھی بجھی سی لگ رہی ہو؟''

''نہیں..... طبیعت تو ٹھیک ہے۔'' ماجدہ نے بہت آہستہ سے کہا۔ ''کل رات میں نے دوبارہ پھر وہی فلم دیکھی، لیکن نئی کاسٹ کے ساتھ..... تب سے یہی سوچ رہی ہوں کہ کاش، ہاشم کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکتا۔ سوچتی ہوں کہ ایک بار مادھو پور ہو آؤں۔ میں تو بہت پہلے ہی وہاں جا سکتی تھی..... حالات ٹھیک ہو گئے تھے..... لیکن بس، سوچ ہی سوچ میں وقت گزرتا چلا گیا۔''

''میں بھی کبھی نہیں گئی۔'' میمونہ نے مضطربانہ اور پُر ہیجان انداز میں کہا۔ ''بس، خط ہی لکھتی رہی اپنے گھر والوں کو اور جواب کے انتظار میں وقت گزارتی رہی۔ مجھے ان لوگوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم ہو سکا۔ میں نے کتنی بار سوچا کہ ایک بار وہاں جاؤں، ہمت کروں، دیکھوں کہ وہ لوگ کیسے ہیں، کہاں ہیں..... مگر بس، تمہاری طرح میں بھی سوچ سوچ کر رہ گئی۔ ایک نامعلوم سا خوف دل و دماغ پر مسلط رہا اور میں اپنے آپ کو وہاں جانے کے لیے تیار نہ کر سکی..... تو پھر کیوں نہ ہم دونوں چلیں؟''

''ہاں..... ہاں.....'' ماجدہ نے سخت ہیجان اور اشتیاق کے عالم میں کہا۔ ''ہم دونوں چلیں گے، ضرور چلیں گے..... تم ظہیر بھائی سے بات کرو۔ انہیں بھی ہمارے ساتھ چلنا چاہیے۔''

ان دونوں نے اسی وقت بنگلہ دیش جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میمونہ نے جب اپنے شوہر سے بات کی تو وہ بھی فوراً راضی ہو گیا۔ وہ اسلام آباد میں پیدا ہوا تھا اور اس نے بنگال کبھی نہیں دیکھا تھا۔

ماجدہ نے سارا کام معین کے سپرد کر دیا اور اسے سب کچھ اچھی طرح سمجھا دیا۔ اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی، کیونکہ معین خود بہت سمجھدار اور قابلِ اعتماد آدمی تھا۔ ماجدہ اور میمونہ کا اندازہ تھا کہ وہ لوگ زیادہ سے زیادہ دو ہفتے میں واپس آجائیں گی۔ میمونہ اور ڈاکٹر ظہیر کو زیادہ لمبی چھٹی بھی نہیں مل سکتی تھی۔

ماجدہ جب اپنے دونوں بچوں کے ساتھ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر ڈھاکا کے لیے روانہ ہوئی تو اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ یہ سفر خواب میں کر رہی ہو اور ابھی ذرا دیر میں خواب کا یہ طلسم ٹوٹ جائے گا اور وہ حقیقت کی سنگین دنیا میں واپس آجائے گی۔ آج سے تقریباً پچیس سال پہلے محض نو سال کی عمر میں وہ پیدل اور ٹرین کا طویل سفر طے کر کے نامعلوم راستوں سے گزرتی ہوئی ایک انجان منزل کی طرف آئی تھی۔ وہ بنگالن تھی، بنگلہ دیش کی شہری اور پاکستان کی سر زمین پر پہنچ کر اسے معلوم ہوا تھا کہ وہ یہاں ایک غیر قانونی تارک وطن ہے جسے گرفتار کیا جا سکتا ہے اور جیل بھی بھیجا جا سکتا ہے..... اور اب وہ پاکستانی پاسپورٹ پر ایک پاکستانی شہری کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حیثیت سے بنگلہ دیش کا سفر کر رہی تھی۔ وہ ایک غیر ملکی کے طور پر اپنے وطن جا رہی تھی۔

ڈھاکا ایئرپورٹ پر جہاز کے اترتے ہی جیسے دنیا بدل گئی۔ ہر طرف سے بنگلہ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ماجدہ کا دل ایک انوکھے احساس مسرت سے جھوم رہا تھا۔ بچے خوشی سے زیادہ حیرت کا شکار تھے۔ انہوں نے لاہور میں اپنے گھر والوں اور کچھ گنے چنے لوگوں کے علاوہ کسی کو بنگلہ بولتے نہیں سنا تھا اور یہاں تو ہر شخص بنگلہ بول رہا تھا۔

ان لوگوں کا پروگرام یہ تھا کہ وہ سب سے پہلے نورگنج جائیں گے جو کھلنا سے کوئی پچاس کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ایک گاؤں تھا جہاں سے میمونہ کا تعلق تھا۔ پھر نورگنج میں میمونہ کے گھر والوں سے ملاقات کر کے سب لوگ مادھوپور جائیں گے اور وہاں ماجدہ کے گھر والوں سے ملیں گے۔

ان لوگوں نے تین دن ڈھاکا میں قیام کیا اور اس دوران اس شہر کی بہت اچھی طرح سیر کی۔ یہ واقعی ایک دوسرا ملک تھا، یہاں کی ہر چیز پاکستان سے بہت مختلف تھی۔ لوگ بھی بہت مختلف تھے۔ مگر ایک چیز تھی جو دونوں جگہ ایک بہت مضبوط قدر مشترک کی حیثیت رکھتی تھی اور وہ تھی غربت۔ ڈھاکا کی سڑکوں پر اور گلی کوچوں میں غربت اور مفلسی کا کم و بیش وہی عالم نظر آتا تھا جو لاہور اور کراچی میں نظر آتا تھا اور جس سے یہ سب لوگ بہت اچھی طرح واقف تھے۔ بھیک مانگنے والوں کی زبان تو ضرور الگ تھی لیکن لب و لہجے کی دردانگیزی اور رحم طلبی تو ایک ہی جیسی تھی۔

ان لوگوں نے ڈھاکا میں ایک درمیانہ درجے کے ہوٹل میں قیام کیا تھا اور وہیں سے کھلنا، مادھوپور اور نورگنج کے بارے میں ساری ضروری معلومات حاصل کی تھیں۔

تین دن تک ڈھاکا اور اس کے نواح کی اچھی طرح سے سیر کرنے کے بعد یہ لوگ کھلنا کے لیے روانہ ہوئے۔ کھلنا سے ہی انہیں نورگنج اور مادھوپور جانا تھا۔

ماجدہ کھلنا پہنچی تو اس نے اس سینما کو پہچان لیا جہاں اس نے پچیس سال پہلے ہاشم کے ساتھ فلم دیوداس دیکھی تھی۔ وہ میمونہ کے ساتھ اس سینما گھر کے سامنے کھڑی ہوئی تھی اور اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ کھلنا میں ہاشم کے ساتھ وہ دن..... جب آنے والے طویل برسوں کے دوران اس کو غلامی کی بھاری زنجیروں میں باندھ دیا گیا تھا۔ ماجدہ نے کھلنا کے ان بازاروں اور گلی کوچوں کو بھی پہچانا جن سے وہ کبھی ہاشم کے ساتھ گزری تھی اور جن کے ہلکے ہلکے نقوش اس کے ذہن پر آج بھی مرتسم تھے۔ اس کے لیے یہ کہنا مشکل تھا کہ کتنی تبدیلیاں ہو چکی ہیں، کیونکہ اس وقت کی ساری باتیں تو اسے یاد نہیں تھیں۔ بس ہلکے پھلکے نقوش تھے

جنہیں اجاگر کرنے کی وہ پوری کوشش کر رہی تھی۔

کھلنا میں ایک دن قیام کرنے کے بعد وہ سب لوگ کشتی کے ذریعے نورگنج روانہ ہوئے۔ بچوں کے لیے یہ نہایت حیرت انگیز تجربہ تھا۔ انہوں نے کبھی کشتی سے اتنا لمبا سفر نہیں کیا تھا۔ لاہور میں انہوں نے کشتی میں دریائے راوی کی اکثر سیر کی تھی لیکن ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے کشتی کا طویل سفر نہیں کیا تھا۔ انہیں یہ سب کچھ بہت ہیجان انگیز اور دلچسپ لگا۔ کتنے ہی لوگ کشتی میں طرح طرح کے ساز و سامان کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔

وہ لوگ نورگنج پہنچ گئے۔ کشتی ساحل پر رکی اور وہ نیچے اترے۔ اب میمونہ کی باری تھی کہ وہ سب لوگوں کے ساتھ اپنے گھر کی طرف جانے والے راستے پر چلے۔ میمونہ کچھ دور تک تو چلتی رہی، لیکن پھر وہ ایک جگہ رک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے سے الجھن اور حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

''یہاں تو سب کچھ بالکل ہی بدلا ہوا لگ رہا ہے۔'' میمونہ نے جیسے اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ نورگنج تو لگتا ہی نہیں..... کہیں میں غلط تو نہیں آ گئی؟ مگر نہیں..... ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ کشتی والوں نے بتایا تھا کہ گاؤں نورگنج یہی ہے، مگر..... یہ تو نورگنج نہیں لگتا۔''

اسی وقت دو بوڑھے آدمی اس طرف سے گزرے، جن کے سر اور داڑھی کے بال سفید ہو رہے تھے۔ وہ گاؤں میں کچھ اجنبی لوگوں کو دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ میمونہ فوراً ہی ان سے مخاطب ہو گئی۔

''بابا، نورگنج یہی ہے نا؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں بیٹا یہی ہے۔'' ایک بوڑھے نے جواب دیا۔

''وہاں اس طرف کسی زمانے میں ایک اسکول کی عمارت ہوتی تھی جس کے برابر ڈاک خانہ تھا.....'' میمونہ نے انگلی سے سامنے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا، جہاں دور تک پھیلا ہوا ایک وسیع احاطہ نظر آ رہا تھا۔

''یہ تم کس زمانے کی بات کر رہی ہو بیٹا؟'' بوڑھے نے متجسس نظروں سے میمونہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بہت زمانہ پہلے کی بابا۔'' میمونہ نے کہا۔ ''کوئی 1980ء وغیرہ کی۔''

''اوہ..... ہاں..... تب سے اب تک بہت وقت گزر چکا ہے۔ کوئی بیس سال پہلے نورگنج میں ایک بہت بڑا سیلاب آیا تھا جس میں سارا گاؤں ڈوب گیا تھا۔ گاؤں میں اس وقت جتنے لوگ بھی موجود تھے، وہ سب مر گئے تھے۔ کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ پھر کئی برسوں کے بعد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ گاؤں دوبارہ آباد ہو گیا۔ نئے لوگوں نے اسے آباد کیا اور اس کی شکل بالکل بدل گئی۔ مگر تم..... تم کون ہو بیٹی اور یہاں کس کی تلاش میں آئی ہو؟''

''ایک زمانے میں یہاں میرے کچھ رشتے دار رہتے تھے۔'' میمونہ نے طویل وضاحتوں سے بچنے کی غرض سے اختصار کا راستہ اختیار کیا۔ ''میں جب بہت چھوٹی تھی تب یہاں آئی تھی۔ اس کے بعد سے ان لوگوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم ہوا.....''

''پھر مجھے ڈر ہے بیٹی کہ وہ لوگ اس دنیا میں موجود نہیں ہوں گے۔'' دوسرے بوڑھے نے جواب دیا۔ ''اس گاؤں کا کوئی شخص بھی زندہ نہیں بچا تھا۔ تم لوگ اگر چاہو تو گاؤں میں ہمارے گھر چل کر کچھ دیر قیام کرو۔''

لیکن میمونہ کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ اس کا گاؤں نور گنج نہیں تھا جہاں اس کے گھر والے رہتے تھے۔ یہ ایک بالکل اجنبی گاؤں تھا جہاں اس کا کوئی بھی جاننے والا نہیں تھا۔ وہ اس بات کو بخوبی سمجھ چکی تھی کہ اس کے اتنے بہت سارے خطوط کا اسے کبھی کوئی جواب کیوں نہیں ملا۔ اس کے خطوط کو وصول کرنے والا اور ان کا جواب دینے والا کوئی تھا ہی نہیں۔

''شکریہ بابا۔'' اس نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ''ہم اب واپس جائیں گے۔''

وہ سب لوگ وہاں سے واپس ساحل کی طرف روانہ ہو گئے۔ میمونہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''وہ سب لوگ چلے گئے۔'' اس نے گلوگیر آواز میں آہستہ سے کہا۔ ''مجھے خبر بھی نہ ہوئی اور وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور میں مُردوں کو خط لکھتی رہی اور جواب کا انتظار کرتی رہی۔ بھلا مُردے بھی کبھی خط کا جواب دیتے ہیں۔''

میمونہ ان لوگوں کی موت پر آنسو بہا رہی تھی جن کو مرے ہوئے دو عشروں سے زیادہ کی مدت گزر چکی تھی اور اب جن کی ہڈیوں کا بھی کوئی پتہ نہیں تھا۔ مگر میمونہ تک تو یہ خبر آج ہی پہنچی تھی اور آج ہی اس کے دل میں اس درد نے انگڑائی لی تھی۔

وہ لوگ دریا کے کنارے واپس آ کر کشتی کا انتظار کرنے لگے۔ میمونہ برابر روئے جا رہی تھی اور اس کا شوہر اور ماجدہ اسے تسلی دے رہے تھے۔

کافی دیر کے بعد انہیں کھلنا جانے والی کشتی مل گئی اور وہ کھلنا واپس آ گئے، جہاں انہوں نے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔

''میں نے تو اپنی تلاش مکمل کر لی۔'' میمونہ نے روتے ہوئے ماجدہ سے کہا۔ ''اب

تمہاری باری ہے۔ خدا کرے تمہاری تلاش میری تلاش کی طرح ناکام نہ رہے۔ خدا کرے تمہیں تمہارے چاہنے والے مل جائیں۔''

''کون جانے میمونہ۔'' ماجدہ نے ایک انجانے خوف اور صدمے سے لرزتے ہوئے کہا۔ ''ذرا غور کرو..... پچیس سال..... کتنی لمبی مدت ہوتی ہے۔ اس دوران دنیا میں کیسے کیسے انقلابات آ جاتے ہیں..... اور زندگی انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ خدا جانے زندگی نے اپنے ذخیرے میں میرے لیے کیا کچھ چھپا کر رکھا ہوا ہے، یہ تو اب بادھو پور چل کر ہی معلوم ہو سکے گا۔''

اگلے دن وہ سب لوگ بادھو پور کے لیے روانہ ہو گئے۔ کھلنا سے بادھو پور تک کا یہ سفر وہ کشتی کے ذریعے ہی طے کر رہے تھے۔ ماجدہ پر پھر ایک خواب کی سی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ کل ہی کی تو بات تھی کہ وہ ہاشم کے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر بادھو پور سے کھلنا آئی تھی اور اب وہ کھلنا سے بادھو پور واپس جا رہی تھی..... اپنے گھر..... لیکن اس سفر اور اس سفر کے دوران جو فاصلہ تھا وہ اپنے اندر عذابوں کے کتنے سیلاب سمیٹے ہوئے تھا۔ بادھو پور سے کھلنا کا سفر..... صرف ایک دن کے لیے تھا اور پھر واپس آ جانا تھا لیکن واپسی کے سفر میں پورے پچیس برس لگ گئے۔

ماجدہ کے دل میں اٹھنے والی درد کی تیز و تند لہریں اس کے سارے وجود کو جیسے منہدم کیے ڈال رہی تھیں اور وہ اپنی اس رقت آمیز کیفیت پر بمشکل ہی قابو پا سکتی تھی۔

بالآخر کشتی بادھو پور کے ساحل پر پہنچ کر رک گئی۔ ماجدہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ ہاں..... یہی وہ جگہ تھی جہاں سے آج سے پچیس سال پہلے وہ ہاشم کے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر کھلنا کے لیے روانہ ہوئی تھی اور پھر سب کچھ غائب ہو گیا تھا۔ ہاشم، کھلنا، بادھو پور کچھ بھی تو باقی نہیں رہا تھا۔ واپسی کے لیے کشتی اب پچیس برس کے بعد مل سکی تھی۔ درمیان میں شاید کوئی کشتی چلی نہیں تھی اور وہ اور ہاشم دو الگ الگ دنیاؤں میں مقید ہو کر رہ گئے تھے۔ اب خدا خدا کر کے اس قفس سے چھٹکارا ملا تھا اور وہ واپس بادھو پور جا رہی تھی لیکن مکمل بے خبری کے عالم میں، اسے نہیں معلوم تھا کہ ہاشم زندگی اور موت کے درمیان اس مختصر سے وقفے میں اس وقت کہاں کھڑا ہو گا اور کس حال میں ہو گا..... کیا خبر، وہ زندہ بھی ہو گا..... اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

ان لوگوں کا قافلہ کشتی سے اتر کر ساحل پر آگے بڑھنے لگا۔ ماجدہ آنکھیں گھما گھما کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔

وہ اپنے اِرد گرد پھیلی ہوئی دنیا میں جانے پہچانے گم گشتہ نقوش تلاش کر رہی تھی، جو اسے ملنا شروع ہو گئے تھے، اس کے چہرے پر ایک نئی چمک نمودار ہو گئی تھی۔ اس کا گاؤں مادھو پور زندہ تھا۔ اسے نور گنج کی طرح کسی سیلاب نے نہیں نگل لیا تھا۔ گاؤں زندہ تھا تو کچھ نہ کچھ لوگ بھی ضرور زندہ ہوں گے۔

ماجدہ اپنے مختصر سے قافلے کے ساتھ سیدھی اس طرف بڑھ رہی تھی جدھر کبھی اس کا گھر واقع تھا۔ اگرچہ بہت کچھ بدلا ہوا لگ رہا تھا، پھر بھی راستے کے مناظر اسے اجنبی نہیں لگ رہے تھے۔

ماجدہ کا قافلہ ایک مکان کے دروازے کے سامنے کچھ فاصلے پر رک گیا۔ مکان میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ البتہ وہ خاصا خستہ حال نظر آ رہا تھا، شاید کافی دنوں سے اس کی مرمت نہیں کی گئی تھی۔

مکان کے سامنے کھلی ہوئی جگہ میں، جسے بانسوں کے ذریعے ایک احاطے کی شکل دی گئی تھی، ایک بوڑھا آدمی ایک پرانی سی چارخانے والی تہہ بند اور ایک میلی بنیان پہنے گھاس کے کچھ گٹھوں کو اکٹھا کر رہا تھا۔ وہ اپنے کام میں اتنا منہمک تھا کہ اس نے اس قافلے کو صرف اسی وقت دیکھا جب یہ لوگ اس احاطے کے اندر داخل ہو چکے تھے۔

ماجدہ اس سفید بالوں والے بوڑھے کے چہرے کو بغور دیکھ رہی تھی۔ اس نے اس چہرے کے نقوش میں اپنے باپ کے پچیس سال پہلے کے چہرے کا دھندلا دھندلا سا عکس تلاش کر لیا تھا۔ تب یہ بال سفید نہیں تھے اور چہرے پر جھریاں نہیں تھیں۔ گزرتے ہوئے وقت نے سراج الدین کے خدوخال کو کتنا بدل ڈالا تھا، لیکن اس کے جسم میں زیادہ تبدیلیاں نہیں ہوئی تھیں۔ وہ آج بھی پہلے ہی کی طرح دبلا پتلا تھا بلکہ اس کے دبلے پن میں کچھ اضافہ ہی ہو گیا تھا۔

سفید بالوں اور جھریوں سے بھرے ہوئے چہرے والے دبلے پتلے بوڑھے نے اس قافلے کو دیکھا جو ایک جوان عورت کی سربراہی میں اس کے گھر کے احاطے میں داخل ہو رہا تھا اور وہ حیران ہو کر ان چہروں کو دیکھنے لگا جو سب کے سب اس کے لیے اجنبی تھے۔

''بابا.....'' اچانک سب سے آگے والی جوان عورت ایک چیخ مار کر بوڑھے کی طرف جھپٹی اور اس سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگی۔ ''بابا..... بابا..... بابا.....'' اس کے حلق سے پھنسی پھنسی تیز کھرکھراتی ہوئی آواز نکل رہی تھی۔

''کون؟ کون؟'' بوڑھے نے قدرے سہمی ہوئی مرتعش ولرزاں آواز میں کہا۔ ''کون ہو تم بیٹی؟ کون ہو؟'' سراج الدین یہ سمجھ لینے کے باوجود کہ یہ عورت اس کی پچیس سال پہلے گم ہو جانے والی بیٹی ماجدہ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی، بہت محتاط رویہ اختیار کر رہا تھا۔ وہ خود اس عورت کی زبانی اس کی شناخت معلوم کرنا چاہتا تھا۔

''میں ماجدہ ہوں بابا، میں ماجدہ ہوں۔'' ماجدہ نے زور زور سے روتے ہوئے کہا۔

''تمہاری ماجدہ.....''

''ماجدہ.....'' بوڑھے کی آواز بُری طرح کانپی اور لفظ ماجدہ اس کی زبان سے کھنچتا چلا گیا۔ ''تم ماجدہ؟ تم کہاں تھیں اب تک؟ ہائے، ہم نے تمہیں کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا.....''

گریہ وزاری اور آہ و بکا کا طوفان ذرا تھما تو ماجدہ نے وہیں احاطے میں کھڑے کھڑے اپنے باپ کو بتایا کہ وہ پاکستان میں لاہور رہتی ہے، اور اپنے تینوں بچوں کے ساتھ اپنے گھر والوں کی تلاش میں آئی ہے۔ اس نے اپنے پاس کھڑے میمونہ اور ڈاکٹر ظہیر کا بھی مختصر سا تعارف کرا دیا۔

''آؤ..... سب لوگ اندر آؤ۔'' سراج الدین نے خوشی اور غم کی آمیزش سے دہکتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تمہاری ماں ذرا ہاشم کے گھر تک گئی ہوئی ہے بس ابھی آتی ہی ہو گی۔''

ہاشم..... ماجدہ کی روح کا ایک ایک تار جھنجھنا اٹھا۔ آج پچیس سال کے بعد وہ ہاشم کے حوالے سے کوئی بات سن رہی تھی۔ بابا کے کہنے کا جو انداز تھا، اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ہاشم زندہ ہے۔

''ہاشم..... ہاشم کیسا ہے بابا؟'' ماجدہ کی زبان سے نکلا لیکن اس نے اپنی روح کی گہرائیوں سے ابھرنے والے ان الفاظ میں فوراً ہی کچھ اور اضافہ بھی کر دیا۔ ''اماں..... اماں کیسی ہیں؟''

''تمہاری ماں بھی ٹھیک ہیں اور ہاشم بھی ٹھیک ہے۔'' سراج الدین نے کہا۔ ''وہ دونوں ابھی تھوڑی دیر میں آ جائیں گے۔ ہاشم کو یہاں کئی کام کرنے ہیں.....''

''تو ہاشم زندہ ہے..... ہاشم زندہ ہے..... اماں بھی زندہ ہے.....'' ماجدہ کے سارے وجود میں تیز و تند، سرور آمیز گھنٹیاں سی بج رہی تھیں۔

وہ سب لوگ اندر آ گئے اور سراج الدین انہیں چارپائیوں پر بٹھا رہا تھا۔

''تم کیسے ہیں اور تائی؟'' ماجدہ نے فوراً ہی ہاشم کے والدین کے بارے میں پوچھنا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شروع کر دیا۔

''وہ دونوں اب زندہ نہیں ہیں۔'' سراج الدین نے گہری اداسی کے ساتھ کہا۔ ''بھائی صاحب کا انتقال تو دس سال پہلے ہو گیا تھا۔ انہیں سانپ نے کاٹ لیا تھا۔ ہم لوگ انہیں ہسپتال لے جا رہے تھے کہ وہ راستے میں ہی ختم ہو گئے۔ بھابی ان کی موت کے بعد دو سال تک زندہ رہیں، پھر وہ بھی ملیریا میں مبتلا ہو کر ختم ہو گئیں۔''

''ہائے..... تایا اور تائی دونوں ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور مجھے کسی کے بارے میں کچھ خبر بھی نہ مل سکی۔ مجھے تو ظالموں نے میرے اپنوں سے جدا کر دیا.....'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سراج الدین کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے۔

ماجدہ کو یہ تو معلوم ہو چکا تھا کہ ہاشم زندہ ہے اور اس خبر نے اس کی روح کو جیسے ایک دم سے تر و تازہ کر دیا تھا۔ دل میں پیدا ہونے والے ہزار طرح کے وسوسے آن کی آن میں ختم ہو گئے تھے۔ ہاشم زندہ تھا اور یہیں مادھو پور میں موجود تھا۔ وہ ابھی ذرا دیر میں اس کے سامنے آنے والا تھا۔ اس کی آنکھیں ایک ایسے نظارے کو دیکھنے والی تھیں جس کو دیکھنے کی آرزو نے اسے خود فراموشی کی دنیا میں پہنچا دیا تھا۔

وہ اپنے باپ سے ہاشم کے بارے میں اور بھی بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ وہ اس سے ہاشم کی شادی کے بارے میں، اس کی بیوی اور بچوں کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی لیکن اپنی شدید ترین خواہش کے باوجود وہ فوری طور پر باپ سے سوال نہ کر سکی۔

''ہاشم زندہ ہے اور صحیح سلامت ہے تو پھر اس کی شادی بھی ضرور ہوئی ہو گی۔'' وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔ ''آخر انتظار کرنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ کیا وہ ساری عمر میرا انتظار کرتا؟ اور اگر انتظار کرتا بھی تو کس امید پر؟ میں تو لاپتہ ہو گئی تھی۔''

ماجدہ ہاشم کی شادی کے بارے میں تو اپنے باپ سے فوری طور پر کچھ نہ پوچھ سکی۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کے بارے میں پوچھا۔

ماجدہ کی دو چھوٹی بہنیں تھیں۔ ثریا اور شاہدہ اور دو چھوٹے بھائی تھے..... نصیر اور وزیر۔

''ثریا تو یہیں ہے، مادھو پور میں۔'' اس کے باپ نے بتایا۔ ''شاہدہ دیناج پور میں ہے۔ اس کا خاوند وہاں سرکاری ملازم ہے۔ نصیر اور وزیر دونوں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ چٹا گانگ میں ہیں۔ وہ دونوں وہیں چلے گئے تھے اور انہوں نے جہاز پر نوکری کر لی تھی۔ وہ لوگ سال میں کم از کم بار تو مادھو پور ضرور آتے ہیں۔''

اس مختصر سے عرصے میں ماجدہ کو اپنے خاندان کے سارے افراد کے بارے میں ضروری معلومات حاصل ہو گئی تھیں لیکن وہ ہاشم کے بارے میں جو کچھ جاننا چاہتی تھی۔ وہ اسے نہیں معلوم ہو سکا تھا۔ بابا نے اسے ہاشم کے بارے میں زیادہ نہیں بتایا تھا۔

''تم..... تم یہاں تک پہنچ گئیں بیٹی؟'' سراج الدین نے جذبات سے بوجھل آواز میں کہا۔ ''تمہیں اپنا گھر یاد رہا؟''

''یاد کیوں نہ رہتا بابا۔'' ماجدہ نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''میں جب یہاں سے گئی تھی تو تقریباً نو سال کی تھی۔ میں اپنے گھر کو کیسے بھول سکتی تھی؟ نہ گھر کو بھولی ہوں، اور نہ گھر والوں کو۔ میں تو کچھ بھی نہیں بھولی ہوں بابا۔''

''مگر..... بیٹی..... تم اچانک غائب کہاں ہو گئی تھیں؟'' سراج الدین نے کھل کر ماجدہ سے پوچھا۔ ''ہاشم کا کہنا ہے کہ تم کھلنا میں گھاٹ پر سے کہیں غائب ہو گئی تھیں۔''

''ہاں بابا۔'' ماجدہ نے کہا۔ ''ہاشم ٹھیک کہتا ہے۔ مجھے کھلنا کے گھاٹ پر سے اغوا کر لیا گیا تھا۔ یہ ایک بہت لمبی کہانی ہے بابا۔ اطمینان سے بتاؤں گی کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ بس خدا کا شکر ہے کہ میں زندہ سلامت ہوں، میرے بچے بھی زندہ سلامت ہیں اور ہم سب لوگ پاکستان کے شہر لاہور میں پُرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔''

''اور..... تمہارا شوہر؟'' سراج الدین نے جھجکتے ہوئے بڑے محتاط انداز میں سوال کیا۔ ''وہ کہاں ہے؟''

سراج الدین کا سوال بہت سیدھا سادا تھا، لیکن اس ایک سیدھے سادے سوال کے جواب میں داستاں در داستاں جو المیے چھپے ہوئے تھے، ان کو پوری سچائی کے ساتھ بیان کرنے کی قوت ماجدہ میں نہیں تھی۔ ان المیوں کی مکمل سچائی کو تو وہ اپنے آپ سے بھی چھپانے کی کوشش کرتی تھی۔ اسے یہ سب کچھ اس قدر اذیت ناک اور ناقابلِ قبول لگتا تھا کہ وہ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی ڈرتی تھی، مگر سچائی کو خوف کی دھند میں تو نہیں چھپایا جا سکتا تھا۔

''وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔'' ماجدہ نے آہستہ سے کہا۔ مختصر جواب دیا۔

''اوہ..... یہ تو بہت افسوس کی بات ہے۔'' سراج الدین نے افسردگی کے ساتھ کہا۔ ''ہم لوگوں نے تو اسے کبھی دیکھا بھی نہیں..... خیر جو خدا کی مرضی.....''

''وہ ایک نہیں تھا ماجدہ اسے دیکھ سکتے۔'' ماجدہ نے دل ہی دل میں کہا۔ وہ یہ الفاظ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنی زبان پر نہیں لاسکتی تھی۔ ''اس کے تو تین چہرے تھے اس کی تین شکلیں تھیں۔''

''ہم سب لوگ تمہارے لیے کس قدر پریشان رہے۔'' سراج الدین گلوگیر آواز میں کہہ رہا تھا۔ ''ہم نے تمہیں کتنا تلاش کیا اور ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ تم زندہ بھی ہو یا نہیں۔ کتنے برس گزر گئے ماجدہ..... ہائے بیٹی! کتنے برس گزر گئے۔ انتظار کرتے کرتے ہماری آنکھیں تھک گئیں اور اب تو کوئی امید بھی باقی نہیں رہی تھی۔ مگر واہ خدا کی قدرت.....''

''تم سب لوگ ٹھیک تو ہو بابا؟'' ماجدہ نے اپنے باپ کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''ہاں بیٹی..... ہم لوگ ٹھیک ہیں۔'' سراج الدین نے کہا۔ ''ہم سب لوگ ٹھیک ہیں۔''

اور وہ جلدی جلدی ماجدہ کو یہاں کے حالات کے بارے میں بتانے لگا۔ وہ بہت کچھ بتا رہا تھا۔ لیکن اس نے ہاشم کی شادی کے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں بتایا تھا۔ ماجدہ چاہتی تھی وہ خود ہی اس بارے میں بتائے، اور اسے پوچھنا نہ پڑے لیکن ابھی تک وہ وقت نہیں آیا تھا۔

''ہاشم کیا کرتا ہے بابا؟'' ماجدہ نے ایک بار پھر ایک نئے زاویے سے ہاشم کا ذکر نکال لیا۔

''وہ زمین پر کام کرتا ہے بیٹی۔'' سراج الدین نے جواب دیا۔ ''محنتی آدمی ہے۔ اس نے اپنی محنت سے کچھ اور زمین بھی حاصل کر لی ہے۔ اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے۔''

''اور ہاشم کے بیوی بچے؟'' ماجدہ سے اب مزید صبر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے اپنے سوال کو اب نئے انداز میں ترتیب دیا۔

''ہاشم کا ایک بیٹا ہے۔'' سراج الدین نے کچھ رک کر کہا۔ ''وہ کھلنا کے ایک اسکول میں پڑھتا ہے اور وہیں بورڈنگ ہاؤس میں رہتا ہے۔ ہاشم اسے بہت اچھے اسکول میں پڑھا رہا ہے۔ چونکہ روزانہ وہاں آنا جانا مشکل ہے، اس لیے ہاشم نے اسے بورڈنگ ہاؤس میں داخل کروا دیا ہے۔''

تو اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ ہاشم کی شادی ہو گئی تھی اور اس کا ایک بیٹا بھی تھا جو کھلنا میں پڑھ رہا تھا۔ لیکن بابا نے ابھی تک ہاشم کی بیوی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس نے تو ہاشم کی بیوی کا کوئی تذکرہ بھی نہیں کیا تھا۔

''ہاشم کی بیوی..... وہ کون ہو گی اور کیسی ہو گی۔'' ماجدہ نے دل میں سوچا۔ ''وہ میرے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتی تو ضرور ہو گی..... ہاشم نے اسے بتایا ہو گا..... اور ہاشم کا بیٹا..... وہ نہ جانے کیسا ہو گا..... شاید ہاشم کا ہی ہم شکل ہو۔'' ماجدہ کے دل و دماغ میں افکارِ پریشاں کا ایک ہجوم یورش کر رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ان آنسوؤں میں کتنے بہت سارے غم

ایک ساتھ گھلے ہوئے تھے۔ ان چند لمحوں نے جب اس روز اس نے کھلنا میں ندی کے کنارے گھاٹ پر اس نامعلوم عورت کا دیا ہوا پان کھایا تھا، اس سے کتنا کچھ چھین لیا تھا۔ ان قاتل اور سفاک لمحوں نے اس سے اس کا وہ بیٹا بھی چھین لیا تھا جو اس وقت کھلنا کے ایک اسکول میں پڑھ رہا تھا اور بورڈنگ ہاؤس میں رہتا تھا..... ان لمحوں نے اس سے صرف ہاشم کو ہی نہیں چھینا تھا۔

''ہاشم کا بیٹا۔'' ماجدہ نے ایک نرم مسکراہٹ کے ساتھ آہستہ سے کہا۔ ''کیا نام ہے اس کا بابا؟''

''اس کا نام ماجد ہے۔'' سراج الدین نے کچھ رکتے ہوئے کہا۔

ماجد! ماجدہ کے دل کی دھڑکن یکبارگی بہت تیز ہو گئی۔ ہاشم نے اپنے بیٹے کا نام ماجد رکھا تھا۔ اپنے بیٹے کے نام میں اس نے شاید ماجدہ کی روح کو، ماجدہ کے تصور کو مجسم کرنے کی کوشش کی تھی۔ ''اس نے کبھی بھی مجھ کو اپنے آپ سے الگ نہیں کیا۔'' ماجدہ نے بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ سوچا۔ ''اس کے لیے ایسا کرنا ممکن بھی نہیں تھا۔''

ماجدہ کے تینوں بچے اور ڈاکٹر ظہیر اور میمونہ اور ان کے بچے، زیادہ تر خاموش تھے اور باپ بیٹی کے درمیان ہونے والی گفتگو کو غور سے سن رہے تھے۔ میمونہ کو تو ہاشم اور ماجدہ کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو گیا تھا وہ ماجدہ کی راز دار تھی اور اب یہ سن کر کہ ہاشم زندہ ہے۔ اس کی شادی ہو چکی ہے اور وہ ایک بیٹے کا باپ ہے، میمونہ کو یہ الم ناک کہانی ہمیشہ کے لیے ختم ہوتی نظر آ رہی تھی۔

اسی وقت گھر کے احاطے میں تین افراد داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک تو سفید بالوں والی بوڑھی عورت تھی۔ جس کی کمر میں ہلکا سا جھکاؤ پیدا ہو چکا تھا اور گردشِ وقت نے چہرے پر بہت ساری سلوٹیں ڈال دی تھیں۔ دوسری ایک جوان عورت تھی جس کے خدوخال میں ماجدہ کو اپنے چہرے کی جھلک دکھائی دے رہی تھی، اور تیسرا ایک مرد تھا جس کی عمر کوئی چالیس سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔ اس کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے اور ان میں کافی سفیدی نظر آ رہی تھی۔

''لو..... وہ تمہاری ماں آ گئیں..... اور ثریا بھی..... اور ہاشم بھی.....'' سراج الدین نے ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے ماجدہ سے کہا۔ اس کے چہرے پر بڑا گہرا اور غم ناک تاثر تھا جس کی وجہ ماجدہ فوری طور پر نہ سمجھ سکی۔ ان لوگوں کو یہاں آتے دیکھ کر بابا کو خوشی کیوں نہیں ہوئی تھی؟

ماں کو پہچاننے میں ماجدہ کو کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اس نے ثریا کو بھی پہچان لیا لیکن ہاشم..... اُف ہاشم کیا سے کیا ہو گیا تھا..... ماجدہ کے ذہن کے پردے پر ہاشم کی جو تصویر نقش

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی وہ آج سے تقریباً ربع صدی پہلے کے ایک نوعمر لڑکے کی تھی اور یہ تصویر ایک ہی جگہ منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے بعد سے ماجدہ نے ہاشم کو اپنے خیالوں اور خوابوں میں اَن گنت مرتبہ دیکھا تھا۔ لیکن اس کی وہی ایک صورت آنکھوں میں ابھرتی تھی..... اور اب اچانک اس منجمد تصویر میں جیسے جان پڑ گئی تھی۔ اس کے خدوخال بڑی تیزی کے ساتھ بدلنے لگے تھے۔ گھنے خوبصورت، سیاہ بال، چھدرے بالوں میں بدل گئے تھے جن میں جگہ جگہ کافی سفیدی نظر آ رہی تھی۔ دمکتے ہوئے شاداب اور بھرے بھرے چہرے پر کتنی جھریاں نمودار ہو چکی تھیں اور جلد بھی کچھ ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ ماجدہ اس چالیس سالہ ادھیڑ عمر کے آدمی کے چہرے میں اس چودہ سالہ نوعمر لڑکے کے نقوش تلاش کر رہی تھی جو تقریباً پچیس برس پہلے کھلنا کے ساحل پر اس سے جدا ہو گیا تھا۔ اس کا دل وفورِ غم سے جیسے کٹ کٹ کر آنکھوں کے راستے بہنے لگا۔

ماجدہ کی آنکھیں ہاشم کے متحیر چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ اس کپکپاہٹ نے ایک ایسی شکل اختیار کر لی تھی جسے ایک سہمی ہوئی مسکراہٹ کا نام دیا جا سکتا تھا۔ ماجدہ کی زبان گنگ تھی۔ وہ محویت، حیرت اور خود فراموشی کے عالم میں ہاشم کو دیکھے جا رہی تھی اور پچیس سال پرانی اس گرد کو صاف کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی جو گردشِ وقت نے ہاشم کے چہرے پر مل دی تھی۔ تینوں آنے والے افراد سخت حیرت کے عالم میں ان اجنبی مہمانوں کو دیکھ رہے تھے جو گھر میں چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

''اماں.....'' اچانک ماجدہ کی زبان سے بے ساختہ نکلا اور وہ دوڑ کر بوڑھی عورت سے لپٹ گئی۔

بوڑھی عورت نے سخت ہیجان کے عالم میں ایک چیخ ماری۔ ''کون؟ کون؟ کیا تم ماجدہ ہو؟''

''ہاں..... اماں.....'' ماجدہ نے ہاشم کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے اپنی ماں کے سوال کا جواب دیا۔ ''میں ماجدہ ہوں اماں..... میں ماجدہ ہوں.....'' اور وہ عورت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ہاشم کی آنکھیں اچانک اس قدر پھیل گئیں جیسے ابھی باہر نکل پڑیں گی۔ اس کا منہ کھل گیا تھا اور چہرے کے سارے عضلات تن گئے تھے۔

''ماجدہ!'' اچانک ہاشم کے کھلے ہوئے منہ سے ایک گہری، بھاری، کھرکھراتی ہوئی آواز بلند ہوئی جو خوشی و غم حیرت اور قلق و بے یقینی کے ایک امنڈتے ہوئے، بے قابو طوفان کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے سی۔ اگر کسی آواز میں شامل جذبوں کو الگ الگ کر کے دیکھنا ممکن

ہوتا، تو ہاشم کی آواز میں ان تمام جذبوں کو بآسانی تلاش کیا جا سکتا تھا۔ اپنی زبان سے ادا کیے جانے والے صرف ایک لفظ ''ماجدہ'' میں اس نے اپنے زندگی بھر کے کرب کو سمو دیا تھا۔

ہاشم نے جلدی سے آگے بڑھ کر اپنا بُری طرح کانپتا ہوا ہاتھ ماجدہ کے سر پر رکھ دیا۔

''ماجدہ..... تم زندہ ہو؟ تم خیریت سے ہو؟'' ہاشم کی آواز آنسوؤں میں گھلنے لگی۔ ''تم..... اس وقت کہاں چلی گئی تھیں ماجدہ؟ میں دکان سے واپس آیا تو تم وہاں تھیں ہی نہیں۔''

پچیس برس کے بعد کوئی ماجدہ سے اس شام کی روداد کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ پچیس برس سے کسی نے اس سے یہ سوال نہیں پوچھا تھا۔ یہ سوال تو ماضی کے خاموش اندھیروں میں نہ جانے کہاں گم ہو گیا تھا اور آج اچانک ان سارے اندھیروں کو چیرتا ہوا کسی چمک دار اور نوکیلے نیزے کی طرح وارد ہوا تھا اور ماجدہ کے سینے میں ترازو ہو گیا تھا۔

ماجدہ کے کوئی جواب دینے سے پہلے اس کی چھوٹی بہن ثریا جیسے اس پر ٹوٹ پڑی۔ وہ آگے بڑھ کر ماجدہ کے سینے سے لپٹ گئی۔ ''آپا..... آپا.....'' وہ چلا چلا کر رو رہی تھی..... ہائے..... ہائے..... یہ کیا ہو گیا آپا..... یہ کیا ہو گیا.....''

''کیا ہو گیا میری جان!'' ماجدہ نے اسے گلے لگا کر پیار کرتے ہوئے کہا۔ ''اب تو سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب میں تم لوگوں کے پاس آ گئی ہوں۔ ہم سب ایک دوسرے کے پاس ہیں۔ میں زندہ ہوں..... تم زندہ ہو..... ہم سب زندہ ہیں ثریا.....'' ماجدہ کے منہ سے نکلنے والے الفاظ بے ربط تھے اور ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔

ماجدہ دھاروں دھار رو رہی تھی۔ اس کے سینے سے لگی ہوئی اس کی بہن ثریا بھی اس کی طرح رو رہی تھی۔ ان دونوں کی ماں بھی رو رہی تھی۔ ہاشم کی آنکھیں بھی بھیگ رہی تھیں۔ بوڑھا سراج الدین بھی آبدیدہ تھا۔ جو دوسرے لوگ وہاں موجود تھے۔ جن میں ماجدہ کے بچے بھی شامل تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی بھی ایسا کوئی منظر نہیں دیکھا تھا۔ وہ حیرت انگیز اور غم ناک خاموشی کے عالم میں یہ سب کچھ دیکھ اور سن رہے تھے۔

ان تمام رونے والوں کے پاس ایک دوسرے سے کہنے کے لیے اتنا کچھ تھا کہ اس کی کوئی انتہا نہ تھی۔ ان کے پاس پچیس برس کے صدمات تھے جن میں وہ ایک دوسرے کو شریک کرنا چاہتے تھے لیکن کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ داستان کا آغاز کہاں سے کرے اور کس طرح کرے۔ بس ایک سیلاب گریہ تھا جو اپنی پوری طوفانی شدت کے ساتھ بہتا چلا جا رہا تھا۔ فضا سنسنا رہی تھی، زمین تھرتھرا رہی تھی۔ زمین سے آسمان تک درد گھلا ہوا تھا جس کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یلغار سے در و دیوار کانپ رہے تھے۔

بہت دیر کے بعد جب جذبات کی یورش میں ذرا کمی آئی اور وفورِ گریہ میں کچھ اعتدال پیدا ہوا تو ان سب لوگوں کے گہرے غم انگیز تجسس کو کم کرنے کی غرض سے ماجدہ نے ان لوگوں کو پہلے تو اپنے ساتھ آنے والے مہمانوں اور اپنے بچوں کے بارے میں بتایا اور اس کے بعد اس نے ٹھہر ٹھہر کر اپنے بارے میں بتانا شروع کیا۔ اس نے ان لوگوں کو جو کچھ بتایا اس کا لبِ لباب یہ تھا کہ اسے ایک عورت نے کھلنا کے ساحل پر پان کھلا کر بے ہوش کر کے کسی نامعلوم مقام پر پہنچا دیا تھا جہاں دو لڑکیاں اور بھی تھیں۔ پھر وہ لوگ اسے لے کر کراچی آ گئے، جہاں دو سال کے بعد انہوں نے ایک زمیندار کے ساتھ اس کا نکاح کر دیا جس سے اس کی بیٹی ثمینہ پیدا ہوئی۔ اس زمین دار نے کچھ عرصہ کے بعد ماجدہ کو طلاق دے دی اور ماجدہ لاہور آ گئی۔ وہاں اس کی شادی عزیز نامی ایک شخص سے ہوگئی جس کا بیٹا وسیم ہے۔ پھر عزیز کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا اور ماجدہ کی شادی عرفان سے ہوگئی جس کا بیٹا فہیم ہے۔ عرفان بال بچوں والا آدمی تھا اور اپنے گھر والوں کے زور دینے پر اس نے ماجدہ کو طلاق دے دی اور ایک مکان ماجدہ کے نام کر دیا۔

''ان ساری باتوں کو ایک عرصہ گزر چکا ہے۔'' ماجدہ نے اپنی داستان سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''میرا لاہور میں ایک اپنا کاروبار ہے۔ میری دوست میمونہ اور ان کے شوہر ڈاکٹر ظہیر نے میری بہت زیادہ مدد کی ہے۔'' وہ میمونہ کے بارے میں ان لوگوں کو پہلے ہی بتا چکی تھی کہ وہ اس کے ساتھ اغوا ہونے والی لڑکی ہے جسے ایک نیک دل انسان نے اپنی بیٹی بنا کر پال لیا تھا۔

اپنی گفتگو کے دوران ماجدہ بار بار ہاشم کے چہرے کی طرف دیکھتی جا رہی تھی جو اس وقت پتھر کی طرح سخت، بے جان اور مُردہ نظر آ رہا تھا۔ اب معلوم ہوتا تھا اس پتھر چہرے میں زندگی کی کوئی بھی علامت باقی نہیں رہی ہے۔

''تم نے کتنے دکھ اٹھائے ہیں آپا۔'' ثریا نے روتے ہوئے کہا۔ ''ہائے آپا..... تمہارے ساتھ اتنا کچھ ہوتا رہا اور ہم لوگوں کو کچھ خبر بھی نہیں ہوئی۔ میں کیا کروں آپا..... میں کیا کروں۔'' اس کے رونے کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔

''تم بس یہ کرو میری جان کہ میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا اسے بھول جاؤ۔'' ماجدہ نے کہا۔ ''مجھے جو کچھ جھیلنا تھا وہ میں جھیل چکی ہوں اور اب زندگی میں ایک طرح کا ٹھہراؤ آ گیا ہے۔ اب تم اپنے بارے میں بتاؤ میں نے تم سے تو کچھ پوچھا ہی نہیں۔ تمہارے کتنے بچے

ہیں؟ تمہارا میاں کیا کرتا ہے؟ کہاں ہے وہ؟''

''میں..... میرا..... بس ایک بیٹا ہے۔'' ثریا نے ماجدہ کے سوالوں کا جواب دینے میں قدرے تامل کا مظاہرہ کیا۔ جیسے وہ جواب تلاش کر رہی ہو۔ بیٹے کے بارے میں بتا کر وہ رک گئی۔

''اور تمہارا میاں؟'' ماجدہ نے اپنا سوال دہرایا۔

ثریا کے چہرے کا رنگ جو پہلے ہی اڑا ہوا تھا۔ یکبارگی اور بھی پھیکا پڑ گیا۔ اس کے ہونٹ آہستہ سے کانپتے، جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو، لیکن کہہ نہ پا رہی ہو۔

اسی وقت سراج الدین کی مدھم، لیکن مستحکم آواز بلند ہوئی۔ وہ اسے حتی المقدور پُرسکون بنا رہا تھا۔

''ثریا کا میاں ہاشم ہے ماجدہ بیٹی.....'' سراج الدین نے کہا۔ ''تمہارے یہاں سے جانے کے دس سال کے بعد ہم سب لوگوں نے طے کیا تھا کہ ہاشم کی شادی تمہاری چھوٹی بہن ثریا سے کر دی جائے۔''

ماجدہ کے دماغ میں بجلی کا ایک کوندا سا لپکا۔ اسے اپنے ان بہت سارے سوالوں کے جوابات مل گئے جو یہاں آنے کے بعد ان لوگوں کا رویہ دیکھ کر اس کے دل میں پیدا ہو رہے تھے..... بابا ہاشم کی بیوی کا ذکر کرنے سے کیوں گریزاں تھے؟ انہوں نے ثریا کے شوہر کے بارے میں کچھ کیوں نہیں بتایا تھا؟ ثریا بار بار یہ کیوں کہہ رہی تھی کہ ''ہائے آپا..... یہ کیا ہو گیا۔'' وہ یہ کیوں کہہ رہی تھی کہ ''اب میں کیا کروں آپا.....'' بابا ہاشم، ثریا اور اماں کو آتا دیکھ کر پریشان کیوں نظر آ رہے تھے۔

ایک جھماکے کے ساتھ ساری صورتِ حال واضح ہوگئی اور اسی کے ساتھ ہی ماجدہ نے یہ بھی سمجھ لیا کہ اسی کے لیے زندگی کی شاید سب سے زیادہ مشکل گھڑی بھی آن پہنچی ہے جب اسے اپنے وجود کی ساری قوت اور اپنے جذبوں کی ساری توانائی کو بروئے کار لاتے ہوئے نہ صرف خود کو تحفظ فراہم کرنا ہوگا بلکہ اپنے سارے گھر والوں کو بھی تحفظ فراہم کرنا ہوگا۔ ہاشم کو تحفظ فراہم کرنا ہوگا جس سے اس نے دنیا میں سب سے زیادہ محبت کی تھی۔ اپنی معصوم اور بے گناہ چھوٹی بہن کو تحفظ فراہم کرنا ہوگا اور ان کے بچے کو تحفظ فراہم کرنا ہوگا۔ جو کچھ ہو چکا تھا، شاید ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ اس کے سوا شاید اور کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

اس چند لمحوں کے دوران ماجدہ نہ جانے کتنے سرکش اور ہلاکت خیز طوفانوں سے گزرتی ہوئی یکبارگی ساحل پر آ گری۔ کسی تیز و تند سوچ نے اسے ڈھکیل کر طوفانوں سے باہر نکال دیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ تیزی سے آگے بڑھی اور اس نے جلدی سے ثریا کو ایک بار پھر اپنے گلے سے لگا لیا۔

''مبارک ہو میری بہن!'' اس نے ثریا کو وارفتگی کے عالم میں پیار کرتے ہوئے کہا۔

''بہت بہت مبارک ہو۔ مجھے اس کا دکھ ہمیشہ رہے گا کہ میں تمہاری شادی کے وقت یہاں موجود نہیں تھی۔''

''آپا..... آپا.....'' ثریا سسکیاں لے کر رو رہی تھی۔ پھر اس نے اپنا منہ ماجدہ کے کان کے بالکل قریب لے جا کر سرگوشی میں کہا۔ ''تم ناراض تو نہیں ہو آپا؟''

''پاگل۔'' ماجدہ نے اس کے گال پر ہولے سے تھپکی دیتے ہوئے جوابی سرگوشی میں کہا۔ ''ناراضگی اور تم سے؟''

ان سب لوگوں کے دلوں پر جو قیامت گزرنا تھی وہ گزر گئی اور اب ایک سکون آمیز خاموشی تھی۔ ہاشم اور ثریا کی شادی کے بارے میں پھر اور کوئی بات نہیں ہوئی۔

ماجدہ اپنے بچوں کے ساتھ اپنے گھر میں رہی۔ جبکہ ساتھ آنے والے مہمانوں کے ٹھہرنے کا انتظام ہاشم نے اپنے گھر میں کیا۔ رات گئے تک سب لوگ ماجدہ کے گھر میں ہی رہے اور انہوں نے کھانا بھی ایک ساتھ کھایا۔ اس کے بعد ہاشم مہمانوں کو اپنے گھر لے گیا۔

ہاشم سے تنہائی میں گفتگو کرنے کا موقع ماجدہ کو اگلے ہی دن مل سکا۔ وہ اور ہاشم ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ پچیس سال کی طویل دوری یکبارگی سمٹ کر ایک نقطہ موہوم میں تبدیل ہو گئی تھی، لیکن یہ نقطہ موہوم اپنے اندر دکھوں کا کتنا بڑا سمندر سمیٹے ہوئے تھا، اس کا اندازہ شاید ان لوگوں کے علاوہ اور کوئی نہیں کر سکتا تھا۔

''اس شام جب میں نے واپس آ کر گھاٹ پر تم کو نہ پایا تو میری جان نکل گئی۔ میں آدھی رات تک تم کو نہ جانے کہاں کہاں تلاش کرتا رہا اور لوگوں سے تمہارے بارے میں پوچھتا رہا۔ پھر میں وہیں گھاٹ پر ہی ایک تختے پر لیٹ گیا۔ تھوڑی سی آنکھ لگی۔ وہ رات..... وہ کس قدر خوفناک رات تھی..... لگتا تھا کہ ساری دنیا ختم ہو چکی ہے..... ماجدہ کہاں ہو گی؟ ماجدہ اس وقت کہاں ہو گی؟ اتنی رات کو؟ تنہا میرے بغیر، نہ جانے کس کے قبضے میں؟ میں زار و قطار روتا تھا اور شدتِ درد سے تڑپتا تھا۔ یہ ایک ایسی بے بسی کا عالم تھا کہ حواس نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ صبح ہوئی تو میں نے ایک بار پھر تلاش شروع کی اور جب تم کہیں نہیں ملیں تو میرے دماغ میں یہ بات آئی کہ میں پولیس کو بتا دوں۔ میں نے تھانے میں جا کر بتا دیا..... پولیس مجھے ساتھ لے کر مادھو پور آئی۔ میں نے تمہارے اور اپنے والدین کو سب کچھ بتا دیا۔ بس، اس کے بعد سے

تمہاری کوئی خبر نہیں ملی۔ میں ہر روز جیتا تھا اور ہر روز مرتا تھا اور یوں مرتے جیتے دس سال کا عرصہ گزر گیا۔ جس کے بعد میں نے اپنے گھر والوں کے اصرار پر تمہاری چھوٹی بہن ثریا سے شادی کر لی۔ اس شام کے بعد سے، جب میں نے کھلنا میں تم کو کھو دیا تھا، میری زندگی میں مایوسی اور پچھتاوے کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ میں رہ رہ کر اپنے آپ کو ملامت کرتا تھا کہ میں تمہیں گھاٹ پر اکیلا چھوڑ کر گیا ہی کیوں، تمہیں اپنے ساتھ ہی کیوں نہ لیتا گیا۔ اگر میں نے ایسا کیا ہوتا تو ہمارے درمیان آج پچیس برس کی بے خبری کا فاصلہ موجود نہ ہوتا..... میں نے اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کیا۔'' ہاشم کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو بہنے لگے اور اس کی آواز اس کے حلق میں پھنسنے لگی۔ ''اس دن کے بعد سے میرے لیے دنیا ختم ہو گئی تھی، میں جی رہا تھا تو صرف اس لیے کہ مجھے جینا تھا اور میں خودکشی نہیں کر سکتا تھا.....''

''تمہیں پچھتانے کی ضرورت نہیں ہے ہاشم۔'' ماجدہ نے سسکی بھری سرگوشی میں کہا۔ ''تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے۔ بھلا کسے معلوم تھا کہ کوئی تاک لگائے بیٹھا ہے۔ بس ایک نگاہ چوکی اور اس نے اپنا کام دکھا دیا۔ میمونہ بے چاری کو تو اسکول سے گھر کے راستے میں اٹھا لیا گیا تھا۔ بس، سب قسمت کے کھیل ہیں ہاشم.....''

دونوں کے درمیان پچیس سال کے طویل عرصے پر پھیلی ہوئی جو کہانیاں تھیں، ان کے بیان کے لیے تو ایک مدت درکار تھی۔ ہاشم کی زندگی میں بہت زیادہ پیچ و خم نہیں آئے تھے اور وہ ایک طرح سے سپاٹ انداز میں میکانکی طور پر گزرتی رہی تھی۔ مگر ماجدہ کی زندگی میں نہ جانے کتنے پیچ و خم آئے تھے، جن کے بارے میں اس نے ہاشم کو سب کچھ محتاط سچائی کے ساتھ بتا دیا جس طرح میمونہ کو بتایا تھا۔

''کیسے کیسے دکھ جھیلے تم نے ماجدہ۔'' ہاشم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تم کتنی تنہا تھیں ماجدہ۔ ہم سب لوگوں سے کتنی دور اور تنہا..... اُف خدا..... کیسی کیسی خوفناک آزمائشوں سے گزر کر تم ایک بار پھر اپنے گھر آ پہنچی ہو۔''

''میرا گھر اب یہ نہیں ہے ہاشم۔'' ماجدہ نے آنکھیں جھکا کر آہستہ سے کہا۔ ''میرا اور میرے بچوں کا گھر اب لاہور میں ہے۔ یہاں تو میں تم لوگوں سے ملنے کے لیے آئی ہوں۔ جو خوشی تم کو زندہ سلامت دیکھ کر اور تم سے مل کر مجھے حاصل ہوئی ہے اس خوشی کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گی اور اس کے سہارے اپنی باقی زندگی کاٹ دوں گی۔ تقدیر نے مجھے جو صدمے دیئے تھے ہاشم میں انہیں جھیل چکی ہوں اور اب ان دکھوں کا کوئی مداوا نہیں ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وقت ہمیں طرح طرح کی آزمائشوں میں ڈالتا ہے ہاشم.....اور ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ہم ان آزمائشوں پر پورے اُتریں۔تبھی ہم زندہ رہ سکتے ہیں۔''

''بہت وقت گزر چکا ہے ماجدہ اور ہم دونوں بہت سی آزمائشوں سے گزر چکے ہیں۔'' ہاشم نے جیسے اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔''ہم سب وقت کی قید میں ہوتے ہیں اور وقت زبردستی ہم سے اپنے فیصلے منواتا ہے۔''

''تو پھر ہمیں وقت کے اس فیصلے کو بھی قبول کر لینا چاہیے۔'' ماجدہ نے آہستہ سے کہا۔ ''میں اپنے بچوں کے ساتھ زندگی گزاروں گی۔انہیں میری ضرورت ہے کیونکہ ان میں سے کسی کا بھی باپ موجود نہیں ہے اور تم.....تم ہاشم.....ثریا اور ماجد کے ساتھ خوش رہو اور انہیں بھی خوش رکھو۔ہم دونوں ہمیشہ اچھے دوست رہیں گے اور ایک دوسرے کی عزت کریں گے اور ایک دوسرے کو یاد رکھیں گے۔''

''امی.....امی.....'' اچانک ماجدہ کو اپنی نوجوان بیٹی ثمینہ کی آواز سنائی دی جو اسے ڈھونڈتی ہوئی شاید اسی طرف آ رہی تھی۔

''ہاں بیٹی۔'' ماجدہ نے جلدی سے کہا۔''میں آ رہی ہوں.....'' اور وہ اٹھ کر ثمینہ کی آواز کی سمت میں چل دی۔

سامنے ندی کا پانی دن کی تیز دھوپ میں آئینے کی طرح چمک رہا تھا اور اس پر ڈولتی ہوئی محوِ سفر کشتیاں ایک ایسے منظر کی تشکیل کر رہی تھیں جس کی نرمی، گرمی اور شگفتگی ماجدہ کی روح کو ایک نئی بالیدگی بخش رہی تھی۔

☆======ختم شد======☆